اُصول تعلیم

مصنفہ

خواجہ غلام السیدین، بی - اے - ایم - ایڈ
پروفیسر تعلیمات و پرنسپل ٹریننگ کالج
مسلم یونیورسٹی - علیگڈھ

(مع مقدمہ از ڈاکٹر سر سید راس مسعود، ایل-ایل - ڈی - ڈی لٹ)

الہ آباد
ہندستانی اکیڈیمی، یو - پی
۱۹۳۵

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو اپنے والد ماجد

آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم

کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں جنھوں نے اپنی تمام عمر

ان صحیح خیالات اور قدروں کی اشاعت میں صرف

کی جن پر قومی زندگی کی صحت اور بقا کا انحصار ہے

اور جن کی موثر تبلیغ تعلیم کا مقدس فرض ہے -

نہاں در سینۂ ما عالمے ہست

بخاک مادلے' در دل غمے ہست

ازاں صہبا کہ جاں ما بر افروخت

ہنوز اندر سبوئے ما نمے ہست

غلام السیدین

فہرست مضامین

مقدمہ

(از جناب نواب مسعود جنگ بہادر ڈاکٹر سر راس مسعود صاحب
ایل - ایل - ڈی ' ڈی لٹ ' بیرسٹرایٹ لا - سابق وائس چانسلر
علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

اس کتاب کے فاضل مصنف کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ھے جس نے ھمیشہ ادب کی اور بالخصوص اردو ادب کی صحیح خدمت کی ھے - خواجہ غلام السیدین صاحب کی رگوں میں الطاف حسین حالی مرحوم کا خون ھے اور یہ اسی کا فیض ھے کہ اِن کی تحریر میں وھی سادگی اور صداقت پائی جاتی ھے جس نے حالی کی بیش بہا تصانیف کو اُردو کے آئندہ ادیبوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دیا ھے -

یہ ایک نہایت دل خوش کن شگون ھے کہ ھمارے ملک میں ایسے ھونہار نوجوانوں کی ایک جماعت پیدا ھوگئی ھے جنھوں نے مغرب میں تعلیم پانے کے بعد اُردو زبان کی کم مائگی کو دور کرنے کا تہیہ کرلیا ھے اور جن کی کوششوں کا یہ نتیجہ ھے کہ اب اُردو میں بھی اس قسم کی کتابیں تصنیف ھو رھی ھیں جن پر ھر ملک فخر کرسکتا ھے - میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ھوں کہ تعلیم اور اصول تعلیم پر خواجہ غلام السیدین صاحب کی اس کتاب سے بہتر آج تک کوئی کتاب اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی - یہ ایک ایسی کتاب ھے جس کو ھم فخریہ ان مستند کتابوں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ھیں جو دوسرے ممالک کی زبانوں میں اس مضمون پر لکھی جا رھی ھیں - جہاں تک تعلیم کے اصولی مباحث کا تعلق ھے مصنف نے ھر پیچیدہ مسئلہ کو نہایت

قابلیت کے ساتھہ سلیس زبان میں عام فہم بنا کر ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ھے - اس امر کي شدید ضرورت تھی کہ اس زمانے میں جب کہ ھماری قومی زندگی کے ھر شعبہ کا شیرازہ بکھرا ھوا ھے تعلیم و تربیت اور تعلیم و تمدن کا گہرا باھمی تعلق از سر نو سمجھایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تعلیم بغیر تربیت کے ملک کے لئے مفید نہیں ہوسکتی - مجھے لایق مصنف کی اس رائے سے بھي پورا اتفاق ھے کہ کوئی نظام تعلیم صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ھوسکتا جس نے اپنے تمدنی ماحول اور تاریخی روایات کو نظر انداز کردیا ھو -

میں ان لوگوں میں سے ھوں جن کا عقیدہ ھے کہ ھمارے ملک میں صحیح تعلیم اُس وقت تک نہیں پھیل سکتی جب تک کہ ھم اپنی مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم نہ بنائیں - موجودہ نقّالی سے جو نقصان ھو رھا ھے وہ اظہرمن‌الشمس ھے اور اسی کا ایک بڑی حد تک یہ نتیجہ ھے کہ ھمارے مدرسوں کے پڑھے لکھوں میں غور و فکر کا مادّہ کم ھوتا جاتا ھے - ان کی زیادہ تر قوت نقّال بننے میں صرف ھوتی ھے اور بجائے اس کے کہ ھماری قومی زندگی کی جڑیں زیادہ مضبوط ھوں اور سچی خود داری میں اضافہ ھو ' دونوں میں کمزوری بڑھتی جاتی ھے - موجودہ غلط طرز تعلیم نے ایک ایسا فرقہ ھمارے ملک میں پیدا کرنا شروع کردیا تھا جس کو نہ اپنی قومي روایات سے کوئی دلچسپی تھی ' نہ ملک کے عام باشندوں کے ساتھ ھمدردي اور تعلق - مجھے وہ زمانہ یاد ھے جب تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد اپنی مادری زبان کو بگاڑ کر بولنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی - شکر ھے خدا کا کہ وہ زمانہ اب ختم ھوتا جارھا ھے اور لوگ یہ سمجھنے لگے ھیں کہ جو خود اپنی تہذیب اور روایات کی عزت نہیں کرتے ' ان کی عزت غیر قومیں بھی نہیں کرتیں -

اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلیم فن معلمی سے ہے ہمارے ملک کے اساتذہ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا - اس کے پڑھنے سے اُن کو واضح طور پر معلوم ہوجائیگا کہ آج کل دنیا میں مختلف ممالک کس قسم کی تعلیمی جد و جہد میں مشغول ہیں اور مختلف قوموں نے اپنا تعلیمی نصب‌العین کیا قرار دیا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جارہی ہیں - یہ کتاب ایک ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے جب ہمارے ملک کے سیاسی ماحول کے بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں - مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے ہر شخص کی معلومات میں اضافہ ہو گا چاہے اس کا تعلق تعلیم سے ہو یا سیاست سے - اگر ان اصولوں پر عمل کیا گیا جن کو اس کتاب میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ ہمارے ملک کے لئے ایک نیک فال ہوگی اور وہ زمانہ جلد آجائے گا جب ہم یہ کہ سکیں گے کہ تعلیمی دنیا میں ہمارا ملک بھی کوئی وقعت رکھتا ہے -

بھوپال — سید راس مسعود

جنوری سنہ ۱۹۳۵ ع

دیباچہ

اردو زبان میں فن تعلیم پر کتاب لکھنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں - یہ ان علوم میں سے ہے جن پر ہماری زبان میں بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی ہیں حالانکہ نظری اور عملی اہمیت کے اعتبار سے اس کو انسانی علوم کی صف اول میں جگہہ دینی چاہیے - شاید فی الحال ہمارے پاس چند ترجموں ' چند مختصر تالیفوں اور نارمل اسکولوں کی درسی کتابوں کے سوا تعلیمی لٹریچر میں کچھہ بھی نہیں - ترجموں میں سب سے مقتدر اور مستند کتاب ہربرٹ سپنسر کی " فلسفہ تعلیم " ہے- کچھہ رسالے اخلاقی تعلیم اور تعلیم کے بعض اور خاص مباحث پر لکھے گئے ہیں - کچھہ مفید اور قابل قدر مواد اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے متفرق مضامین میں ملتا ہے مثلاً سرسید احمد خاں کے مضامین تہذیب الاخلاق کی جلدوں میں یا اِن خطبوں میں جو وقتاً فوقتاً ملک کی تعلیمی انجمنوں کے اجلاسوں میں دیے گئے ہیں - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گذشتہ چالیس سالانہ جلسوں کے خطبات صدارت کو " خطبات عالیہ " کے نام سے دو جلدوں میں شائع کردیا ہے جن سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور اہم تعلیمی مسائل پر روشنی پڑتی ہے - نارمل اسکولوں کی درسی کتب علمی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں - بس یہ ہے ہمارا کل تعلیمی سرمایہ ! لہذا جہاں اس کتاب کی تصنیف کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی نے مجھے اس کو لکھنے

کی دعوت دی وہاں دوسری وجہ یہ احساس ہے کہ موجودہ زمانے میں ہر تعلیمی تصنیف ایک نہایت شدید ضرورت کو پورا کرتی ہے اور شعبۂ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان میں تعلیمی تصانیف کا اضافہ کر کے اس کی موجودہ کم مائگی کو دور کریں -

اس کتاب کا مقصد اور نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مضامین کی تقسیم کا اصول بیان کردیا جائے - کتاب کے پہلے حصے میں میں نے تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ تعلیم کا رشتہ تمدن کے مختلف شعبوں سے کیا ہے اور وہ کس طرح اس پر اثر انداز ہوتے ہیں - فن تعلیم کے بہترین ارباب فکر کا نظریہ یہی ہے اور یہی رہا ہے کہ ہم تعلیم کے کسی مسئلہ کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک اس کا مطالعہ اس کے تمدنی ماحول میں نہ کیا جائے - لہذا اس حصے میں، میں نے ان تعلیمی مسائل سے بحث کی ہے جو موجودہ تمدنی اداروں کے مطالبات اور خصوصیات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ خانگی زندگی اور درسی زندگی کا کیا تعلق ہے - افراد کی سیرت اور شخصیت پر اجتماعی زندگی کیا اثر ڈالتی ہے - ہمارے نظام معاشی نے ماہرین تعلیم اور تعلیم گاہوں کے لئے کیا جدید اور اہم مسائل پیدا کردیے ہیں - حکومت کا تعلق تعلیم کی نوعیت اور اس کے نظم و نسق سے کیا ہے اور ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں کس قسم کی تعلیم درکار ہے ؟ - مختصر یہ کہ اس حصے میں تعلیم کے وسیع تر علائق اور نتائج سے بحث کی گئی ہے تاکہ بالخصوص معلموں کو یہ محسوس ہوجائے کہ ان کے کام کی اہمیت اور حیثیت محض ایک اصطلاحی فن کی نہیں بلکہ اس کے اثرات بہت دور رس ہیں اور اس پر تمدنی زندگی کے تمام شعبوں کا رد عمل ہوتا رہتا ہے -

دوسرے حصے میں "درسی تعلیم" کے عنوان کے ماتحت ان مباحث کو پیش کیا گیا ہے جو بالعموم رسمی طور در عقلی اور دماغی تربیت کے سلسلے میں اٹھائے جاتے ھیں مثلاً ذھنی تربیت ' تدوین نصاب ' جسمانی تربیت وغیرہ - لیکن ان ابواب کے ذیل میں "درسی تعلیم" کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ استادوں کے عام نقطہ نظر سے بہت مختلف ہے کیونکہ برخلاف اس مفہوم کے جو مدرسے کے متعلق ان کے ذھن میں ہے اس میں "مدرسہ عمل" کے اصولوں کی تشریح کی گئی ہے اور علم اور زندگی ' علم اور عمل ' رسمی مضامین اور عملی مشاغل اور دستکاریوں اور ذھنی اور جسمانی تربیت کے تعلق اور وحدت کو ظاھر کیا گیا ہے اور تعلیم کے مختلف شعبوں کے درمیان جو فصل اور تناقض قائم ھوگیا ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یعنی جام کہن میں مئے نو پیش کی گئی ہے کہ وہ مئے کہن سے بہتر ہے -

تیسرے حصے کا تعلق اخلاقی اور معاشری تربیت کے اصولوں سے ہے لیکن ابتدا ھی میں یہ بات ظاھر کردی گئی ہے کہ عقلی اور اخلاقی تربیت کے اصولوں میں کوئی نقیض یا مستقل فصل نہیں ہے بلکہ یہ تقسیم محض اظہار خیال کی سہولت کی خاطر کی گئی ہے - کیونکہ دراصل تعلیم کا موضوع ' خواہ تعلیم دماغی ھو یا جسمانی ھو ' اخلاقی ھو یا معاشرتی ' بچے کی ذات ہے جو ایک سالم اور واحد ھستی ہے اور تمام اثرات جو اس پر ڈالے جاتے ھیں اس کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ لیتے ھیں - اس لئے اس حصے میں پہلے اخلاق کا حقیقی مفہوم واضح کیا گیا ہے تاکہ اس کی پوری وسعت اور ھم گیری کا اندازہ ھوجائے اور اس کا کوئی تنگ اور یک طرفہ مفہوم نہ لیا جائے - اس کے بعد یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ اخلاق کا تعلق عمل سے اور عقلی تربیت سے کیا ہے اور

مدرسے کے مجموعی نظام کا ہر جز و کس طرح اخلاقی تربیت میں معین یا حارج ہوتا ہے - اس سلسلہ میں نصاب ؛ طریقۂ تعلیم ' نظام ضبط و تادیب ' انعام اور سزا اور معلم کی شخصیت کے اثرات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جس وقت تک ان تمام عناصر کی تنظیم بعض خاص اصولوں کے تحت میں نہ کی جائے تاکہ ان کا مجموعی اثر طلبہ پر ہم آہنگ ہوکر پڑے مدرسہ موثر طریقہ پر اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا مرکز نہیں بن سکتا - آخری باب میں اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کس طرح کرنی چاہئے تاکہ ہمارے مدرسوں سے جو نوجوان تعلیم پاکر نکلیں وہ اپنی ذات میں اہم تریں اور مفید تریں اخلاقی صفات اور اقدار کے حامل ہوں -

میں نے اس کتاب میں بالعموم تمام تعلیمی بحثوں کو مدرسے کی تعلیم تک محدود رکھا ہے ' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مسائل کو اس میں شامل نہیں کیا کیونکہ اول تو اس ایک کتاب میں وہ تمام مسائل سما نہیں سکتے - دوسرے تعلیمی اصولوں کے تعین اور توضیح کے لئے سب سے زیادہ موزوں میدان مدرسے کی تعلیم کا ہے جہاں طلبہ کی جبلتوں اور نشو و نما کا مطالعہ زیادہ مکمل اور واضح طریقے پر کیا جاسکتا ہے اور ان کی تربیت پر فیصلہ کن اثر ڈالا جاسکتا ہے - کالج اور یونیورسٹی میں پہنچ کر مرکز ثقل تبدیل ہو جاتا ہے - تربیت کی ذمہ‌داری بہت زیادہ حد تک خود طالب علم کے اوپر عائد ہوجاتی ہے اور تعلیم اور تعلیم گاہ کی زیادہ توجہ عقلی اور ذہنی تربیت پر صرف ہوتی ہے - لیکن وہاں بھی ہم کوئی دیرپا کامیابی حاصل نہیں کرسکتے جب تک مدرسے کی تعلیم کو صحیح اصولوں پر قائم نہ کریں - اس کتاب کا مقصد انہیں صحیح اصولوں کی تشریح اور توضیح ہے -

میں نے اس کتاب کی تصنیف میں مغرب کے بہترین ماہرین تعلیم کے خیالات اور تحریری تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے - ان کے ناموں کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ ان کے حوالے جابجا کتاب میں موجود ہیں البتہ میں خاص طور پر امریکہ کے جدید فلسفی اور تعلیم جدید کے سر گروہ پروفیسر جان ڈیوئی کا مرہون منت ہوں جن کے تعلیمی خیالات نے مجھ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور جن کے تعلیمی نقطہ نظر سے بڑی حد تک مجھے اتفاق ہے - لیکن میں نے اس کتاب میں خود کو کسی خاص مصنف یا ماہر تعلیم کے خیالات کا پابند نہیں بنایا بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی خیالات پر ہندوستان کی مخصوص ضروریات اور حالات کے نقطہ نظر سے تنقید کروں اور انہیں پیش نظر رکھ کر ان سے استفادہ کروں - کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی مخصوص روایات ، اپنی تہذیب و تمدن کے مطالبات ، اپنی نفسی زندگی اور اپنے فلسفہ کو پس پشت ڈالکر اندھادھند کسی دوسرے ملک کی تقلید کرینگے تو ہرگز منزل مقصود کو نہیں پہونچ سکتے - تعلیم کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں اور قومی زندگی عبارت ہے ان تمام اثرات اور عناصر سے جن کا تدریجی ارتقا ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے - اس لئے ہم کسی نظام تعلیم کو نہ پرانے لباس کی طرح بے پروائی سے اتار کر پھینک سکتے ہیں نہ نئے لباس کی طرح بے تکلفی سے پہن سکتے ہیں - وہ ایک نفسی اور روحانی نظام ہے جو ایک پودے کی طرح آہستہ آہستہ قومی زندگی کی سر زمین سے اُگتا ہے اور اس کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے -

آخر میں مجھے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (ناظم اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کا شکریہ ادا کرنا ہے

جنھوں نے اس کتاب کے مسودے کو تمام و کمال پڑھا اور اُس کی زبان میں جابجا اصلاح اور ترمیم کی - اگر وہ اس ذمہ‌داری کو اپنے سر نہ لیتے تو مجھے کتاب کی اشاعت میں بہت تامل ہوتا - علاوہ انکے مجھے کتاب کی ترتیب اور مسودے کی صفائی میں اپنی بیوی اور اپنی بہن (بیگم عابد حسین) سے بھی بہت مدد ملی جن کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے - اگر وہ اس کام میں میرا ہاتھ نہ بٹاتیں تو نہ معلوم اس میں کتنی تاخیر اور ہوتی -

عزیز جہاں منزل
علی‌گڑھہ

خواجہ غلام‌السیدین -

حصہ اول

تعلیم و تمدن

باب اول—تعلیم ' تمدن اور مدرسہ -

باب دوم—تعلیم اور تمدنی ادارے -

باب سوم—خانگی اور معاشری زندگی کے اثرات -

باب چہارم—تعلیم اور مسئلہ معاش -

باب پنجم—حکومت اور تعلیم -

باب اول

تعلیم تمدن اور مدرسہ

موضوع کا تعین

ہمارا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ تعلیم کے بنیادی اصولوں اور نظریوں پر بحث کریں اور اس بحث کے ضمن میں اپنے ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص کو ظاہر کرکے اس کی اصلاح کی تجاویز پیش کریں - یہ کام بہت مشکل اور بہت وسیع ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب کے محدود دائرے میں نظر نہیں ڈال سکتے - موجودہ نظام تعلیم کی تنقید بجائے خود ایک مستقل بحث ہے جس کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں کیوں کہ اس فرض کو انجام دینے کے لئے ہمیں اس نظام کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور کس طرح اس میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہوتی رہیں جن کے مجموعی اثر سے اس نے موجودہ شکل اختیار کی - اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو پرکھنے کے لئے ہمیں اپنے ملکی تمدن کا مطالعہ کر کے ایک معیار قائم کرنا پڑیگا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہماری تعلیم کس حد تک ہماری قومی ضرورتوں اور آرزؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور کہاں تک ان کے لئے نا مناسب ہے - اسی طرح تعلیمی اصلاح کا مسئلہ بھی اتنا سہل اور سادہ نہیں کہ اس کا حل کوئی شخص وثوق کے ساتھ پیش کرسکے - اگر خرابیوں کو سمجھنے کے لئے وقت نظر، وسعت خیال، تاریخی واقفیت اور تمدن کا مطالعہ درکار ہے تو اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے لئے

علاوہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسے تخیل کی ضرورت ہے جو ایک آنکھ سے ماضی اور حال کے گونا گوں مناظر کا جائزہ لے سکے اور دوسری سے مستقبل کے دھندلکے کی سیر کرسکے - یعنی دوش و امروز کے ائینے میں فردا کو دیکھہ سکے - اس کتاب کے محدود دائرے میں ہمارا مقصد نہ تو موجودہ نظام تعلیم کا مفصل تنقیدی تجزیہ ہے نہ کوئی مکمل اصلاحی پروگرام پیش کرنا جس پر فوراً عمل کیا جا سکے - ہم زیادہ تر ان مستقل اور ہمہ گیر اصولوں سے بحث کریں گے جن کے مطابق ہر نظام تعلیم کی تشکیل ہونی چاہئے اور یہ دکھائیں گے کہ اس عمل تشکیل میں ہرہر قدم پر تعلیم کو تمدن اور انسانی زندگی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعلیم کا نصاب، اس کے طریقے اور عام نظم و نسق یہ سب چیزیں اسی حالت میں درست ہوسکتی ہیں جب وہ تمدن و معاشرت کی کسوٹی پر کسی جائیں - جہاں تعلیم و تمدن کا یہ رشتہ ٹوٹا تعلیم کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے اور تمدنی ترقی کے راستہ میں بے شمار رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں - ان امور پر غور کرنے کے دوران میں توضیح اور مثال کے طور پر ہم اپنے موجودہ نظام کا ذکر کریں گے اور ضمناً یہ بھی بتائیں گے کہ وہ کس لحاظ سے ناقص ہے اور کس طرح اس کے نقائص دور کئے جاسکتے ہیں - لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحثوں میں جو زیادہ ترنظری اور اصولی ہیں ہمیں مخصوص اور معین تعلیمی طریقوں سے سروکار نہیں ہوگا بے شک جو طریقے دوسرے ملکوں میں یا کہیں کہیں ہمارے ملک میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں ان کا ہم ذکر کریں گے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم میں جو ایک زندہ فن ہے اور جس کا موضوع ذی روح اور نمو پذیر افراد ہیں، کوئی خاص طریقہ ایسا نہیں جو ہر حالت میں کام آسکے اس میدان میں کامیاب ہونے کے لئے عام اصول تعلیم سے واقفیت اور سمجھہ

بوجه کي ضرورت هے تا که معلم اپنے گرد و پیش کے خاص حالات کے لحاظ سے اُن اصولوں کی روشنی میں تعلیم اور نظم تعلیم کے مناسب طریقے اختیار کرسکے -

فرد اور معاشرے کا تعلق

چونکه تعلیم کا موضوع انسان کی سیرت اور اُس کی زندگی کی تشکیل هے اس لئے اس کے مطالعے کے لئے وسعت نظر کی خاص طور پر ضرورت هے - انسان کی زندگی کی مثال سمندر کی سی هے جس کو لکیریں کھینچکر یا لکڑی کے تختے لگا کر مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم نهیں کیا جاسکتا که ایک حصه کا دوسرے سے کوئی تعلق نه هو - جس طرح سمندر کي هر موج اٹھتی هے اور روانی کے ساتھه پانی کی سطح پر کھیلتی هوئی کهیں سے کهیں پهونچ جاتي هے، کهیں دوسري موجوں کے ساتھ مل کر طوفان بپا کردیتی هے اور کهیں هلکے سے تھپیڑے سے کشتی کو آگے بڑھا دیتی هے، اسی طرح جو اثر انسان کی شخصیت یا سیرت پر ڈالا جاتا هے اس کے حدود متعین نهیں کئے جاسکتے - اول تو خود انسان کي شخصیت میں جسم اور دماغ، عقل و روح اور حیوانی جبلتیں وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابسته هیں اور گرد و پیش کے حالات سے ایک ساتھ متاثر هوتی هیں - دوسرے انسان تنها بطور ایک فرد واحد کے زندگی بسر نهیں کرسکتا بلکه اور افراد کے ساتھ مل جل کر رهتا هے اور معاشری کاروبار اور مشاغل میں حصه لیتا هے - معاشرت کا تعلق هماری زندگی سے اس قدر گهرا اور لازمی هے که انسانوں کی وہ حالت جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی شکل میں وابسته نه هوں همارے تصور سے باهر هے - سچ پوچھئے تو معاشرے کا رکن هونا هی انسان کو انسان بناتا هے - اس کے بغیر اس کی

ذهنی اور روحانی قوتوں کی پوری نشو و نما ہو ہی نہیں سکتی - اگر ہم اپنے مشاغل کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا مقصد اور معنی سمجھنے کے لئے ہمیں ہر قدم پر معاشرے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے - ہماری تجارت، ہماری صنعت و حرفت، ہمارا نقل و حمل غرض وہ تمام کام جنکے ذریعے ہم اپنی زندگی کی ضروریات بہم پہونچاتے ہیں افراد کے اشتراک عمل پر منحصر ہیں - اگر لوگ مل جل کر ان کاموں کو انجام نہ دیں تو ایک دن میں معاشرے کا بنا بنایا نظام درہم برہم ہو جائے - کارخانے کے مزدوروں کی ایک معمولی سی ہڑتال اس حقیقت کو نہایت موثر انداز میں ہم پر واضح کر دیتی ہے - لیکن فرد اور جماعت کا تعلق اس سے بھی زیادہ گہرا ہے - انسان کی ذہنی اور روحانی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کے لحاظ سے بہ ظاہر وہ بالکل تنہا ہوتا ہے اور صرف اپنے ذاتی خیالات، جذبات اور عقائد کی دنیا میں رہتا ہے جہاں کسی دوسرے شخص کا گذر نہیں - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "روح کی اس خوفناک تنہائی" میں بھی ہم حقیقت میں تنہا نہیں ہوتے - ہماری اندرونی زندگی بھی اپنی تشکیل کے لئے دوسرے لوگوں کے خیالات جذبات اور معاشری تعلقات کی محتاج ہے اور ہمارے دل کے پوشیدہ ترین خیالات کا نظام بھی محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر ان تجربات اور احساسات سے وابستہ ہے جن کو ہم بغیر دوسرے لوگوں کی مدد کے حاصل نہیں کر سکتے - اسی وجہ سے شاعر نے کہا ہے کہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھہ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دنیا کچھہ نہیں !

معاشری زندگی کا مفہوم

ہم نے مندرجہ بالا عبارت میں ''افراد کی زندگی اور معاشرے کی زندگی'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں یہ الفاظ کسی قدر تشریح طلب ہیں - زندگی سے یہاں ہماری مراد صرف وہ جسمانی زندگی نہیں جس کا مدار سانس کی آمد و رفت پر ہے جو ہم میں اور تمام حیوانوں میں مشترک ہے - یہاں ان الفاظ کے مفہوم میں افراد اور جماعتوں کے وہ تمام تجربات' کارنامے' ذہنی اور علمی کمالات اور سیرت کی خصوصیات شامل ہیں جو ہر فرد اور ہر جماعت کو باقی تمام افراد اور جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں - اس لئے جب ہم کسی خاص معاشرے یا کسی جماعت کی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے ہماری مراد ہوتی ہے اس کا رسم و رواج' مذہب' علوم و فنون' اقتصادی اور سیاسی مشاغل' خانگی زندگی کے اصول اور قاعدے جن پر نہ صرف اس کی حیات محض کا دار و مدار ہے بلکہ وسیع تر معنی میں اس کی زندگی کی تکمیل اور ترقی کا بھی انحصار ہے - ہر جماعت باوجود افراد کے فنا ہو جانے کے اس طرح قائم رہتی ہے کہ معینہ تدبیروں کے ذریعے سے اپنے سارے ذہنی اور تمدنی سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی رہے - اس کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے تمام علمی اور عملی مشاغل میں پوری جد و جہد سے کام لے اور دوسری طرف ایسے ادارے ترتیب دے جن کے ذریعے سے ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسلوں کے خزانوں پر قابض ہو کر ان کی مدد سے ترقی کے میدان میں اور آگے قدم بڑھا سکے -

غرض معاشرے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے قیام اور اپنی بقا کے لئے ایسی تدابیر عمل میں لائے جن سے افراد سہولت اور کامیابی کے ساتھ اتفاق

و اتحاد کی زندگی بسر کرسکیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف ایسے نظام اور ادارے قائم ہیں جن میں شریک ہوکر ہم اپنی قوتوں کو مناسب اور موثر طریقے پر استعمال کرتے ہیں اور اپنی محنت اور جد و جہد کے نتائج کو مستقل شکلوں میں محفوظ رکھتے ہیں - یہ ادارے کسی عارضی مقصد یا مصلحت کی خاطر قائم نہیں ہوئے بلکہ انسان کی فطری ضرورتوں پر مبنی ہیں - اس میں شک نہیں کہ بہت سی مصلحتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیتی ہیں - لیکن بغیر فطرت انسانی کے تقاضے کے یہ انتظامات ' اگر کئے بھی جاتے ' تو قائم نہ رہتے - مثال کے طور پر خاندان کو لیجئے جو تمام عمرانی جماعتوں میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ پائدار جماعت ہے ' اس کی ابتدا یوں نہیں ہوئی کہ افراد نے تجربے سے معلوم کیا ہو کہ خاندان کی زندگی بسر کرنے میں خاص فوائد اور آسائشیں ہیں جو تنہائی کی زندگی میں ممکن نہیں اور اس تجربے کی بنا پر انہوں نے اپنی تنظیم ' خاندانوں کی شکل میں کر لی ہو - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاندان کی بنیاد اس فطری محبت پر قائم ہے جو قدرتاً والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور جس کا اظہار حیوانوں کی زندگی میں بھی ہوتا ہے - ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بالکل بے کس اور بے بس ہوتا ہے - اس کی زندگی ہر قدم پر والدین کی خبرگیری اور نگہداشت کی محتاج ہے - اس خبرگیری کا مستقل انتظام کرنے کے لئے قدرت نے والدین میں محبت کا جذبہ ودیعت کیا ہے - جو ان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ بچے کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں اور خود تکلیفیں جھیل کر اُسکو آرام پہونچائیں بنی نوع انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے قدرت کا یہ انتظام لازم تھا - اُس کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کی موجودہ تشکیل ممکن ہی نہیں

تھي - لیکن خانداني زندگي کا محض یہي فائدہ نہیں کہ بچوں کي پرورش کي جائے اور ایک نسل دوسری نسل کو زندہ رکھنے کا انتظام کرے - عمراني زندگي کا ایک عام قاعدہ یہ ھے کہ جب کوئی ادارہ کسي خاص مقصد کے لئے قائم ھوتا ھے تو اس کي جد و جہد کے دوران میں بہت سے نئے اور ضمنی لیکن نہایت اہم نتائج پیدا ھو جاتے ھیں - یہی خاندان جو ابتدا میں محض بچوں کی جسمانی خبر گیری کا کام کرتا تھا رفتہ رفتہ ان کی تمدنی ، اخلاقی اور اقتصادی تربیت کا گہوارہ بن جاتا ھے - اس کے مقاصد زیادہ وسیع ' اس کے باھمی روابط زیادہ مستحکم اور اس کے فرائض زیادہ متنوع ھوجاتے ھیں - اس کا کام محض یہی نہیں رھتا کہ حیات موجودہ کو قائم رکھا جائے بلکہ اسے یہ آرزو پیدا ھوتی ھے کہ حیات برتر کي بنیاد ڈالی جائے - خاندان کے افراد آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے ھیں اور کاموں کو تقسیم کرکے اپنی کار کردگي کو بڑھاتے ھیں - وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لیتے ھیں اور ان کو نہ صرف وہ کام اور وہ عادتیں سکھاتے ھیں جن کی مدد سے انہیں آئندہ چل کر اپنی روزي کمانی ھوگی - بلکہ عمل مثال اور زبانی تعلیم کے ذریعہ ان اصول اور اخلاق سے بھی آگاہ کرتے ھیں جو اس خاندان میں چلے آتے ھیں اور کوشش کرتے ھیں کہ ان کی عمدہ رسوم و روایات اور پسندیدہ اصول زندگی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ھوکر مستقل صورت اختیار کرلیں - اسي وجہ سے خاندان تعلیم و تربیت کا سب سے قدیم اور غالباً سب سے زیادہ اثر آفریں موثر ھے اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کی اھمیت کو اچھی طرح ذھن نشیں کرنا ضروري ھے - ھم اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بحث کرینگے - یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ھے کہ کس طرح ایک

معاشری اداروں کا ' جو کسی محدود اور مخصوص مقصد کے لئے قائم ہوتا ہے ' حلقہ عمل وسیع ہو جاتا ہے - بعض لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ انسان بالطبع معاشرت پسند ہے اور دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کا اٹل قانون ہے - ان کا خیال ہے کہ ابتدا میں انسان بھی بعض جانوروں کی طرح تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے - لیکن رفتہ رفتہ ان کو عقل اور تجربے کی مدد سے معاشری زندگی کے فوائد کا احساس ہوا اور انہوں نے مختلف معاشرتی ادارے قائم کیے - اس نقطہ نظر کو امریکہ کے دو مفکرین ڈیلے (Dealey) اور وارڈ (Word) نے اپنی کتاب " درس عمرانیات " (Text Book of Sociology) میں پیش کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" انسان بالطبع معاشرت پسند نہیں ہے- معاشرہ اُس کی عقل کی جد و جہد کا نتیجہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کے دماغی ارتقا کے ساتھ صورت پذیر ہوا ہے - بہ الفاظ دیگر ' معاشرے کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انسان نے اس کے فوائد کو محسوس کیا اور جوں جوں یہ فوائد عقل پر ظاہر ہوتے گئے (عقل ہی ایک ایسی قوت ہے جو ان کو سمجھ سکتی ہے) معاشرے کا نظام ظہور میں آتا گیا "

اگر ہم اس خیال کو صحیح مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ ایک عارضی گروہ بندی کا نام ہے جو چند مخصوص فوائد کے حصول کے لئے قائم ہے اگر ان فوائد کا حاصل کرنا انسانوں کے لئے ضروری نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جائیگا اور انسان پھر اسی اِنفرادی زندگی کی طرف رجوع کرینگے جو اس خیال کے مطابق شروع میں تھی - اس نقطہ نظر

میں بڑی غلطی یہ ہے کہ اس میں عمرانی زندگی کے اصل اصول اور اُس کی تشکیل کے مختلف طریقوں میں تمیز نہیں کی گئی - ان دونوں مصنفوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عمرانی زندگی کی بنیاد انسانی فطرت کے اس جذبے پر قائم ہے جس کے اظہار کی سب سے زیادہ پائدار اور سادہ شکل ماں اور بچے کی محبت ہے اور جو وسیع ہوکر تمام عالم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مخصوص طرز جو عمرانی زندگی اختیار کرتی ہے مختلف حالات کا نتیجہ اور مختلف فوائد کے حصول کا ذریعہ ہیں -

معاشری ماحول میں تربیت نفس

بہر حال خواہ سوسائٹی کی ابتدا کسی طرح بھی ہوئی ہو اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد نہایت مضبوطی کے ساتھ عمرانی زندگی پر قائم ہے - اور انسان بچپن ہی سے مختلف تمدنی اداروں اور نظاموں کا رکن بن جاتا ہے - کامیاب زندگی کا بڑا معیار یہی ہے کہ انسان پر ان تمام اداروں کی رکنیت کی وجہ سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو عمدگی کے ساتھ ادا کرے اور جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان سے پورا فائدہ اُٹھائے - ان اداروں میں شرکت کر کے اسے اپنی قوتوں کے اظہار اور نشو و نما کا موقع ملتا ہے اور وہ حقیقی معنی میں انسان بن جاتا ہے - پیدائش کے وقت آدمی محض جسمانی شکل و صورت اور جبلتوں کے اعتبار سے انسان ہوتا ہے - عمرانی اور اخلاقی اعتبار سے انسانیت کے مرتبے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر شخص ایک مسلسل اور منظم جد و جہد کے ذریعے اپنی شخصیت کی تشکیل و تربیت کرے - اس جد و جہد کی نگرانی بچپن اور نوجوانی میں والدین

رر استاد اور معاشرے کے مختلف ادارے کرتے ہیں اور بلوغ کے بعد خود
نسان اپنا رہنما اور محتسب بن جاتا ہے - انسانی شخصیت کوئی بنی
بنائی چیز نہیں جو قدرت کی طرف سے ہر شخص کو ملتی ہو بلکہ وہ ایک
اعلیٰ درجہ کا تخلیقی کارنامہ ہے جس کو انجام دینے کے لیے فرد اور جماعت
کی قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey)
جو امریکہ کے سب سے بڑے تعلیمی مفکر ہیں ' اپنی کتاب " فلسفہ کی
تعمیر نو " (Reconstruction in Philosophy) میں لکھتے ہیں کہ :

" انفرادی سیرت سے مراد ہے جدت ' ایجاد ' تدبیر کا مادہ
اور اعمال و عقائد کے معاملے میں ذاتی انتخاب کی
ذمہ داری اور یہ سب چیزیں فطرت کا عطیہ نہیں ہیں -
انہیں حاصل کرنا پڑتا ہے " [١]

اس کا آخری جملہ قابل غور ہے - شخصیت کے حصول کے لئے
پیہم اور مستقل کوشش کی ضرورت ہے اور یہ اسی حد تک حاصل ہوتی
جاتی ہے جس حد تک انسان کوشش کرکے اپنی جبلتوں اور صلاحیتوں
کو تربیت دیتا ہے اور ان کو ہم آہنگ کر کے اپنی ذات میں قوت اور
سکون اور توازن پیدا کرتا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ انسان یہ کوشش تنہائی
میں وہ کر نہیں کر سکتا - اس کی کوششوں کی جولاں گاہ بننے اور ان
میں معنی اور مقصد پیدا کرنے کے لئے عمرانی زندگی کی ضرورت ہے کیونکہ
اسی میں وہ مختلف قسم کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں جو افراد کی
قوتوں کو ابھارتے ہیں اور ان کو دعوت عمل دیتے ہیں - بچہ کی جبلتوں
کی ابتدائی شکل بالکل غیر معین ہوتی ہے - ان کو اظہار کی خواہش

---

[١] صفحہ ٩ -

ہوتی ہے لیکن فطرت کی طرف سے ان کے لیے کوئی خاص طریقے اظہار کے
معین نہیں ہوتے - یہ بچہ کے ماحول اور مشاغل پر منحصر ہے کہ وہ
اپنی کسی خاص جبلت ' مثلاً تجسس یا ملکیت کو کسی طریقے پر
ظاہر کرتا ہے - ممکن ہے کہ وہ بڑا ہوکر تجسس کا اظہار اس طرح کرے
کہ دوسرے لوگوں کے بھید معلوم کرنے کی فکر میں رہے اور غیر متعلق اور
فضول افواہوں سے دلچسپی لے - یا عمدہ نگرانی اور ہدایت کے ذریعہ
اس قوت کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ بڑا ہوکر علمی تحقیق و
تفتیش اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے اپنی اس جبلت کو تسکین دے -
اس کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ گھر اور مدرسے میں بچے کو
ایسے مشاغل میسر آتے ہیں یا نہیں جن کے ذریعے وہ ان جبلتوں سے
عمدہ اور معاشرتی نقطہ نظر سے مفید طریقے پر کام لے سکے - برٹرنڈرسل
(Bertrand Russel) اپنی کتاب " تعلیم " میں بچوں کی جبلت
کی تربیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" غرض تعلیم کا گر جہاں تک اسکا تعلق سیرت کی تشکیل
سے ہے یہی ہے کہ طلبہ کو ایسے کام اور ہنر سکھائے جائیں جن
کے ذریعے سے وہ اپنی جبلتوں کو بطریق احسن استعمال
کر سکیں - اظہار قوت کی جبلت جس کو بچہ نو عمری
میں بھونڈے طریقے سے نیلی ریش [۱] کی نقل اتار کر
ظاہر کرتا ہے بڑی عمر میں زیادہ موزوں اور معقول صورتوں
میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً سائنس کی تحقیقات میں '
آرٹ کی تخلیق میں یا بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت

[۱] Bluebeard - ایک فرضی شخص جس کی کہانی مشہور ہے کہ وہ بہت سی
عورتوں سے شادی کرتا تھا اور انہیں قتل کر دیتا تھا -

میں یا اسی قسم کے اور ہزاروں مشغلوں میں سے کسی
ایک میں - اگر کسی شخص کو لڑنے کے سوا اور کچھ بھی
نہیں آتا تو اس کے عزم للقوۃ کی تسکین صرف جنگ و
جدل ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے - برخلاف اس کے اگر اس
کو اور بھی بہت سے کام آتے ہیں تو اسے ان میں اظہار
خودی کر کے مسرت حاصل ہوگی......اگر موقع ملے تو
میں مدرسے کے لڑکوں اور لڑکیوں کو طوفانی سمندروں میں
جہاز چلانا ' بلندی سے پانی میں غوطہ لگانا ' موٹر اور
ہوائی جہاز چلانا سکھاؤں میں - انہیں اونڈل کے پبلک
اسکول کے ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کی
طرح مشینیں بنانا اور سائنس کے تجربات کی خاطر اپنی
جان خطرے میں ڈالنا سکھاؤں اور جہاں تک ممکن ہو
قطرت کی قوتوں کو ان کے سامنے حریف مقابل بناکر
پیش کروں " [۱]

اس مقولے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ افراد کی نشو و
نما میں جماعت کا حصہ کس قدر زیادہ ہے اور وہ اپنی قوتوں کو مناسب
شکل اسی وقت دے سکتے ہیں جب یہ قوتیں عمرانی مقاصد کو پیش
نظر رکھ کر استعمال کی جائیں - نظریہ تعلیم میں اس اصول کی بڑی
اہمیت ہے اور ہم کسی آئندہ موقع پر اس کے نتائج سے بحث کرینگے اور
بتائینگے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے مدرسے کی عملی تعلیم میں کیسی
انقلاب انگیز تبدیلیاں لازم آتی ہیں اور نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم میں
کن بنیادی تغیرات کی ضرورت پڑتی ہے - یہاں اتنا بتادینا کافی ہے کہ اگر

---

[۱] صفحہ ۱۰۲ -

کسی جماعت کو مختلف قسم کے مشاغل کے مواقع حاصل نہ ہونگے تو اس کی عمرانی زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہوگا اور اس کے افراد کی نشوونما بھی محدود رہے گی - انسانوں کا باہمی تعلق اور ان کی جماعت بندی خواہ کسی مقصد سے اور کسی شکل میں ہو ان کے ارتقاء پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی - جس حد تک ہم ان تعلقات کو جو کسی جماعت کی رکنیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں منظم کرینگے یہ اثر زیادہ نتیجہ خیز اور بہتر ہوگا اور جس قدر ان کے افراد میں باہمی اشتراک عمل ہوگا اتنی ہی ان کی زندگی میں خیال اور عمل کی آزادی زیادہ ہوگی -

نتیجہ یہ نکلا کہ تمام عمرانی اداروں کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ افراد کو وسیع ترین معنوں میں تعلیم دیں اور ان کی شخصیت کی تشکیل کریں تاکہ وہ اپنی مختلف فطری قوتوں کو اس طرح استعمال کرسکیں کہ خود ان کو بھی فائدہ پہنچے اور معاشرے کو بھی - لیکن یہ ان اداروں کا " مقصد اعلیٰ " ہے جس کا ہمیشہ ان کے اراکین کے پیش نظر رہنا ضروری نہیں - ان کے فوری مقاصد جو ان کے عمل پر زیادہ موثر ہوتے ہیں بالعموم دوسرے ہوا کرتے ہیں - مثلاً انسان جو پیشہ اختیار کرتا ہے اس سے اس کی طبیعت اور مزاج پر اثر پڑتا ہے اور اس کی شخصیت پر ایک خاص رنگ چڑھ جاتا ہے - یہ بھی وسیع معنوں میں تربیت کا ایک جزو ہے لیکن یہ اثر بالعموم ان مشاغل کا ایک ضمنی نتیجہ ہوتا ہے - ممکن ہے اس اثر کا عام رجحان یہ ہو کہ وہ شخصیت کو زیادہ مکمل اور موثر بنائے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی امکان ہے کہ اس سے پیشہ‌ور کی دلچسپیاں زیادہ تنگ اور محدود ہو کر رہ جائیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکثر صنعت و حرفت کے کاموں میں تقسیم عمل اتنی زیادہ ہوگئی ہے اور

مشینوں کو اس قدر غلبہ حاصل ہو گیا ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں میں تنگ نظری' اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے - بیشے کی طرح مذہب بھی وسیع معنی میں تربیت انسانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس تعلق کو جو خدا کے اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے واضح اور مستحکم کرتا ہے - عرض ان تمام اداروں میں تعلیم کا نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جو بلاواسطہ اور بالقصد اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی نشوونما اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کی تشکیل کا انتظام کرے - اور اس کی صورت یہ قرار دی گئی ہے کہ ان کو بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے ماحول میں رکھا جائے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو فعل میں لاکر دنیا کی زندگی میں کامیابی اور عمدگی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اسی نظام تعلیم کی مدد سے ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو اپنے گوناگوں تجربات اور معلومات میں شریک کرتی رہے اور اسے آیندہ فرائض کی ادائگی کے قابل بنائے -

ماحول کی تخلیق میں انسان کا حصہ

ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی زندگی کی طرح جماعتوں کی زندگی میں بھی ایک تسلسل قائم ہے - جس طرح حیات حیوانی کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے جاری رہتا ہے اسی طرح معاشرے کی زندگی کا تسلسل اس پیچیدہ نظام کے ذریعہ قائم رہتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جس سے ایک نسل اپنے تمام علمی اور اخلاقی کمالات اور فنون لطیفہ کے خزانوں کو دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی ہے - ہم اپنے چاروں طرف جو ماحول دیکھتے ہیں وہ ہمارا عمرانی ورثہ ہے

اور ہمیں اپنی پیشرو نسلوں سے ملا ہے - اس ماحول کے بہت سے ادارے اور عناصر تو صریحاً ایسے ہیں جو انسانی صناعی اور خلاقی کا نتیجہ ہیں - مثلاً علم و ادب کے شاہکار ، فنون لطیفہ کے نمونے ، عمارتیں ، کارخانے اور اسی قسم کی تمام چیزیں جو انسان نے اپنی دماغی کاوش سے ترتیب دی ہیں یا ایجاد کی ہیں - لیکن وہ چیزیں بھی جو بظاہر فطرت کا عطیہ ہیں - ایک حد تک انہیں انسانی کوششوں کی مرہون منت ہیں اور ان کو بھی اسی عمرانی ورثے میں شمار کرنا چاہئے - ہم اپنے گرد و پیش جو دریا اور پہاڑ کھیت اور سڑکیں وغیرہ دیکھتے ہیں یہ سب بھی اپنی ابتدائی فطری حالت میں نہیں ہیں بلکہ انسان کی قوت تخلیق و تسخیر کے کارنامے ہیں جس نے زمین کی شکل و صورت تک کو بدل دیا ہے اور اس کی تمام پوشیدہ اور زبردست قوتوں کو ، جو ایک زمانے میں ضعیف انسان سے نبرد آزما رہتی تھیں ، قابو میں لاکر انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے -

اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان مکالمے کی شکل میں انسانی کوششوں کے اس اعجاز کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے - انسان خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے -

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم
سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم * من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غرض اس ماحول سے جو ہمیں گویا ورثہ میں ملا ہے ' ہماری مراد ایک طرف تو مظاہر فطرت کی وہ جامد دنیا ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف علوم و فنون ' اخلاق و سیاست کی نمو پذیر دنیا جو گذشتہ نسلوں کی دماغی جد و جہد اور تخلیقی کوششوں کا نتیجہ ہے اور جس کی ترقی ہماری اپنی مسلسل کاوشوں پر منحصر ہے - ہماری موجودہ زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ عملی ہو یا نظری تمام تر اسی معاشرتی ورثے کا مرہون منت ہے جو ہم نے اپنے پیش روؤں سے پایا ہے - ہمارے علوم اور ادب ہماری موسیقی اور مصوری ' ہمارا قانون اور سیاست ' ہمارے مدرسے ' ہماری صنعت و حرفت ' غرض ہر چیز اس منتظم اور تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جس میں بے شمار افراد اور جماعتیں گذشتہ زمانوں میں حصہ لے چکی ہیں ' جن میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور اکثر کی کوششیں گمنامی کے پردے میں پوشیدہ ہیں - اس لحاظ سے یقیناً ہماری موجودہ نسل ان تمام نسلوں کے ترکے کی حامل ہے جو ہم سے پہلے گذر چکی ہیں اور ہم تہذیب و تمدن کے ارتقائے پیہم میں اپنی کوششیں اس منزل سے شروع کرتے ہیں جہاں سے گذشتہ نسل نے اس کو چھوڑا ہے - اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ تمام گذشتہ زمانوں کا وارث ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ حال کا ایک جز و لازم بن کر مستقبل کی تعمیر میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے - ہم ماضی کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اتھا کر اس طرح نہیں پھینک سکتے جس طرح ایک مزدور اپنے بوجھ کو پھینک دیتا ہے کیوں کہ اس کا اثر ہمارے رگ و ریشے میں ' ہمارے قلب و دماغ میں خون کی طرح سرایت کرچکا ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم گذشتہ زمانے کے خیالات یا رسم و رواج کی مخالفت کریں ' اس کی برائیوں کے خلاف جنگ کریں اور

اپنے لئے نئے شاهراہ عمل کی بنیاد ڈالنا چاهیں - لیکن اس جنگ میں
هم جس قدر ذهنی اور مادی آلات اور وسائل کا استعمال کرتے هیں وہ بھی
تمام تر اسی زمانہ ماضی کا عطیہ هوتے هیں ! قدامت پسندی اور جدت
پسندی میں یہ فرق نہیں کہ قدامت پسند ماضی کے ساتھ وابستہ هوتا هے
اور جدت پسند اس سے آزاد - وابستہ دونوں هوتے هیں اور اس سے مدد
لئے اور فائدہ اتھائے بغیر دونوں کو چارہ نہیں - فرق صرف نقطہ نظر کا هوتا هے
کہ اس معاشرتی ورثے کو جو انہیں ملا هے کس طرح استعمال کریں - آیا
اپنی علمی اور عملی قوتوں کو محض اپنے بزرگوں کے کارناموں کی تشریح
اور تفسیر اور حفاظت میں صرف کریں - یا ان کارناموں پر خود اپنے ارتقاء
پذیر تجربے کی بنیاد رکھیں اور ان میں اپنی عقل سے اپنے زمانے کی روز
افزوں ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی عمل میں لائیں - بڑے سے بڑا
سائنس داں اور فلسفی اور موجد بھی اس سے زیادہ نہیں کرسکتا کہ دنیا
کی پچھلی معلومات اور واقفیت سے فائدہ اتھاکر مادی یا ذهنی مظاهر
میں سے بعض کو لے کر انہیں ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کردے یا ان
کے مشاهدے سے ایسے قانون دریافت کرے جن کے سمجھنے سے اس سے پہلے
کے صاحبان فکر قاصر رهے هوں - اس لئے گو اس کی ایجاد یا دریافت کی
قدر کتنی هی زیادہ هو لیکن وہ اپنی کامیابی کے لئے سراسر متقدمین کا
محتاج هوتا هے - ایک انگریز مصنف اپنی کتاب [۱] میں لکھتا هے کہ

" اگر هم کسی قابل ترین شخص کے کارناموں کا مقابلہ اس
علمی دولت سے کریں جو اس کو ماضی سے ورائتاً ملی هے اور
جس کی وجہ سے وہ اپنا کام کر پایا تو اس کے کارنامے
مقابلتاً بالکل هیچ معلوم هوتے هیں -

---

[۱] Brown : Underlying Principles of Modern legislation صفحہ ۱۱۲

تعلیم و تہذیب کے نقطۂ نظر سے یہ تمدنی ورثہ بھی ھمارے لئے اتنا ھی اھم ھے جتنا وہ جسمانی اور نفسی ورثہ جو ھم اپنے آبا و اجداد سے براہ راست حاصل کرتے ھیں ھماری دماغی نشو و نما کے لئے یہ دماغی کا عطیہ اسی قدر ضروری ھے جس قدر جسمانی صحت کے لئے تازہ ھوا اور صاف پانی - بالڈون (Baldwin) اس مسئلہ پر بحث کرتے ھوئے لکھتا ھے :—

" بچہ بالکل اسی طرح معاشرتی تعلقات کے نظام کے اندر پیدا ھوتا ھے جس طرح وہ کرہ ھوا کے اندر پیدا ھوتا ھے - جس طرح ھوا میں سانس لے کر اس کا جسم بڑھتا ھے اسی طرح اس عمرانی ورثے کو جذب کرنے سے اس کی دماغی نشو و نما ھوتی ھے [۱] "

معاشرتی ورثے سے مستفید ھونے کے لئے تعلیم کی ضرورت

لیکن انفرادی جسمانی اور اجتماعی تمدنی ورثے میں ایک نہایت اھم فرق ھے جن کو ذھن نشین کرنا فلسفہ تعلیم کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ھے - جسمانی ورثہ بھی تمدنی ورثہ کی طرح ھر انسان کو ملتا ھے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے یا اس پر قابو پانے کے لیے کسی خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں - وہ خصوصیتیں اور جبلتیں جو بچے کو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے وراثتاً ملتی ھیں رفتہ رفتہ طبعی حالات میں ، خود بخود ظاھر اور پختہ ھوتی جاتی ھیں - یہ سچ ھے کہ جبلت کے اظہار کے لئے کسی تحریک کی ضرورت ھوتی ھے لیکن اس قسم کی مناسب تحریکیں ھر حیوان کے ماحول میں موجود ھوتی

[۱] ملاحظہ ھو : Social and Ethical Interpretations

ھیں - بچے میں غذا حاصل کرنے کی جبلت ھوتی ھے چنانچہ وہ بغیر کسی وقت اور پس و پیش کے ماں کا دودہ پینے لگتا ھے - اس کو نقل و حرکت کرنے ' کھیلنے ' چیزیں بنانے اور بگاڑنے ' انھیں اپنی ملک بنانے کی جبلی خواھش ھوتی ھے اور وہ اُن خواھشوں کو مناسب وقت پر اپنے ماحول کے اشیا کے ذریعے پورا کرتا ھے - لیکن تمدنی ورثے کا معاملہ زیادہ نازک ھے - یہاں محض قبضے کا نام ملکیت نہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ھو سکتی ھے - کوئی کتاب اس وقت تک واقعی طور پر ھماری نہیں ھو سکتی جب تک ھم اپنی دماغی کاوش سے اس کا مطالعہ کرکے اس کے مضمون پر عبور حاصل نہ کر لیں - محض قیمت ادا کرنے سے وہ ھماری حقیقی ملک نہیں بن سکتی - وہ ایک خارجی چیز رھتی ھے اور صرف اسی معنی میں ھماری ملکیت ھے جس معنی میں مثلاً کوئی میز یا کرسی ھماری ملکیت ھوتی ھے - بلکہ میز کرسی پر بھی صحیح طور پر ملکیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ھے کہ ھم اُس کا مناسب استعمال جانتے ھوں اور کرتے ھوں - جب معمولی مادی اشیا پر تصرف کے لیئے خاص قسم کی اھلیت درکار ھے تو ظاھر ھے کہ وہ قیمتی اور گوناگوں ورثہ حاصل کرنے کے لیئے ' جس کا تعلق مادی اور ذھنی دنیا دونوں سے ھے ' ھم پر اور زیادہ سخت شرائط عائد ھوتے ھیں - ایک لحاظ سے یہ ورثہ ھر وقت ھمارے پاس ھے ' ھمارے چاروں طرف موجود ھے - ھم ھر قدم پر اُس کے اثرات دیکھتے ھیں - سائنس نے فطرت کی بیشتر قوتوں کو مسخر کر کے اُنھیں ھمارا غلام بنا دیا ھے ' ادب فلسفہ اور تاریخ نے ماضی ' حال اور مستقبل کے دروازے ھم پر کھول دیے ھیں ' فنون لطیفہ کے شاھکار ھر طرف نظر کو کھینچتے ھیں - معاشرتی زندگی کا وسیع اور پیچیدہ نظام ھمیں اس طرح گھیرے ھوئے ھے جیسے کرہ ھوا -

لیکن یہ تمام چیزیں ہمارے لیے ایک مضمون سربستہ کے مانند ہیں جب تک ہم اس کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا نہ کریں - دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کی آنکھیں ہیں مگر اندھے ہیں - یعنی بہت سی چیزوں پر ان کی نظر پڑتی ہے - لیکن نہ وہ انہیں دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اُن سے کام لے سکتے ہیں - عالم رنگ اُن کے لیے کوئی وجود نہیں رکھتا - اسی طرح بہت سے آدمی ہوتے ہیں جن کے کان موسیقی سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں - اُن کے لیے بہترین نغمہ بھی خواہ وہ عالم فطرت میں پایا جائے یا انسانی تخلیق کا نتیجہ ہو ' بالکل بے معنی ہے - اسی طرح جس شخص کے ذوق حسن کی تربیت نہیں ہوئی وہ نہ مناظر فطرت کی خوبصورتی سے لطف اُٹھا سکتا ہے نہ مصوری اور فن تعمیر کے شاہکاروں سے محظوظ ہو سکتا ہے - یہی حال عمرانی زندگی کے نظام کا ہے جو صدیوں کی کوششوں اور تجربے سے وجود میں آیا ہے - اُس کے حقوق و فرائض سے آگاہی کے بغیر کوئی شخص اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا - مثلاً نظام بلدیہ کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے ہر شہری اپنی زندگی کو بہت آرام دہ اور مفید بنا سکتا ہے - لیکن ہندوستان میں کتنے فی صدی لوگ ایسے ہیں جو اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں یا اُٹھا سکتے ہیں ؟ اُن کے لئے اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - متمدن ممالک میں جا بجا کتب خانے ' عجائب خانے ' مختلف قسم کے علمی جلسے اور نمائشیں منعقد ہوتی ہیں لیکن بہت کم لوگ وہاں جاکر اپنے علم ' ذوق اور تجربے میں اضافہ کرتے ہیں - لہٰذا اُن کے لیے یہ تمام چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتیں - یہ سب اسی بیش بہا تمدنی خزانے کے اجزا ہیں جو ماضی نے حال کو وراثتاً دیا ہے اور جس میں ہماری کوشش اور ذہنی اجتہاد سے

روز بروز اضافہ ہو رہا ہے - لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ تمام ورثہ باوجود اس کے کہ ہر وقت ہمارے سامنے موجود ہے در اصل گویا ایک سنگین عمارت میں بند ہے جس کے دروازے اس وقت تک نہیں کہل سکتے جب تک افراد کی دماغی اور معاشرتی نشو و نما مناسب طریقہ پر نہ کی جائے اور اُن میں اُن چیزوں کی قدردانی کی صلاحیت اور اُن کے استعمال کی قابلیت پیدا نہ ہو -

بچپن کے زمانے کی تعلیمی اہمیت

اس تمام بحث سے تعلیم کے معنی اور اس کی عمرانی اغراض پر بہت کچھہ روشنی پڑتی ہے - ہم دیکھہ چکے ہیں کہ جب تک افراد کی تعلیم اور اُن کے فطری قوتوں کی نشو و نما کے لیے کوئی مناسب انتظام نہ کیا جائیگا وہ اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس سے کام لینے سے قاصر رہینگے اور زندگی کے کاروبار میں عمدگی کے ساتھ حصہ نہ لے سکینگے - اگر ہم اسی مسئلے کے دوسرے پہلو کو دیکہیں یعنی بچے کی نفسی زندگی کا مطالعہ کریں تب بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچینگے کیونکہ تعلیم کا عمل افراد اور جماعت کے باہمی ربط اور تعلق پر منحصر ہے اور اُس کا کوئی نظریہ اُس وقت تک صحیح نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اُس ترازو کے دونوں پلوں پر برابر نہ اُترے - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ تمام انسانی اداروں اور نظاموں کی بنیاد انسان کی فطرت اور جبلت پر ہے - یہی حال تعلیم کا ہے - اگر بچے میں شوق اور تجربہ حاصل کرنے اور اُسے برتنے کی قابلیت نہ ہوتی تو سرے سے تعلیم دینا ناممکن تھا - لیکن انسان کو تعلیم دینے کے لیے محض یہ جبلی قوتیں کافی نہیں - حیوانوں کے لیے اُن کی جبلت اور اُن کے گرد و پیش کی مفید اور مضر قوتیں معلم کا کام دیتی

هیں اور اُنھیں کی مدد سے وہ اپنی مقابلتاً محدود اور سادہ زندگی کا کار و بار انجام دینے کے قابل ہو جاتے ہیں - وہ کھیل کود کے ذریعے ' زیادہ تجربہ کار حیوانوں کی تھوڑی سی ہدایت سے اور زیادہ تر اُن جبلتوں کی بدولت جو انسانوں اور حیوانوں دونوں کے لیے محرک عمل ہوتی ہیں ' ضرورت کے مطابق اپنے ماحول کو سمجھ لیتے ہیں ' خوراک تلاش کرنا ' رہنے کے لیے کسی قسم کا گھر بنانا یا ڈھونڈنا ' اپنے دشمنوں اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے بچنا - بقائے نسل کے فرائض ادا کرنا یہی چند چیزیں بالعموم اُن کا شغل زندگی ہوتی ہیں - اور اُن سب کو وہ آدمی کے بچے کی نسبت بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور بچپن کا زمانہ ختم کرکے اپنی نوعی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں - برخلاف اُس کے انسانوں کی تعلیم میں دو مشکلات ہیں - اول تو یہ کہ بچہ پیدائش کے وقت بالکل بے بس اور بے کس ہوتا ہے - وہ اپنی حفاظت اور پرورش کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور ہر بات میں ماں کا یا دوسرے لوگوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے بچپن کا زمانہ اور تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے - یہاں بچپن سے مراد وہ تمام زمانہ ہے جب تک مرد میں اس قدر جسمانی اور دماغی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کا رہنما بن سکے اور بحیثیت ایک آزاد شہری کے معاشرے کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے فرائض پورے کر سکے - انسانی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کا بچپن اور تمام حیوانات کی نسبت کیوں زیادہ مدت تک رہتا ہے - بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ' اور بعض لوگوں کا سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ہے ' کہ بچپن کا یہ تمام زمانہ ایک طرح سے اکارت جاتا ہے کیونکہ اس سارے عرصے میں بچہ اپنا

وقت اُن اہم انسانی مشاغل میں صرف نہیں کر سکتا جو اُس کے شایان
سان ہیں - جارج برنارڈ شا (G. B. Shaw) اپنے ڈراما " رجوع بہ میتھوسلا "
(Back to Methuselah) میں ایک ایسے زمانے کی پیشین گوئی کرتا
ہے جب پیدائش ہی کے وقت بچوں کي عمر سترہ سال کی ہوگی یعنی
وہ اُس زمانے سے گذر چکے ہونگے جو اب نابالغی اور خام کاری کا سمجھا
جاتا ہے اور وہ تمام باتیں سیکھے سکھائے پیدا ہونگے جو اب بہت مشکل
اور محنت سے سیکھنا پڑتي ہیں - اِس تخیل کے لطیفہ سے قطع نظر
کر کے ' جس کا اگر امکان بھی ہوتا تو ہرگز مفید نہ ہوتا ' غور کرنے سے یہ
معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے بچپن کا طویل ہونا عین مصلحت ہے -
جانوروں کے لیے بہت مختصر سا بچپن کا زمانہ ان تمام مشاغل کو
سیکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے جن سے اُن کو آئندہ سابقہ پڑنے والا ہے اور
اس عرصہ میں وہ اپنے کم و بیش محدود اور معین ماحول کی ضروری
چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں - انسان کی حالت اُس سے مختلف ہے
اُس کا ماحول نہ معین ہے نہ محدود - جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ہے
اُس نے تہذیب و تمدن میں ترقي کی ہے ' علوم و فنون میں کمال حاصل
کیا ہے ' مادي اور ذہنی نظام قائم کیے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ
اس میں اور تمام حیوانات کی نسبت یہ صلاحیت بہت زیادہ ہے کہ
گذشتہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر نئے کاموں اور نئے مواقع سے زیادہ عمدگی
کے ساتھ عہدہ بر آ ہو سکے اپنی سیرت کو ضرورت کے مطابق ڈھالے اور
اپنے طرز عمل اور طرز زندگی میں ترمیم اور اصلاح کرے - اس صلاحیت
کي وجہ سے ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان کی ترقی جاری رہي ہے
اور اُس نے گذشتہ تجربات کے نتائج کو آئندہ کامیابي کے لیے استعمال
کیا ہے اس طرح ہر نسل نے ' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ' علوم و فنون

میں اضافہ کیا ہے اور تمدن کی مجسم یادگاریں چھوڑی ہیں - اس لیے انسان کے بچوں کو اپنے غیر محدود ' تغیر پذیر ' نمو پذیر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے گذشتہ نسلوں کے صدیوں کے تجربات کو سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے خاص اہتمام کی اور طویل مدت کی ضرورت ہے - یہی خاص اہتمام تعلیم کہلاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو تعلیم کا بہترین زمانہ ہے مقابلتاً طویل رکھا ہے - تعلیم کا مسئلہ در اصل ایک نسل سے دوسری نسل کو مفید تجربات منتقل کرنے کا مسئلہ ہے - معاشرے کی تمدنی اور اخلاقی زندگی کے بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسان جو کچھ تجربے سے سیکھتا ہے اس کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہے - اگر یہ علمی خزانے اور علمی وسائل مناسب طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک نہ پہنچائے جائیں تو تھوڑے سے عرصہ میں نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ جماعتیں بھی وحشی اور جاہل افراد کا مجموعہ بن کر رہ جائیں - واقعہ یہ ہے کہ عمرانی زندگی کا انحصار ہی ان چیزوں پر ہے جو اس کے تمام افراد میں مشترک ہوتی ہیں اور جن کو وہ اسی طرح حاصل کرتے ہیں کہ اُن میں مبادلۂ خیالات اور داد و ستد ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید - ہوتے ہیں اگر اس تعامل اور داد و ستد کا سلسلہ بند ہو جائے تو جماعت کی یک جہتی کا فوراً خاتمہ ہو جائے کیونکہ جماعت محض افراد کے ایک جگہ اکٹھا ہو جانے سے نہیں بنتی بلکہ اُن کے اتحاد خیالات اور اتحاد اعراض و مقاصد سے وجود میں آتی ہے - یہ ممکن ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوں لیکن اُن میں باہمی مراسلت وغیرہ کے ذریعے سے وہ تعلقات قائم ہوں جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں اور اُنہیں صحیح معنوں میں ایک زندہ جماعت بناتے ہیں

" ایک کتاب یا ایک خط کے ذریعے سے اُن لوگوں میں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ھیں ایسے قریبی مراسم اور تعلقات قائم ھو سکتے ھیں جو ممکن ھے ایک ھی گھر میں رھنے والوں کے درمیان نہ پائے جائیں...... افراد کو ایک جماعت یا سوسائٹی کی شکل میں منظم کرنے کے لیے ضروری ھے کہ اُن کے مقاصد، اُن کے عقائد، اُن کی خواھشات، اُن کا علم مشترک ھو۔ ان میں یک جہتی اور باھمی مفاھمت ھو - اس قسم کی چیزوں کو مادی حیثیت سے، اینٹ پتھروں کی طرح، ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں کیا جا سکتا - اُن میں لوگ اس طرح شریک نہیں ھو سکتے جس طرح کسی کھانے کی چیز کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ سکتے ھیں - وہ باھمی داد و ستد جس سے یکجہتی پیدا ھوتی ھے - ایسی ھونی چاھیے جس سے ذھنی اور جذباتی میلانات میں یکسانیت پیدا ھو اور افراد توقعات اور ضروریات کو ایک ھی طرح پورا کریں " [۱] -

افراد کی باھمی اثر پذیری

ابھی ھم تعلیم کے محدود اور مسلمہ معنی سے بحث نہیں کر رھے ھیں بلکہ افراد کی عام تربیت اور تاثیر و تاثر کے اس وسیع تر نظام کو سمجھنا اور سمجھانا چاھتے ھیں جو معاشرے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر ھے اور جس میں مدرسہ کی تعلیم کو ایک اھم لیکن جزوی حیثیت حاصل ھے - بیشک مدرسوں کا کام بھی یہی ھے، جیسا کہ ھم آئندہ چل کر زیادہ تفصیل کے ساتھ دکھائینگے کہ وہ گذشتہ اور موجودہ نسلوں کے تجربات کو منظم اور مرتب کر کے بچوں اور نوجوانوں کے سامنے پیش کریں اور اُن کے افکار اور اعمال پر معاشرتی مقاصد اور اغراض کے مطابق

[۱] Dewey : Democracy and Education صفحہ ٥ -

اثر ڈالیں - لیکن اس کام کی پوری اہمیت اور اُس کی حدود کو ہم اُس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ مستقل اور بنیادی طریقے کیا ہیں جن کے ذریعے معاشرہ خود بخود افراد کی تربیت کرتا ہے اور جس کی تکمیل اور تنظیم کے لئے مدرسے کا مخصوص ماحول ترتیب دیا گیا ہے - ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے افراد کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربات سے متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے - یعنی اسکی وجہ سے ان کے خیالات میں وسعت اور کار کردگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - جو تربیت کا مرادف ہے - اس داد و ستد میں صرف اسی شخص کو فائدہ نہیں پہنچتا جو شاگرد کی حیثیت سے اُستاد سے کچھ سیکھتا ہے بلکہ تجربے میں شرکت ایسی چیز ہے جو دونوں فریقوں کے لئے مفید ہے - جب کوئی بچہ کسی کام میں شریک ہوکر اپنے والدین کے خیالات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرتا ہے تو ایک حد تک اس کا طرز عمل اور نقطہ نظر تبدیل ہو جاتا ہے - اس کی طبیعت اور اس کے علم میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ گویا ایک نئی ہستی بن جاتا ہے - اسی طرح جب وہ اپنے ہم عمروں میں کھیلتا ہے' ان کی نقل اتارتا ہے' ان کے ساتھ مقابلہ یا تعاون کرتا ہے تو اس کے تجربے میں وسعت اور وضاحت پیدا ہوتی ہے - اسے اپنے تخیل سے کام لینا پڑتا ہے - اپنے خیالات کو' اپنی گفتگو کو' اپنے سارے طرز عمل کو ذمہ داری کے ساتھ معین اور مرتب کرنا پڑتا ہے تا کہ وہ دوسروں کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکے - عمرانی زندگی ہی کی بدولت وہ تمام مواقع حاصل ہوتے ہیں - جو انسان کو غور و فکر اور محاسبہ نفس کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس کے تجربے کو منظم اور نمو پذیر بناتے ہیں - بالکل تنہائی کی زندگی میں تو انسان کو اس سے زیادہ غور و فکر

اور تگ دو کی ضرورت نہ پڑتی وہ کہ اپنی حیوانی ضروریات کو کس طرح پورا کرلے - اسی طرح اس اشتراک عمل سے وہ بالغ افراد بھی مستفید ہوتے ہیں جو نوعمر بچوں کو اپنے تجربات میں شریک کرکے ان کی تربیت کرنا چاہتے ہیں ان کے تجربات اکثر ان کے عمل کا جزو بن جاتے ہیں اور عادت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں - جب وہ کسی بات کو ایک دفعہ سیکھ لیتے ہیں تو انہیں یہ ضرورت نہیں رہتی کہ اس کی منطقی یا نفسیاتی تحلیل کریں - اور اپنی معلومات کو معین اور واضح شکل میں ترتیب دیں - لیکن جب انہیں نوعمر بچوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تجربے کو اس طرح مرتب کریں کہ بچے اس سے مستفید ہوسکیں یعنی ان کے پختہ اور مکمل تجربے اور بچوں کے نامکمل اور آزمائشی تجربات کے درمیان رابطہ قائم ہوجائے - اس مقصد کے لئے انہیں بہت کچھ دماغی کاوش کرنی پڑتی ہے جو خود ان کی ذات کے لئے مفید ہوتی ہے - غرض بالغوں کے نقطہ نظر سے فن تعلیم کے معنی یہی ہیں کہ معاشرے کے تجربات کو ایسی شکل میں منتقل کیا جائے کہ وہ بچوں کے خیالات جذبات اور دلچسپیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوجائیں - اور ان کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے نامکمل اور مبہم تجربات کی تکمیل اور تنظیم کرکے تہذیب و تمدن کے حامل بن جائیں- جو لوگ فن تعلیم سے پوری واقفیت رکھتے ہیں انہیں اندازہ ہے کہ یہ کام کس درجہ مشکل اور کتنی ذمہ داری کا ہے - اس کو انجام دینے کے لئے کسی قدر علمی قابلیت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے اور اگر یہ ایمان داری اور خلوص کے ساتھ کیا جائے تو اس سے خود معلموں کی قابلیت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں -

'' ذرا اس بات کی کوشش کیجئے کہ کسی تجربے کو وضاحت اور صحت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو سمجھایا جائے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ خود آپ کا نقطہ نظر اس کے متعلق بدل گیا ہے - بالخصوص اس صورت میں کہ وہ تجربہ ذرا پیچیدہ اور مشکل ہو.........کسی تجربے کو منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو ایک مخصوص شکل میں مرتب کیا جائے - اور ترتیب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم بے تعلقی سے اس پر غور کریں ' اسے دوسرے شخص کے نقطہ نظر سے دیکھیں ' یہ سوچیں کہ اس تجربے میں اور دوسرے کی زندگی میں کسی طرح رابطہ قائم ہو سکتا ہے - اور یہ اُس کے سامنے کس شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ اِسے آسانی سے سمجھ لے - سوائے اُس صورت کے کہ ہم بالکل پیش پاافتادہ اور جانی بوجھی باتیں سکھانا چاہیں ہمیشہ اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے تجربے کو موثر طور پر کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہم ایک حد تک ' اپنی قوت تخیل سے اُس کے تجربات کو اپنے تجربات بنا لیں '' [۱] -

نظام تمدن کا ارتقا

انسان نے جوں جوں ترقی کی ہے ' انتقال تجربات کے وسائل بھی بڑھ گئے ہیں اور زیادہ مکمل ہو گئے ہیں - سب سے قدیم اور موثر ذریعہ تو یہی ہے کہ لوگوں کو ایسے مشاغل میں شریک کیا جائے کہ وہ براہ

[۱] Dewey : Democracy and Education صفحہ ۷ -

واسطے اُن تجربات کو حاصل کریں جن کو منتقل کرنا مقصود ہے - اور تعلیم کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ بالغوں نے بچوں کو اپنی روز مرہ زندگی میں شریک ہونے کا موقع دیا اور اس طرح اُن کو وہ ضروری فنون اور رسوم و روایات سکھائیں جو معاشرے کے نزدیک قائم رکھنے کے قابل تھیں - لیکن اسکے ساتھہ ہی خود بالغ افراد کے روز افزوں تجربات کو محفوظ رکھنے کا مسئلہ بھی پیدا ہوگیا تھا - اول اول اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے محض حافظے سے کام لیا جاتا تھا - اور اُن کو منتقل کرنے کے لیے زبانی الفاظ سے - چنانچہ قدیم ترین ادب اور شاعری کے شاہکار ہم تک اِسی طرح سینہ بسینہ پہنچے ہیں - مگر انسان کا دماغ اِس ناقابل اعتبار اور محدود انتظام پر قناعت نہیں کرسکتا - اُس کی قوت اِختراع نے اپنے تجربات کی حفاظت کے لیے بہت سے نئے ذرائع اِیجاد کر لیے - فن تحریر نے انسانی خیالات کو حیات دوام بخشدیا اور ہمیں حافظہ کے فریب سے آزاد کر دیا - آوازوں کو قائم رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے آلات ' گراموفون وغیرہ بنائے گئے - صورتیں مصوری اور عکاسی کے ذریعہ فنا ہونے سے بچا لی گئیں - یہ تمام ذرایع انسانی تجربات کو منتقل کرنے کے کام میں آنے لگے ہیں اور اُن میں آئے دن نت نئی اِیجادیں اور اضافے ہوتے رہتے ہیں - چنانچہ آج ہر متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں خیالات کو منتقل کرنے کے ذرائع اِس کثرت سے موجود ہیں کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر علوم و فنون کے کسی شعبے میں کام کرتے ہیں ایک دوسرے کی کوششوں ' کامیابیوں ' اور ناکامیوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - زمان و مکان کی قیود سے انسان بڑی حد تک آزاد ہو گیا ہے اور خیال کے گویا پر لگ گئے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں پہنچ سکتا ہے - اخباروں کے ذریعے تمام ملکوں

کی خبریں روز کے روز معلوم ہو جاتی ہیں - گراموفوں کے ذریعے ہم حال اور ماضی کے بڑے بڑے موسیقی دانوں اور مقرروں کی آواز سن سکتے ہیں - تیلیفوں ، سنیما ، لاسلکی ، وغیرہ خیالات کو سرعت کے ساتھہ پھیلاتی ہیں اور اشتراک عمل کے امکانات کو زیادہ کرتی ہیں - اُن تمام چیزوں کی مدد سے تہذیب و تمدن کا نظام ، جس کی بنیاد وحشیوں اور نیم شائستہ جماعتوں نے ڈالی تھی ، نہایت تیزی کے ساتھہ پھیلتا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے -

اب تعلیم کا مسئلہ اِس صورت میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے کہ ایک طرف تو نو عمر بچہ ہے جو نہ جسمانی نقل و حرکت کے قابل ہے ، نہ اپنے ماحول سے واقف ہے ، نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتا ہے اور دوسری طرف یہ عظیم‌الشان نظام تمدن اور علوم و فنون کی دنیا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے - کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کا بچہ بھی بغیر کسی خارجی امداد کے ، محض اپنی جبلت اور ماحول کی قوتوں کی رہنمائی میں ، جانوروں کے بچوں کی طرح تھوڑے سے عرصہ میں اس نظام کے تمام عناصر پر حاوی ہوکر اپنے فرائض کو ادا کرنے کے قابل ہو جائے ؟ ظاہر ہے کہ یہ بات امکان سے خارج ہے -

تعلیم کے ذریعہ نظام تمدن کا قیام

انسانوں اور جانوروں کے ماحول میں اب تو زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن تمدن کے ابتدائی مدارج میں بھی یہ تفاوت نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا - ممکن ہے کہ بالکل ابتدائی مدارج میں انسانی تمدن اس درجہ سادہ اور واضح ہو کہ اُس وقت کے بچے بغیر کسی خاص بیرونی امداد کے چھوٹی سی عمر میں " بالغ " ہو جاتے ہوں یعنی بالغوں کی

زندگی میں شریک ہوکر تمدنی کاروبار میں حصہ لیتے ہوں - لیکن جوں جوں یہ نظام زیادہ متنوع اور پیچیدہ ہوتا گیا بچوں کو تمدنی زندگی کے لیے تیار کرنا بھی ایک مشکل اور اہم ذمہ داری ہو گئی - جس کے لیے زیادہ مدت درکار ہونے لگی - بچپن جس کو " تیاری کے زمانے " سے تعبیر کیا جا سکتا ہے - کوئی معین مدت نہیں بلکہ اُس کی میعاد ضرورت کے مطابق خود بخود بڑھتی جاتی ہے تاکہ بچے اس عرصہ میں کم از کم اُن وسائل پر قابو پا سکیں جن کی مدد سے وہ نظام تمدن کو سمجھ لیں اور اُن کی جسمانی اور دماغی نشو و نما صحیح راہ پر لگ جائے - تعلیم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کا زمانہ واقعی زیادہ طویل ہوتا گیا ہے - گذشتہ صدی کی تعلیمی جد و جہد کا ایک اہم باب وہ کوششیں ہیں جو بچوں کی لازمی تعلیم کی مدت کو بڑھانے کے لئے کی گئی ہیں - اکثر مغربی ممالک میں صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد سے برابر یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ نہ صرف بچپن کے زمانے میں بلکہ زمانہ بلوغ میں بھی طلبہ تعلیمی ماحول اور تعلیمی اثرات میں رہیں کیونکہ ماہرین تعلیم محسوس کرتے ہیں کہ دور حاضرہ کے تمدن کے بہت سے اصول اور فرائض ایسے ہیں جن کو طلبا بچپن کے زمانے میں نہیں سمجھ سکتے - اُن کو عمدگی کے ساتھ سمجھنے کے لیے زیادہ پختہ تجربے کی ضرورت ہے جو بلوغ کے زمانے میں حاصل ہوتا ہے جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عمرانی زندگی کے حقوق اور فرائض کو خود اپنے عملی تجربے کی بدولت پہچانتی ہیں - اسی وجہ سے امریکہ میں ثانوی تعلیم کو بھی تمام طلبہ کے لئے مفت اور لازمی قرار دیا گیا ہے اور جرمنی میں ہر طالب علم کو ابتدائی تعلیم کے مدارج ختم کرنے کے

بعد اتھارہ سال کی عمر تک " تعلیم مزید " کے کسی شعبے میں داخل ہونا پڑتا ہے - انگلستان میں چند سال ہوئے ایک مشورتی کمیتی مقرر کی گئی تھی جس نے تعلیم بالغان کے مسئلہ پر غور کر کے ایک نہایت قابل قدر رپورت پیش کی ہے [۱] اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ عہد بلوغ کے شروع ہوتے ہی بچوں کو مدرسے سے نکال کر زندگی کی کشمکش اور آزمائشوں میں ڈال دینا اور ان کو تعلیمی ہدایت اور رهنمائی سے محروم رکھنا ' بہت خطرناک چیز ہے - شہری زندگی کے فرائض اور اصولوں کو سمجھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ عمر کی اس اهم اور نازک منزل میں ان کے لئے مناسب تعلیمی ماحول اور سہولتیں فراهم کی جائیں - اقتصادی اور تمدنی مشکلات اور ایک حد تک انفرادی اختلافات کا خیال کرتے ہوئے وہ اس بات کو مناسب نہیں سمجھتے کہ تمام نوجوان ثانوی تعلیم کے کل مدارج مدرسوں میں طے کریں - اس لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ تعلیم مزید کے موجودہ نظام کو مرتب اور مکمل کیا جائے اور وہ تمام طلبہ جو با قاعدہ ثانوی مدارس میں تعلیم نہیں پا سکتے اپنے وقت کا ایک حصہ ' جو ان کے اقتصادی مشاغل سے بچایا جائے ' ان مدرسوں میں صرف کریں اور وہاں ان کو تعلیم ایسی دیجائے کہ وہ نہ صرف اپنے مخصوص اقتصادی کاروبار میں زیادہ قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکیں بلکہ اپنے عمرانی وظائف کو بھی اچھی طرح سمجھ کر ادا کریں -

اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی تمدن کے نظام میں تعلیم کی ابتدا کس طرح ہوئی - بچہ اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجھ سے

---

[۱] Report of the Consultative Committee on the Education of the Adolescent

اپنے گھر والوں کا ، خصوصاً اپنے والدین کا سہارا لیتا ھے - محض اسی بات سے کہ وہ پیدا ہوتے ھی اپنے سے زیادہ عمر اور تجربہ کے لوگوں کے ساتھ رھتا ھے - اور ان سے تعلقات پیدا کرتا ھے اس کی تعلیم کی ابتدا ہو جاتی ھے - شروع میں اس " تعلیم " کا مقصد علم سکھانا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہوتا ھے - والدین اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ھیں جن کا منشا اس کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کی نشو و نما کرنا ہوتا ھے - اگر اس کے لئے یہ انتظام نہ ہو تو زندگی محال ہو جائے - اب جوں جوں اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت اور دماغ میں آدمیوں اور چیزوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ھے وہ اپنے انسانی اور طبیعی ماحول سے تعلقات پیدا کرتا ھے - اپنے والدین ، عزیزوں اور دوستوں کی ہمت افزائی اور روک تھام ، اور ایک حد تک قدرتی تادیب کے ذریعے اس کی عمرانی اور اخلاقی تعلیم بھی شروع ہوجاتی ھے - خاندان کے افراد اور متعلقین جو تعلیمی اثر بچے پر ڈالتے ھیں اس کی تفصیل ہم ایک آئندہ باب میں کریں گے لیکن اس کی ابتدائی تربیت میں قدرتی تادیب کی اہمیت کا سمجھ لینا ضروری ھے - اکثر محبت اور احتیاط کرنے والے والدین اس بات کی کوشش کرتے ھیں کہ بچے اس تکلیف سے بالکل محفوظ رھیں جو غلط اور نا مناسب حرکات کی وجہہ سے انہیں پہونچنی چاھئے - لیکن مشہور انگریزی مفکر ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نے شد و مد اور قابلیت سے یہ ثابت کیا ھے کہ اخلاقی تعلیم کے لئے وہ تادیب بہت موثر ہوتی ھے جو بچے اپنے اعمال کا قدرتی خمیازہ بھگتنے سے حاصل کرتے ھیں - وہ اپنی معرکۃالآرا تصنیف " فلسفہ تعلیم " میں لکھتا ھے :-

"یہ قدرتی سزائیں جو بچے کے بے جا کاموں کا نتیجہ ہیں
مستقل بلا واسطہ اور یقینی ہیں اور ان سے چھٹکارا نہیں
ہوسکتا - یہاں زجر و توبیخ کا کچھہ کام نہیں - بلکہ چپ
چاپ سختی سے کام لیا جاتا ہے - اگر بچہ اپنی انگلی میں
سوئی چبھو لے تو نتیجہ یہ ہے کہ اس کو تکلیف ہوتی ہے -
اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر یہی نتیجہ ہوتا ہے اور
اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے - بچہ موجودات غیر روح
کے ساتھہ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ
وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے - کوئی عذر نہیں
سنتے اور ان کی نہ داد ہے نہ فریاد - اس سخت مگر
فیض پہنچانے والی تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی
ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آئندہ ان کی خلاف ورزی نہ کرے
.........معاشرتی تربیت اور بچوں کی ابتدائی تربیت
جو قدرت کرتی ہے ان دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت کو
سب نے تسلیم کر لیا ہے - اور کنایتاً اس بات کا بھی یقین
حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے" [۱]

اس تمام بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تعلیم اور
تمدن ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں - تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں
جس کو بعض ضروریات سے مجبور ہو کر انسان نے قائم کر لیا ہو اور نہ وہ
ایسا شغل ہے جس کو انسانی زندگی کے لئے محض زینت کا باعث سمجھا
جائے - وہ تو تمدنی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہے اور جسم

---

[۱] ہربرٹ سپنسر : فلسفۂ تعلیم (مترجمہ خواجہ غلام الحسنین)

اجتماعی میں جان بن کر سمائی ہوئی ہے- لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دکھایا ہے اس کا مقصد اب محض اتنا نہیں کہ وہ تسلسل حیات کو قائم رکھے بلکہ وہ " حیات برتر " کا ایک وسیلہ بن گئی ہے جس کے ذریعہ ہم نا واقف اور نا تجربہ کار بچے کو بہترین اخلاقی اور معاشرتی اقدار [۱] اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے ورثے کے ان عناصر کو جو بہترین تعلیمی قدر رکھتے ہیں بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں خود بخود ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ڈالنے کی اہلیت پیدا ہو جائے اس طرح تعلیم ایک طرف بچے کی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اسے تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے - بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ شخصیت کی نشو و نما ہی ان مشاغل کے ذریعہ کرتی ہے جو تمدنی زندگی کا اہم جزو ہیں اور جن کے ذریعے سے بچہ رفتہ رفتہ اسے سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے - لیکن یہ نظریہ تعلیم کا صرف ایک رخ ہے - یعنی اگر ہم عمل تعلیم کو معاشرے یا بالغ افراد کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے بچوں کو تمدنی زندگی کے لیے تیار کر رہے ہیں -

تعلیم کا ایک غلط تصور

لیکن اُس نظریہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ہم مسئلہ تعلیم پر اُس کے موضوع یعنی بچوں کے نقطہ نظر سے بھی غور کریں اور دیکھیں کہ اُن کے نزدیک اس تمام سلسلہ مشاغل کے کیا معنی ہیں جو تعلیم گاہوں وغیرہ میں رائج ہے - اُن کو اُن تمام سبقوں اور کھیلوں کے سیکھنے سے کیا حاصل ہوتا ہے جن میں وہ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف

Values [۱]

کرتے ہیں؟ تعلیم پر یک طرفہ غور کرنے سے اکثر معلموں نے اور تعلیمی نظریئے قائم کرنے والوں نے بہت بڑی غلطیاں کی ہیں جن کا خمیازہ بے چارے بچوں نے صدیوں بھگتا ہے - انہیں غلطیوں میں سے ایک یہ خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف اتنا ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کرے - بظاہر یہ خیال نہ صرف بالکل بے ضرر بلکہ بہت صحیح اور مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُس میں تعلیم اور تمدنی زندگی کا باہمی تعلق مد نظر رکھا گیا ہے - لیکن ہر خیال جو بجائے خود مفید ہوتا ہے اگر ہم اس میں اس قدر محو ہو جائیں کہ ہمیں دائیں بائیں آگے پیچھے کچھہ نہ دکھائی دے تو وہ بہت سی غلطیوں کا سبب بن جاتا ہے - تعلیم کا کام یقیناً یہ ہے کہ طلبہ کو اُن فرائض اور ذمہ داریوں کے لئے تیار کرے جن سے اُن کو سابقہ پڑیگا لیکن اِس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے جو عملی نتائج نکلے وہ سراسر نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں - اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ معلم نے بجائے اُس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں ' قوتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا مستقبل کی توقعات اور ضروریات کو اپنا نصب العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا - اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے - لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل - اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اُس کی نشو و نما کے ہر ہر قدم کو اُس کے لئے معنی خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اُس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے ' اُس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے - معلم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نو عمر بچہ ایک

مخصوص شخصیت کا مالک ہے اور مخصوص شوق اور رجحانات رکھتا ہے - جن کا دریافت کرنا اُس کا فرض ہے اور جن کی تربیت کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اُس کا خاص فن ہے - لیکن استادوں اور والدین نے عام طور پر اس نفسیاتی نکتے کو بھلا دیا اور مستقبل کی تیاری کی دھن میں بچوں کی موجودہ قوتوں اور ضرورتوں کو نظر انداز کر کے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ بچہ جلد سے جلد اس " بے کار " زمانے سے گذر کر سن شعور کو پہنچ جائے - گویا سن شعور کوئی طلسمات کا دروازہ ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی ناتجربہ کار یا خام کار افراد پر زندگی کے تمام حقائق منکشف ہو جاتے ہیں ! یورپ میں یہ خیال صدیوں کار فرما رہا - روسو (Rousseau) کے زمانے میں فرانسیسی سوسائٹی میں اس نظریہ تعلیم کا دور دورہ تھا - بچپن کی اہمیت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا - گھر پر والدین اور مدرسے میں استادوں کی یہی کوشش رہتی تھی کہ جلد سے جلد نو عمر بچوں کو " سوسائٹی " میں شریک ہونے کے قابل بنا دیا جائے - اُن کی دماغی نشو و نما سے قطع نظر کر کے اُنہیں گفت و شنید ، نشست و برخواست کے وہ آداب سکھا دئے جائیں جن سے یہ دیکھنے میں قبل از وقت بالغ معلوم ہوں - اس حماقت اور کوتہہ اندیشی سے نہ معلوم بچوں کی کتنی نسلوں کو نہایت سخت جسمانی اور دماغی نقصان پہنچا - روسو (Rousseau) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف " امیل " (Emile) میں اس خیال کے خلاف بہت قابلیت اور زور کے ساتھ جہاد کیا اور اس خلاف فطرت تعلیم کی بنیادیں ہلا دیں- یہی وجہہ ہے کہ یہ باتفاق رائے تعلیم جدید کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا پیغمبر مانا جاتا ہے ، حالانکہ اُس کے پیش کردہ نظام تعلیم میں جزئیات اور تفصیلات کے اعتبار سے بے شمار غلطیاں بھری پڑی ہیں - اُس کی حقیقی عظمت کا

راز یہی ہے کہ اُس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو سمجھ لیا کہ خواہ تعلیم کا منتہا کچھ ہو اُس کا نقطہ آغاز بچے کی ذات ہے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رحجانات کا احترام اور اُن کی ہدایت معلم کا اولین فرض ہے - ہمارے ملک میں اب بھی یہ خیال عام طور پر رائج ہے اور استاد اور والدین سب کی یہی خواہش ہے کہ کسی طرح بچہ بہت جلد ''بڑھ جائے'' یعنی تعلیم کے مرئی اثرات جلد از جلد ظاہر ہونے لگیں - اس کے دماغ میں ہر قسم کی خشک غیر ضروری اور دوراز کار معلومات بھر دی جائیں ' اور وہ کسی دفتر میں یا کسی اور ملازمت میں کام کرنے لگے - اس سے بحث نہیں کہ اس کی دماغی ارتقا کس حد تک ہوئی ہے اور اُس کا کیا تقاضا ہے - اُنہیں تو یہ آرزو ہے کہ اپنے محبوب مقاصد کی تکمیل اور اپنے عزیز خوابوں کی تعبیر دیکھیں - بچے کی نشو و نما اور اُس کی نفسی زندگی سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں - کوئی چاہتا ہے کہ بچہ جلد سے جلد ایک خاص پیشہ سیکھ لے ' خواہ طبیعت اور میلان فطری کے لحاظ سے وہ اُس کے لئے موزوں ہو یا نہ ہو - کسی کو خواہش ہے کہ اُس کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے خواہ فطرت نے اُسے اُن تمام دماغی اوصاف سے محروم رکھا ہو جن کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا محض تضیع اوقات ہے - بعض کی نیت یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح بچے کو چھوٹی سی عمر میں علوم دین کا عالم بنا دیں چنانچہ (اگر اُن میں سوچنے اور اظہار رائے کرنے کا مادہ ہے) تو وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق مدرسے کے نصاب میں ترمیم اور تبدیلی چاہتے ہیں - بعض علوم و ادب کو غیر ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ براہ راست پیشہ کی تعلیم میں کام نہیں آتے - بعض عملی تعلیم کی تمام تحریکوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کیونکہ وہ ان کی رائے عالی میں اعلیٰ تعلیم کے منافی ہیں -

بعض اس بات پر مصر ہیں کہ بچوں کو ابتدا سے مذہبی مسائل اور علوم اور مذہبی زبانوں یعني عربی اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم دی جائے خواہ بچہ اپنی مادری زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہ ہو اور ان علوم کی اہمیت اور مفہوم سمجھنے سے بالکل قاصر ہو - اُس تمام غلط مبحث کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیات اطفال اور فن تعلیم کے صریحی قوانین کے برخلاف ' طلبہ کو کسي خاص مقصد بعید کے لئے تیار کرنے کے خبط میں لوگوں نے نصاب کو بجائے تعلیمي ضروریات کے مطابق مرتب کرنے کے مختلف لوگوں کے درمیان ایک گیند بنا دیا ہے جو کبھي ایک طرف اُچھالا جاتا ہے کبھی دوسری طرف - کوئی مضمون دماغ کی تربیت اور " اس میں تیزي " پیدا کرنے کے خیال سے شامل کیا جاتا ہے - کوئی برکت کی خاطر ' کوئی مفید ہونے کی بنا پر - نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں کا نصاب ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے جس سے کوئی ایک مقصد بھی کامیابی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا - وہ نہ افادی ہے ' نہ تہذیبی ' نہ مذہبی !

ڈیوئي کا نظریہ تعلیم

بہر حال یہاں ہماری غرض نصاب کی بحث میں پڑنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اگر ہم تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے میں بچے کی اپني ذات اور اس کی فطرت کے مقتضا کو نظر انداز کریں تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں جا بجا اس خیال پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو در اصل نشو و نما کے مرادف سمجھنا چاھئے - اس کو کسی دوسرے بیروني مقصد کے تابع کر دینے سے اس کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے - وہ نہ کسی مستقبل بعید کے لئے تیاري کا نام ہے ' نہ دماغ کی چند مخصوص قوتوں کو تیز

اور مرتب کرنے کا - ڈیوئی (Dewey) کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علحدہ منزل مقصود نہیں - وہ خود ھی راہ ھے اور خود ھی منزل ' آپ ھی مقصد اور آپ ھی مقصود - بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ھونا چاھئے کہ اس کے ذریعے سے انسان میں علمی ' اخلاقی ' معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ھوتی جائے اور اس کی مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رھے - ایک واقعی تعلیم یافتہ اور جاھل آدمی میں اصلی فرق یہ نہیں کہ ان میں سے ایک کو بہت سی باتیں معلوم ھیں اور دوسرے کو نہیں معلوم - ایک کو بہت سے کام آتے ھیں دوسرے کو نہیں آتے - بلکہ اصلی فرق یہ ھے کہ پہلے میں سیکھتے رھنے کی غیر محدود صلاحیت ھے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں - پہلے کی تعلیم ھمیشہ جاری رھتی ھے کبھی ختم نہیں ھوتي ' دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ھوئي تھي تو اب بند ھے - اسی بنا بر اسلام کے معلم اعظم نے فرمایا ھے کہ گہوارہ سے لے کر قبر کی منزل تک تمام عمر تحصیل علم کرتے رھو - حیات بخش صرف وھی علم ھو سکتا ھے جو ھمیشہ بڑھتا رھے ' ھمیشہ متحرک رھے - جب علم میں یا تعلیم میں جمود پیدا ھو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی مدت ختم ھو جاتی ھے اگر ھم تعلیم کے اس حر کی [۱] نظریہ کو قبول کریں تو اس سے یہ بات بھی لازم آتی ھے کہ شیر خوارگي کے زمانے سے لے کر سن شعور تک زندگی کی ھر منزل کے لئے اس کی ضروریات کے مطابق تعلیم کا نظام مرتب کریں اور ھمیشہ یہ بات پیش نظر رکھیں کہ عمر کے قدرتی رحجانات کیا ھیں جن سے کام لے کر ھم طلبہ کی فطری قوتوں کو اپنا معین و مددگار بنا سکتے ھیں اور ان کو تعلیم کا وسیلہ قرار دے سکتے ھیں - تعلیم کو محض تیاری کا ذریعہ

Dynamic [۱]

سمجھنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ ہم ان فطری قوتوں کی طرف سے بےپروائی برتنے لگتے ہیں جو بچوں کے لئے متحرک عمل ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر وہ ہر کام کو استقلال اور جوش کے ساتھ انجام دیتے ہیں - بچوں کی نفسی زندگی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حال کا زمانہ ان کی تمام دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے - وہ اپنے ذہن میں مستقبل کی تصویر صاف طور پر نہیں کھینچ سکتے - ان کے نزدیک مستقبل کا زمانہ ایک مبہم اور غیر یقینی چیز ہے جس میں اتنی کشش اور زور نہیں کہ وہ ان کی موجودہ دلچسپیوں پر غالب آسکے - اس لئے بچوں کی فوری ضروریات اور ان کی موجودہ نشو و نما کے اقتضا سے قطع نظر کر کے ہر قدم پر مستقبل کی امیدوں اور فرائض کا واسطہ دینے سے تعلیم میں جان باقی نہیں رہتی - وہ محض رسمی مشقوں اور سبقوں کے پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے - بچوں کی سمجھ میں کوئی معقول وجہ نہیں آتی کہ وہ کیوں اپنے گرد و پیش کی ہنگامہ آفریں زندگی کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ کو مدرسے کے کاموں پر مبذول کریں - ان کی توجہ میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے - وہ اپنی تمام دماغی قوتوں کو درسی مشاغل پر مجتمع نہیں کر سکتے جو ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت دونوں کے لئے مضر ہے - یہی وجہہ ہے کہ جو تعلیم طلبہ تمدنی زندگی میں براہ راست شریک ہو کر حاصل کرتے ہیں اس کا اثر ان پر زیادہ دیرپا ہوتا ہے خواہ اس میں بالقصد تعلیم مد نظر نہ ہو - مثلاً جب گاؤں میں کوئی بچہ اپنے باپ کے کھیت پر کام کرتا ہے اور کام ہوتے دیکھتا ہے ، آدمیوں ، جانوروں ، زمین ، پانی ، بارش ، کا تجربہ حاصل کرتا ہے تو اس تمام واقفیت کا نقش اس کے دل و دماغ پر بہت گہرا ہوتا ہے بمقابلہ اس اثر کے جو مدرسہ کی تعلیم کا پڑتا ہے - وجہ یہ ہے کہ وہ کام اس کی بعض بنیادی جبلتوں

مثلاً جسمانی نقل حرکت یا دستکاری ، یا تعمیر کو ابھارتا ھے - اور اُس کی محرک اُس کی موجودہ قوتیں اور ھیجانات ھوتے ھیں - بر خلاف اس کے مدرسہ کا کام سطحی اور مصنوعی معلوم ھوتا ھے جو اس کے زیادہ دلچسپ مشاغل کے راستے میں حائل ھوتا ھے - اس مشاھدہ سے ھم یہ نتیجہ نکال سکتے ھیں کہ انسانی زندگی بجائے خود بہترین اور موثر ترین معلم ھے اور تعلیم اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب ھو سکتی ھے جب وہ بھی انھیں محرکات عمل کو کام میں لائے جو تمدنی زندگی میں کار فرما ھیں -

اس کے علاوہ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس نظریہ تعلیم کی ایک اور خرابی بتائی ھے اور وہ یہ ھے کہ جب طلبہ کی موجودہ دلچسپیوں کے لئے مدرسے کے مشاغل میں کوئی سامان نہیں ھوتا تو ان کی توجہ کو جذب کرنے کے لئے ھمیں خارجی ذرائع سے امداد لینی پڑتی ھے - کبھی انھیں سزا کا خوف دلایا جاتا ھے کبھی انعام کا لالچ دیا جاتا ھے - اگر ھم کسی کام میں بالکل محو اور مشغول ھو جاتے ھیں تو اس کام کی فطری کشش ھمیں تمام مشکلات اور ترغیبات سے نکال لے جاتی ھے - بالغ افراد کے لئے بھی اکثر یہ خیال کافی نہیں ھوتا کہ فلاں کام کو استقلال کے ساتھ کرنے سے کبھی آگے چل کر ھمیں بڑا فائدہ ھوگا - ان میں بھی جوش و انہماک پیدا کرنے کے لئے ضروری ھے کہ وہ محسوس کریں کہ ان کا کام ان کی موجودہ ضروریات کے لئے بھی مفید ھے اور ان کی فطری قوتوں کے اظہار کا ذریعہ ھے - بچوں کے لئے تو اس بات کا احساس اور بھی زیادہ لازم ھے کہ جو کام وہ کر رھے ھیں وہ ان کے لئے با معنی اور اھم ھے یعنی ان کے مشاغل کی نوعیت خود ان کے عمل کی محرک ھونی چاھئے - اور جیسا کہ ھم اوپر بتا

چکے ھیں- یہ صرف اس صورت میں ممکن ھے کہ مدرسے کے مشاغل بچوں کے تمام فطری جذبات اور دلچسپیوں کو ابھاریں اور ان کی تنظیم کریں- گو ان کا آخری مقصد یہی ھو کہ انہیں مفید اور ضروری علوم و فنون کی تعلیم دی جائے' لیکن ان کی فوری غرض یہ ھونی چاھئے کہ بچوں کی روز مرہ کی زندگی اُن کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشگوار' نتیجہ خیز اور بامعنی تجربے سے مالا مال ھو جائے - ورنہ یہی ھوگا کہ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق بعض استاد سزا کے خوف اور آئندہ کی بہتری کے کمزور حربوں کو اِستعمال کرینگے اور بعض یہ کوشش کرینگے کہ غیر دلچسپ مضامین اور سبقوں کو عارضی اور مصنوعی طور پر دلچسپ بنانے کے لئے ایسی تدبیریں اختیار کریں جن کی تعلیمی نقطہ نظر سے کوئی اھمیت نہیں - اُن تدبیروں سے کام لینا گویا کونین کی تلخ گولی شکر میں لپیٹ کر کھلانا ھے مگر یہ یاد رھے کہ اس قسم کی دوا کو جو فی‌نفسہ ناگوار ھو' زبردستی یا بہ‌لطائف‌الحیل کھلا دینے سے جسمانی امراض کا علاج ممکن ھے لیکن دماغی اور اخلاقی نشو و نما ایسی چیز ھے کہ جب تک اس میں خود متعلم اپنے ارادے اور خواھش سے شریک نہ ھو خاطر خواہ نتائج بر آمد نہیں ھو سکتے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) فرماتے ھیں کہ :—

'' سوال یہ نہیں ھے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے یا نہیں - اگر تعلیم کے معنی نشو و نما کے ھیں تو لازم ھے کہ وہ موجودہ امکانات کو بتدریج قوت سے فعل میں لائے اور اِس طرح افراد میں آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اھلیت پیدا کرے - نشو و نما کوئی ایسی چیز نہیں جو یونہیں کبھی کبھی واقع ھو جایا کرے - وہ تو برابر رفتہ رفتہ موجودہ کیفیت سے مستقبل کی طرف

۷

بڑھنے کا نام ہے - اگر مدرسہ کا ماحول اور خارجی حالات
ایسے ہیں جن میں بچوں کی موجودہ صلاحیتوں کو
مناسب طریقہ پر کام میں لایا جا سکتا ہے تو مستقبل
جو حال ہی میں سے پیدا ہوتا ہے خود بخود بہتر اور
خاطر خواہ صورت اختیار کر لے گا - غلطی یہ نہیں کہ
بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کرنے پر زور دیا جائے بلکہ
یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور جد و جہد کا
مرکز اور مدار قرار دیا جائے - چونکہ واقعتاً یہ بات بہت
اہم ہے کہ نو عمر طلبہ کو اس زمانے کی زندگی کے لئے
جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار کیا جائے اس لئے
لازم ہے کہ اُن کے موجودہ تجربات کو معنی خیز اور گوناگوں
بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے - جب غیر
محسوس طریقہ پر حال مستقبل میں تبدیل ہو جائے گا
تو ہم دیکھینگے کہ حال کی فکر کرنے میں مستقبل کی
فکر خود بخود ہو گئی ہے " [۱] -

اگر تعلیم کا مقصد محض یہی نہیں کہ بچوں کو کسی آنے والی
زندگی کے لئے تیار کرے بلکہ اُن کی موجودہ زندگی کو تجربات سے مالا مال
کرنا اور خوشگوار بنانا ہے توسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسہ کی تنظیم کس طرح
کی جائے ؟ ظاہر ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس تو یہ مقصد پورا نہیں کر سکتے
کیونکہ اُن کی توجہ تمام تر چند مقررہ مضامین کے پڑھانے میں صرف ہوتی
ہے جو نصاب کا جزو ہیں - یہ مدرسے مناسب حالات میں زندگی کی تفسیر
کرنے میں مدد ضرور دیتے ہیں لیکن زندگی کے قائم مقام نہیں بن سکتے -

---

[۱] Democracy and Education صفحہ ۶۵ -

اُوپر کی تمام بحث سے جو تعلیم اور تمدن کے تعلق کو واضح کرتی ہے صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی ماحول کی تنظیم اِس طرح کرنی چاہیے کہ اِس میں معاشرے کی زندگی کا ایک نمونہ بنایا جائے - مدرسہ کو بقول پروفیسر ہاورتھ (Howerth) کے بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہونا چاہیے جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں - یہی بات در اصل مدرسہ کی دنیا اور بیرونی دنیا میں مابہ‌الامتیاز ہونی چاہیے - اُن دونوں کا اصل فرق یہ نہیں کہ دنیا میں اِنسان زندگی بسر کرتے ہیں ' کام کرتے ہیں ' تعاون اور تعامل برتتے ہیں ' عمرانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں اور مدرسے میں بچے پڑھتے ہیں ' سبق یاد کرتے ہیں ' کتابوں کے ساتھ مغز مارتے ہیں گویا یہ کہنا چاہیے کہ زندگی کو ایک دھندلے سے آئینہ میں دیکھتے ہیں - زندگی کی روح تو دونوں میں یکساں ہونی چاہیے لیکن مدرسہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انتخاب و تنظیم کا زیادہ عمدہ موقع حاصل ہے - بیرونی دنیا میں ہم آسانی کے ساتھ مختلف قسم کے اثرات میں تمیز اور انتخاب نہیں کر سکتے - اس میں بری ' بھلی نیک اور بد ' نشو و نما میں مدد دینے والی اور رکاوٹ پیدا کرنے والی ' غرض سب طرح کی قوتیں اور اثرات موجود ہوتے ہیں - نو عمر اور ناتجربہ کار بچوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بغیر بیرونی امداد اور رہنمائی کے اُس کے عمدہ اثرات سے فائدہ اُٹھائیں اور برے اثرات سے محفوظ رہیں - علاوہ اُس کے دنیا میں اتنے مختلف قسم کے ادارے ہیں اور اُن میں باہمی کشمکش اور جد و جہد کی وجہ سے اس قدر پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں کہ نو عمر طلبہ بغیر رہنما کے اس بھول بھلیاں میں نہیں چھوڑے جا سکتے - اُن کو تنہا اس ہنگامے میں دھکیل دینا

ایسا ھے جیسا کسي شیر خواہ بچے کو مثلاً کسي بہت بڑے مشینوں کے کارخانے میں چھوڑ دینا جس کا ایک کل یا پرزہ بھی اس کي سمجھہ میں نہیں آ سکتا - اس لئے سوسائٹي نے بچوں کي تعلیم کے لئے خاص قسم کے تعلیمي ادارے قائم کر دئے ھیں - تاکہ اُن کي اثر پذیر شخصیتیں ایسے ماحول میں نشو و نما پائیں جہاں وہ اثرات نہ ھوں جو انساني شخصیت کي نشو و نما میں حائل ھوتے ھیں - بلکہ وہ تمام محرکات اور اسباب مہیا کئے جائیں جو اُس کي تربیت میں مدد دیں -

اب ھم یہ دیکھنا چاھتے ھیں کہ اِس خاص طرز پر ڈھالے ھوئے ماحول کي کیا خصوصیتیں ھیں جو اُس کو اور ھر قسم کے عمراني ماحول سے ممتاز کرتی ھیں - ایک خصوصیت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ھے اور وہ یہ ھے کہ اس ماحول کو بیرونی دنیا کي نسبت زیادہ سادہ اور واضح ھونا چاھیے تاکہ اُس کا نظم و نسق اور اصول عمل بچے کی سمجھہ میں آسانی سے آ جائے - موجودہ متمدن سوسائٹی کا نظام اس قدر وسیع اور پیچیدہ ھے کہ بچہ اُس کو بلا واسطہ تمام و کمال کیا جزوی طور پر بھی نہیں سمجھہ سکتا - اِس لئے مدرسہ اس نظام میں سے اُن اجزا اور عناصر کا انتخاب کرتا ھے جو تربیت کے لئے خاص طور پر اھمیت رکھتے ھیں اور بچوں کی زندگی کے ساتھہ ھم آھنگ ھو سکتے ھیں اور اُن کو ایسی ترتیب سے پیش کرتا ھے کہ جو چیزیں بچہ اچھے شرق سے سیکھتا اور کرتا ھے اُنھیں کے ذریعہ اُس پر علم اور واقفیت کے نئے دروازے کھل جاتے ھیں اور وہ رفتہ رفتہ اِنسانی مشاغل میں سمجھہ بوجھہ کر شرکت کرنے لگتا ھے - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل کی تشکیل میں معلم کو ھمیشہ یہی خیال رکھنا چاھیے کہ وہ تمدنی زندگی کے اھم ترین عناصر کو سادہ اور دلچسپ شکل میں

مدرسے کی زندگی کا جزو بنا دے اور اُن کي ترتیب اس طرح کرے کہ جوں جوں بچوں کي عمر اور تجربے میں ترقی ہو وہ رفتہ رفتہ تمدنی زندگی کے زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل سے روشناس ہوتا جائے - جہاں تک خود بچوں کا تعلق ہے اُنہیں ہمیشہ یہی محسوس ہونا چاہیے کہ وہ ایسے مشاغل میں شریک ہیں جو اُن کے لئے دلچسپ ہیں ' جن میں اُن کي قوتوں کا اظہار ہوتا ہے ' جن سے اُنہیں مسرت حاصل ہوتی ہے - البتہ معلم اور والدین جو اُن مشاغل کے نتائج کو سمجھ سکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آگے چل کر اُن کی تکمیل کس شکل میں ہوگی وہ بچوں کے طفلانہ کھیلوں اور اُن کے پڑھنے لکھنے میں ان مہتم بالشان مقاصد کی جھلک دیکھہ سکتے ہیں جن کا حاصل کرنا مدرسے کا انتہائی فرض ہے۔

مدرسے کے ماحول کی دوسري خصوصیت یہ ہے کہ اُسے اُن اثرات سے پاک ہونا چاہیے جو طلبہ کی دماغی نشو و نما اور اُن کی معاشرتی عادات پر برا اثر ڈالیں - معاشرے کے ارباب فکر اور ارباب عمل خصوصاً معلموں اور ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ عہد حاضرہ کے تمدنی ورثے میں سے ان چیزوں کا انتخاب کریں جو نئي نسل کی تربیت اور معاشرے کی آئندہ ترقی کے لئے مفید ہیں اور پھر ان چیزوں کو بہ اسلوب مناسب مدرسے کے نصاب میں داخل کریں - اس زمانے میں یہ انتخاب خاص طور پر ضروري ہوگیا ہے کیونکہ ہر شعبہ زندگی میں اس قدر تیزی کے ساتھ ترقی اور توسیع ہو رہی ہے اور علوم و فنون کی دنیا اس قدر پھیلتی چلی جاتی ہے کہ تمام چیزوں کا علم حاصل کرنا کسی شخص کے لئے ممکن نہیں - ایک زمانہ ایسا تھا جب لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے جملہ علوم دفنون پر عبور حاصل کریں - مشرق اور مغرب دونوں کی تعلیمی تاریخ میں ایسے دور گزرے ہیں کہ اعلیٰ درسگاہوں میں

لوگ طب ، فلسفہ ادب ، منطق ، ریاضی وغیرہ جملہ علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اب بھی ایک حدتک ہندؤں اور مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر قائم ہے اگر چہ اب رفتار زمانہ نے اس کی ظاہری حیثیت میں تبدیلیاں کردی ہیں - یورپ میں بھی قرون وسطیٰ میں ، بالخصوص کومینیس (Comenius) کے زمانے تک اس قسم کی ہمہ دانی پر مبنی تعلیم مرتب کرنے کا شوق ماہرین تعلیم میں عام تھا - اس وقت اگر ایک حدتک یہ خیال قابل عمل تھا بھی ، تو ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہم اس کو قابل غور بھی نہیں سمجھ سکتے - کیونکہ یہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ممکن بھی ہوتا تو مفید نہیں ہوسکتا تھا - اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ وقتاً فوقتاً بہت احتیاط اور وسعت نظر کے ساتھ مدرسے کے نصاب کی چھان بین اور پڑتال کی جائے - یعنی بالفاظ دیگر معاشرے کے مشاغل اور ضروریات کا جائزہ لیا جائے کیونکہ دراصل یہی نصاب کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں - چونکہ یہ ضروریات اور مشاغل بدلتے رہتے ہیں اس لئے نصاب میں بھی ترمیم اور تبدیل کی ضرورت ہوتی رہتی ہے - اگر اس کی طرف سے غفلت برتی جائیگی تو مدرسے کے نصاب میں ہر قسم کی رطب و یابس چیزیں بھر جائینگی - بہت سی چیزیں جن کی اہمیت عارضی ہے یا کم ہے یا بالکل نہیں وہ نصاب کا جزوبن جائینگی اور بہت سی ضروری چیزیں نا واقفیت کی وجہ سے یا اس اندیشہ سے چھوٹ جائینگی کہ نصاب میں بہت زیادہ مضامین کا ہجوم نہ ہوجائے - اس میں بہت سے دورازکار مضامین جو ماضی کی یاد گار ہیں اور حال کی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں محض قدامت پرستی کی وجہ سے باقی رہ جائینگے ، بعض مضامین انفرادی ذوق کی وجہ سے داخل ہوجائینگے اور نصاب کے مسئلے پر جو ایک طرف تمدنی

زندگی کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسری طرف بچوں کی نفسی زندگی سے ' کماحقہ غور نہ ہوسکے گا -

ہم آئندہ کسی باب میں نصاب کے مسئلے پر بحث کرینگے اور بتائینگے کہ ہمیں نہ صرف درسی نصاب کے مضامین میں ترمیم اور انتخاب کی ضرورت ہے بلکہ موجودہ اصول انتخاب کو صحیح راستہ پر لانا ہے ہمارا مقصد مدرسے کی تعلیم سے یہ بھی نہیں کہ مفید تریں علوم وفنون کی تمام ضروری ضروری ابتدائی باتیں بچہ کو سکھا دی جائیں کیونکہ ان کا دائرہ بھی بہت بڑا ہے اور ایک محدود مدت میں کسی اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ادب ' سائنس ' علم معاشرت اور آرٹ کی مبادیات پر بھی عبور حاصل کرسکے - ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس میں اس امر کی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ مدرسے کی ذہنی تربیت کی مدد سے اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق آئندہ چل کر جس علم یا هنر کو ضروری سمجھے اسے حاصل کرسکے- یعنی اسے علوم پر نہیں بلکہ تحصیل علم وفن کے ذرائع اور وسائل پر قابو حاصل ہوجائے - ہم یہ توقع نہیں کرسکتے کہ مدرسے کی مختصر زندگی کے دوران میں طالب علم اس ساری زمین کو کھود کر کاشت کرے جو اس کو زندگی بھر میں درکار ہوگی - لیکن ہم مدرسے کی تعلیم کی بدولت اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت ' اس کے دماغ میں بیداری ' حوصلہ اور جوش ' اس کے دل میں ولولہ عمل پیدا کردیں اور اس کے هاتھ میں ایسے اوزار دیدیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسی بیرونی جبر یا تحریصی یا نگرانی کے جس زمین کو چاہے کھود کر کاشت کرے اور اسے لہلہاتا ہوا کھیت یا ہرا بھرا چمن بنادے - یہ ہے تعلیمی ماحول کی دوسری خصوصیت کہ وہ تمدن حاضرہ کے بے شمار

مظاہر میں سے بہترین اور مفید ترین کو چن کر انہیں نو عمر بچوں کے گرد اس طرح ترتیب دے کہ وہ ان میں منہمک ہوکر اپنے اندر اس تمدن کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت پیدا کریں -

تعلیمی ماحول کی تیسری خصوصیت پروفیسر ڈیوئی (Dewey) یہ بیان کرتے ہیں [۱] کہ وہ تمدنی ماحول کے مختلف عناصر میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتا ہے - اکثر بچوں کا گھر اور پڑوس کا ماحول بہت تنگ اور محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی گنجائش اور امکانات نہیں ہوتے کہ وہ ان کی مجموعی اور مکمل تربیت کرسکے - مثلاً ایک بچہ کسی صناع یا مزدور کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے گرد وپیش کے تمام حالات اس کو مزدوری یا صنعت و حرفت کی طرف رغبت دلاتے ہیں - اسی قسم کے خیالات ، جذبات اور دلچسپیاں اس میں پیدا کرتے ہیں - اس طرح اگر کوئی بچہ کسی دولت مند گھرانے میں پیدا ہوتا ہے جس کے افراد کوئی خاص کام نہیں کرتے تو وہ صنعت اور محنت کے سارے نظام سے ناواقف رہتا ہے اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ

زمزدبندہ کر پاس بوش و محنت کش

نصیب خواجہ ناکردہ کار رخت حریر

اگر کوئی بچہ گاؤں میں کسی کاشتکار کے یہاں پیدا ہوتا ہے تو وہ اکثر صورتوں میں نہ صرف موجودہ صنعت و حرفت کے نظام اور شہری زندگی سے بے خبر ہوتا ہے بلکہ ان تمام تہذیبی مشاغل سے بھی نا بلد رہتا ہے جن میں فرصت کا وقت خوش دلی اور عمدگی سے بسر ہوسکتا ہے - غرض خواہ بچہ معاشرے کے کسی طبقہ میں پیدا ہو وہ اپنے محدود ماحول میں مقید ہوتا ہے اور آسانی

---

[۱] Democracy and Education باب اول صفحہ ۲۳ ـ ۲۶

سے اس سے باہر نہیں نکل سکتا - صرف مدرسہ ھی ایک ایسا منظم
اور گوناگوں ماحول ہے جہاں خاص طور پر اس بات کا التزام ہوتا
ھے یا ھو سکتا ہے کہ بچے کی نشو و نما کے لئے ایک مناسب
فضا پیدا کی جائے جس میں وہ مختلف قسم کے دماغی اور جسمانی
مشاغل میں شریک ھو سکے اور مکمل اور ھم آھنگ تربیت پا سکے
اور ساتھہ ھی وہ ان مشاغل کے دوران میں اپنی مخصوص صلاحیتوں
اور رجحانات کا پتہ چلا سکے - مدرسے کو اس کے لئے ایک آزاد ماحول
ہونا چاھیئے جہاں وہ ادنی تعلیم کے زمانے میں بغیر بے جا روک
توک کے مختلف قسم کے تجربے کر سکے اور زندگی کی مختلف راھوں
سے واقفیت حاصل کرے - مدرسے سے باھر دنیا میں مختلف قسم کے
ادارے ھیں جو نو عمر طلبہ کو اپنی طرف کھینچتے ھیں - ھر فرد
صرف ایک ھی جماعت کا رکن نہیں ھوتا بلکہ بہت سی جماعتوں
میں شریک ھوتا ہے اور ان میں سے ھر جماعت کی رکنیت سے اس
کی طبیعت اور مشاغل اور دلچسپیوں پر اثر پڑتا ھے جیسا کہ
ھم اس سے اگلے باب میں وضاحت کے ساتھ بتائیں گے - ھر معاشرتی
ادارہ خواہ اس کا تعلق اقتصادی مسائل سے ھو ' یا سیاسی مسائل
سے ' یا وہ خلاف قانون اور مخرب اخلاق اعراض کی تکمیل کے لئے
قائم کیا گیا ھو ' اپنے اراکین کی تربیت میں دخیل ھوتا ہے اور
وہ افراد جو اس میں شریک ھوتے ھیں اس کے مطالبات کو پورا
کرنے میں نئے تجربات سے متاثر ھوتے ھیں - اس کشمکش کی زندگی
میں جہاں ھر فرد پر مختلف اور متضاد قوتوں کے اثرات کام
کرتے رھتے ھیں بچوں کے لئے مدرسہ نہ صرف ایک تربیت گاہ ھے
بلکہ جائے امن ھے - یہاں بغیر اس کی شعوری واقفیت کے اس کے

نفس میں ان اخلاقی قدروں اور معیاروں کا نظام مرتب ہوتا ہے جو
تمام عمر اس کی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں - اگر معاشرہ اس
قسم کا کوئی مرکزی ادارہ قائم نہ کرے تو نو عمر نسلوں کی تربیت
بہت ناقص ، نا مکمل اور یک طرفہ ہو اور ان کی طبیعتوں میں
بھی وہ توازن اور انصاف پسندی پیدا نہ ہو سکے جو حقیقی تہذیب
کی بنیاد ہیں اور جن کی بدولت انسان نظری تحقیق اور عملی
زندگی میں متانت اور سلامت روی سے کام لیتا ہے اور ہر بات کے
کل پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کرتا ہے - اس زمانے میں جب
ہمارے ملک میں باہمی اختلافات بے حد بڑھ چکے ہیں اور بڑھتے
جاتے ہیں بلکہ اختلافات کی حد سے گذر کر مناقشات کی شکل
اختیار کرتے جاتے ہیں اور معاشرہ بے شمار جماعتوں میں تقسیم
ہوتا چلا جا رہا ہے جن میں اعراض و مقاصد ، رسوم و روایات کا
فرق ہے ، ایک ایسے تعلیمی نظام کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی
ہے جو قوم کے تمام بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک سا ماحول مہیا
کرے اور مناسب حد تک ان میں یکسانی پیدا کرے - جب کسی
مدرسے میں بہت سے بچے جن کا تعلق مختلف معاشرتی طبقوں ،
مذہبوں اور جماعتوں سے ہوتا ہے ساتھ پڑھتے ہیں ، کھیلتے ہیں ،
مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں تو ان کے لئے مدرسہ ان کے
گھروں سے زیادہ وسیع اور موثر ماحول بن جاتا ہے جہاں ایک
ہی قسم کے مشاغل میں مصروف رہ کر ان میں اتحاد خیال اور
ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ملک کے باشندوں اور ایک
قوم کے افراد کے لئے لازم ہے - " مدرسے کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ
ہر فرد کی طبیعت میں ان تمام اثرات کی ہم آہنگ تنظیم کرے

جو مختلف معاشرتی اداروں میں شرکت کرنے سے حاصل ہوتے ہیں - گھر کی زندگی میں ایک ضابطہ اخلاق کی کارفرمائی ہوتی ہے ' اور گلی اور بازار میں دوسرے کی ' دوکانوں کارخانوں میں تیسرے کی ' مذہبی تعلقات میں چوتھے کی - جب ایک ہی آدمی ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو اس پر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی قوتیں عمل کرتی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت پر ایسا اثر پڑے کہ وہ مختلف موقعوں پر عمل و جذبات کے مختلف مقتضا اور معیار کے مطابق کام کرے - اس وجہ سے مدرسے کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت میں استقلال اور وحدت کا رنگ پیدا کرے " - [١]

اگر مدرسے میں تربیت کا انتظام اچھا ہے تو بچے کی زندگی اور کردار کے لئے ایسے اٹل قانون قائم ہو جائیں گے جو اس کو آئندہ زندگی میں سیدھے راستے پر چلاتے ہیں اور ایسے وقت میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں جب مختلف قسم کی ترغیبیں اور ماحول کے اثرات ان کو مختلف سمتوں میں کھینچتے ہیں اور عقل جوانی کی اندھیری رات میں راستہ ٹٹولتی ہوئی بھٹکتی پھرتی ہے -

---

[١] Democracy and Education صفحہ ٢٦

باب دوم

تعلیم اور تمدنی ادارے

ہم نے گزشتہ باب میں ' مختصر اور عام الفاظ میں تعلیم اور تمدن کا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ تمدنی زندگی کا سلسلہ نسلاً بعد نسل اس طرح قائم رہتا ہے کہ مختلف ذرائع اور وسائل سے ہر نسل اپنے تمدنی ورثے کو جس میں وہ خود اپنی جد و جہد سے اضافہ کرتی ہے اپنے بعد آنے والی نسل کی طرف منتقل کردیتی ہے- جب یہ عمل انتقال دوفریقوں کے درمیان واقع ہو جن میں سے ایک پختہ کار اور سن رسیدہ ہے اور دوسرا ناتجربہ کار اور نو عمر تو ہم اسے اصطلاحاً تعلیم و تربیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں - یہ تعلیم و تربیت جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں معاشرہ براہ راست بھی کرتا رہتا ہے اور بہت سی مفید اور ضروری باتیں جو بچے سیکھتے ہیں وہ زیادہ تر معاشرے کے بلا واسطہ اثر سے سیکھتے ہیں یعنی بچے ان مشاغل میں جو ان کے گرد و پیش ہوتے رہتے ہیں شرکت کرتے ہیں اور عملی تجربے کی بدولت اپنی واقفیت اور کار کردگی میں اضافہ کرتے ہیں - لیکن معاشرے کی موجودہ حالت میں تمدنی ترقی کی وجہ سے ہم اس بلا واسطہ تعلیم پر اکتفا نہیں کرسکتے کیونکہ یہ تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہوتی - اور اس میں وہ نظم و تربیت نہیں پائی جاتی جو ایک مخصوص تعلیمی ماحول میں ہونا چاہئے جہاں ہر کام اس مقصد سے داخل کیا جائے کہ اس کے ذریعے بچوں کی مکمل تربیت اور نشو ونما ان کی نفسی زندگی کے قوانین کے مطابق ہوسکے - لہذا با قاعدہ مدرسوں کی ضرورت محسوس

ہوئی اور تعلیمی ادارے قائم کئے گئے جن کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر ہم کر چکے ہیں -

اس تمام بحث میں ہم نے تعلیم کے لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے - ایک تو وہ خاص مفہوم ہے جس سے ہر شخص واقف ہے اور جو " علم " کے لفظ کے ساتھ وابستہ ہے - اس معنی میں مدرسوں میں " تعلیم " دی جاتی ہے یعنی طلبا کو بعض علم و فنون سکھائے جاتے ہیں جو بعد کی زندگی میں ان کے کام آتے ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں - اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے اور اسے لفظ تعلیم کے دوسرے وسیع معنی سے ممیز کرنے کے لئے انگریزی میں (Instruction) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے لغوی معنی " سکھانے " کے ہیں - پروفیسر فنڈلے نے (Findlay) اپنی کتاب " مدرسہ " (The School) میں تعلیم کی یہ تعریف کی ہے :-

" تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے جو نو عمروں کو تمدنی زندگی کا اہل بنانے کے لئے بالارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے "

اس تعریف میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ معاشرے کے بالغ اور ذمہ دار افراد بالارادہ نو عمر بچوں اور نو جوانوں کی تشکیل سیرت میں حصہ لیں اور ان کی نشو ونما پر اثر ڈالیں - اس محدود معنی میں تعلیم کا عمل دو فریقوں سے تعلق رکھتا ہے - ایک طرف والدین اور اساتذہ وغیرہ کی جماعت ہے اور دوسری طرف نو عمر بچے - ان کی باہمی اثر آفرینی اور اثر پذیری تعلیم کہلاتی ہے - تعلیم کا ایک

دوسرا مفہوم زیادہ عام اور وسیع ہے جس کے مطابق انسان کو زندگی اور اس کے تمام مظاہر اور ادراے تعلیم دیتے ہیں - اس کے لئے انگریزی میں (Education) کا لفظ استعمال ہوتا ہے - جس کا ترجمہ " تربیت " کیا جاسکتا ہے - بعض مصنفوں نے " تعلیم " اور " تربیت کے الفاظ کو ان معنوں میں احتیاط کے ساتھ علیحدہ علحدہ استعمال کیا ہے " تعلیم " کو مدرسے کے اندر علوم و فنون سکھانے کے محدود معنی میں اور " تربیت " کو عام ذہنی نشو ونما کے معنی میں - لیکن ہم ان الفاظ کو اس طرح استعمال نہیں کرتے - اول تو اردو میں یہ تفریق رائج نہیں - دوسرے معنوی اور نفسی اعتبار سے بھی یہ مناسب نہیں کہ ان میں ایک حد فاصل قائم کردی جائے کیونکہ در اصل تعلیم و تربیت کے حدود آپس میں ملتے ہیں اور ان میں آسانی سے تمیز نہیں کی جاسکتی - جب ہم کسی بچے کو کوئی نیا علم یافن سکھاتے ہیں مثلاً اس کو پڑھنے یا لکھنے کی تعلیم دیتے ہیں یا ڈرائنگ اور مصوری کا ہنر سکھاتے ہیں تو اس کا اثر محض دماغی تعلیم تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی شخصیت کی عام تربیت اور نشو ونما میں بھی معین ہوتا ہے - اسی طرح جو تربیب ہم عمرانی زندگی میں براہ راست شریک ہوکر حاصل کرتے ہیں وہ ہمارے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور اس کا اثر مدرسہ کی تعلیم پر بھی پڑتا ہے - اس لئے ہم حسب ضرورت کہیں دونوں الفاظ کا استعمال کرینگے اور کہیں صرف ایک کا تاکہ معلوم ہوجائے کہ ہمیں اس عمل کے کسی پہلو پر زور دینا مقصود ہے -

ہماری شعوری کوششوں سے بہت پہلے فطرت نے وسیع معنی میں نسل انسانی کی تعلیم و تربیت کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا - اس

کے تمام مظاہر اور تمام قوتیں ابتدائی زمانے کی انسانی جماعتوں پر مختلف طریقوں سے اپنا اثر ڈالتی تھیں اور ان کے مفید اور مضر اثرات کا تجربہ حاصل کرکے انسان اپنے اعمال و افعال میں حسب ضرورت ترمیم اور تغیر کرتے تھے - اس اثر آفرینی کا ذریعہ قدرتی ضبط اور سزا کا وہی طریقہ تھا جس کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کرچکے ہیں - لیکن جب معاشرتی اور تمدنی ادارے قائم ہوئے اور افراد ان میں شریک ہونے لگے تو تعلیم و تربیت کے نئے ذرائع اور وسائل پیدا ہوگئے - کیونکہ فطرت کی قوتوں کی طرح ' نظام معاشرت کے اثرات نے بھی ان کی طبیعت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا شروع کردیا - حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ جو دو انسانوں میں ہوتا ہے ' ہر تجربہ جو ہم معاشرتی زندگی یا قدرتی مظاہر کے سابقے سے حاصل کرتے ہیں ہمارے خیالات ' ہمارے چال چلن ہماری کار کردگی پر اثر ڈالتا ہے اور ہمارے عام رویہ میں تبدیلی پیدا کرتا ہے - یہ اثر سب لوگوں کے لئے عام ہے خواہ وہ نو عمر ہوں یا سن رسیدہ - اس معنی میں ہم ہر معاملے اور ہر تجربے کو اپنا معلم کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہماری طبیعت اور ہمارے اعمال میں تبدیلی پیدا کرتا ہے - یہ قول غالب

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں !

غرض " تربیت " وہ عمل ہے جس کے ذریعے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ' بلاواسطہ یا بالواسطہ ' افراد (بالخصوص بچوں) کی حرکات اور اعمال کی نگہداشت اور اصلاح کی جاتی ہے - تاکہ ان میں بعض تبدیلیاں جو پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں پیدا کی جائیں - ان تبدیلیوں کو پیدا کرنا اور نو عمروں کی طبیعت کو ان مقاصد اور

اصولوں کے مطابق ڈھالنا جو بحیثیت مجموعی اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے بہترین قرار پائیں معلموں اور تعلیم گاہوں کا فرض منصبی ہے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرض محض تعلیم گاہوں تک محدود نہیں' نہ وہ اس کو بغیر بیرونی امداد کے پورا کرسکتی ہیں - بچے کی طبیعت کی ساخت اور تشکیل میں' اس کی ابتدائی تربیت میں' اس کے شوقوں اور رجحانوں کے ابھارنے اور سدھارنے میں مدرسہ کے علاوہ اور بھی بہت سے تمدنی اداروں کو دخل ہے - ان میں سے بعض کو تمام عمر اور بعض کو زندگی کی مخصوص منازل میں انسان کی ذہنی نشو و نما سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ہوتا ہے - جو شخص مسئلہ تعلیم پر غائر اور وسیع نظر ڈالنا چاہتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ان تمام عناصر اور قوتوں کو خیال میں رکھے جو بچے کی شخصیت کو بناتی یا بگاڑتی ہیں اور مدرسے کے کام میں مدد دیتی ہیں یا اس میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں - تعلیمی مباحث کے لئے یہ وسعت نظر نہایت اہم ہے - کیونکہ اس کے بغیر ہم مدرسہ کو ایک مفید اور موثر ماحول نہیں بنا سکتے - مدرسے کے بے شمار اور گوناگوں مسائل مدرسہ کی چاردیواری ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ تمدنی زندگی کے وسیع اور ہمہ گیر نظام کے مختلف شعبوں میں ان کی ابتدا ہوتی ہے اور وہاں سے ان کا اثر مدرسے کے اندر پہنچتا ہے - مدرسے کا خاص کام یہ ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کرنے میں بچوں کی مخصوص ضرورتوں اور نفسی کیفیتوں کا لحاظ رکھے - مدرسے کے باہر معاشرے کے بالغ افراد بھی ان مسائل سے دو چار ہوتے ہیں - لیکن وہ ان کا حل دوسرے اثرات اور تجربات کی رہنمائی میں تلاش کرتے ہیں - مدرسہ ان سب چیزوں سے مسالے کا کام لیتا ہے اور ان

کی تشکیل ایک مخصوص طرز پر کرتا ہے - اس لئے تمام تمدنی اداروں سے ہر وقت اس کا رابطہ قائم رہتا ہے اور رہنا چاہیئے - اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ مدرسہ محض ایک رسمی درس گاہ بن کر رہ جائے گا جہاں زندگی کے بہترین عناصر کا تجربہ حاصل ہونے کے بجائے محض کتابوں کے سبق پڑھائے جاتے ہیں اور تربیت قدرتی اصولوں کے مطابق نہیں مصنوعی اور دور ازکار طریقوں سے ہوتی ہے - جو استاد یا ماہرین تعلیم مدرسے اور نظام تمدن کا صحیح تعلق نہیں سمجھتے وہ ہمیشہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ مدرسے کے سبقوں اور درسی مشقوں کو مقصود بالذات بنا لیتے ہیں اور اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ ہم بچے کو کوئی چیز کوئی بات ، کوئی کام بلا واسطہ نہیں سکھا سکتے - طبیعت کی تشکیل ہمیشہ ان مشاغل میں شرکت کرنے سے ہوتی ہے جو معاشرے میں رائج ہیں یا مناسب ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ مدرسہ میں رائج کئے جاتے ہیں - مدرسے کو اپنے مخصوص کام میں حقیقی کامیابی صرف اس صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب اس کا طریقہ تعلیم انہیں اصولوں پر مبنی ہو جن پر عمل کرنے سے تمدنی زندگی کا نظم اور ربط قائم ہے - اور وہ انہیں محرکات عمل سے کام لے جو بالغ افراد کی زندگی میں کارفرما ہیں - ورنہ محض کتابی اور لفظی تعلیم کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو طوطوں کو رٹانے کا - یعنی بچوں کی واقفیت سطحی اور اوپری ہوتی ہے اور ان کے اخلاق و عادات محض نقالی بن کر رہ جاتے ہیں - " بچوں کے نفس میں ان عادات اور رجحانات کی تربیت کے لئے جو عمرانی زندگی میں تسلسل اور ترقی کو قائم رکھتے ہیں یہ طریقہ کارگر نہیں

هو سکتا کہ برہ راست رنہیں الفاظ کے ذریعے عقائد ' جذبات اور معلومات کا درس دیا جائے - طبیعت کی مستقل اور ہمہ گیر تشکیل دانشمندی کے ساتھہ اسی وقت ہو سکتی ہے جب نو عمر بچے رفتہ رفتہ ان مختلف عمرانی جماعتوں کے مشاغل میں حصہ لیں جن سے وہ تعلق رکھتے ہیں - [۱]

اس باب میں ہم انہیں عمرانی جماعتوں کے نظام اور تعلیمی اثرات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جن سے بچے کو تعلق ہوتا ہے اور جو اس کی تربیت پر گہرا اور پائدار اثر ڈالتے ہیں - ہم دیکھہ چکے ہیں کہ دو اشخاص یا دو جماعتوں کے باہمی تعلق اور ربط سے ہمیشہ دونوں پر کچھہ نہ کچھہ ' برا یا بھلا ' اثر ضرور پڑتا ہے - یہ تعلقات عمرانی زندگی میں محض اتفاقی اور عارضی نہیں بلکہ اپنی اپنی نوعیت کے مطابق مستقل اداروں (institutions) کی شکل میں منظم ہیں - ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں افراد کا تعلق اور اشتراک عمل بہت گہرا اور قریب کا ہوتا ہے اور وہ براہ راست ایک دوسرے سے مل جل سکتے ہیں - مثلاً خاندان ' کھیل کی تیمیں ' محلے والوں کی جماعت - بعض اداروں میں باہمی تعلقات ایک حد تک بلا واسطہ ہوتے ہیں اور ایک حد تک بالواسطہ - مثلاً مدرسہ یا مذہبی جماعتیں ' یا امداد باہمی کی مختلف قسم کی انجمنیں - ان میں افراد ایک دوسرے سے براہ راست بھی ملتے جلتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں اور بعض اثرات بغیر ذاتی میل جول کے بھی اپنے کام کرتے ہیں - مثلاً مدرسہ ایک لحاظ سے ایک مقامی ادارہ ہے جس میں استاد طلبہ آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ذاتی

---

(۱) Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۶

تعلقات سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے اس کے اثرات غیر شخصی ہوتے ہیں - کتابیں ' تعلیمی آلات اور وسائل ' مدرسے کا عام نظم و نسق ایسی چیزیں ہیں جو تمام تعلیمی اداروں' معلموں اور متعلموں کو ایک سلسے میں منسلک کرتی ہیں - اسی طرح مذہبی اداروں میں جہاں لوگ ایک دوسرے سے یا مذہبی پیشواؤں کی زندگی سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں وہاں ان کے خیالات اور عقائد پر رسوم و عبادات اور روایات کا بھی اثر پڑتا ہے - تیسری شکل ان تمدنی اداروں کی ایسی ہے جن میں افراد میں بلاواسطہ تعلق بہت ہی کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا بلکہ باوجود بعض مقام کے تمام اراکین ایک سلسلہ میں منسلک ہوتے ہیں - مثلاً ریاست کا نظام ' صنعت و حرفت کے کارخانے ' یا علمی تحقیق و تفتیش کرنے والوں کی جماعتیں جن کے ارکان کا ایک دوسرے سے ذاتی طور پر ملنا جلنا ضروری نہیں - وہ اپنے اپنے اداروں کے عام نظم و نسق سے متاثر ہوتے ہیں ' کتابوں ' کانفرنسوں ' رسالوں کی مدد سے ایک دوسرے کے کام سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور گو باہم صورت آشنا تک نہ ہوں مگر حقیقت میں ایک ہی جماعت کے رکن ہوتے ہیں -

مندرجہ بالا تقسیم پروفیسر سمتھ (Smith) نے اپنی کتاب " معاشیات تعلیمی " (Educational Sociology) میں افراد کے باہمی تعلقات کی بنا پر کی ہے - اگر ان اداروں کی تقسیم ان کے مقاصد کے لحاظ سے کی جائے تو ہمیں میکنزی (Mackenzie) کے نقطہ نظر سے مدد ملے گی [۱] اس کے خیال کے مطابق بعض جماعتوں

---

[۱] دیکھو میکینزی : زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamental Problems of life) صفحہ ۱۵۹ -

اور اداروں کا مقصد مذھبي یا تہذیبی ہوتا ھے جن میں بنانے
اشتراک یہ خیال ھوتا ھے کہ وہ اپني تہذیب نفس یا تفریح کے
لئے اجتماعی طور پر اھتمام کریں - اس ذیل میں ھم مذھبي نظاموں '
تعلیمی اداروں ' علمی انجمنوں اور فنون لطیفہ کے مرکزوں کو شمار
کر سکتے ھیں - دوسری قسم ان جماعتوں کی ھے جن کی وجہ قیام
اقتصادی ھے اور مادی کار و بار سے تعلق رکھتی ھے مثلاً مختلف
پیشوں کی برادریاں ' صنعت و حرفت کے کارخانے ' وہ تمام ادارے
جو پیدائش دولت اور تقسیم دولت کا کام انجام دیتے ھیں - اور
بعض اوقات ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور دور رھنے والے لوگوں
کو ایک رشتہ میں منسلک کرتے ھیں - تیسری قسم ان جماعتوں کی
ھے جن کی بنیاد قانونی ھے - ان کی سب سے اھم اور بڑی مثال
ریاست ھے - ان تمام اداروں سے مل کر ھمارا تمدنی ما حول بنا
ھے - بقول پروفیسر ایڈمسن (Adamson) یہ ھماری " دنیائے تمدن " ھے
جو " طبیعی دنیا " اور " اخلاقی دنیا " کے ساتھہ ساتھہ ھماری
زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ھے [۱] - اور ھماری فطرت کے اظہار کے
لئے مواقع اور وسائل بہم پہنچاتی ھے - بچے ' جوان ' بوڑھے سب
اپنی اپنی قابلیت اور حالات کے مطابق ان کے مشاغل میں حصہ
لیتے ھیں اور اپنی قوتوں اور جبلّتوں کا اظہار کرتے ھیں اور اسی
طرح ان کی علمي ' اخلاقي اور تمدنی نشو و نما ھوتي ھے جس کا
تجزیہ اس باب میں صراحت کے ساتھہ کیا جائیگا -

---

[۱] ایڈمسن (Adamson) نے اپنی معرکۃ الارا تصنیف " فرد اور ماحول " (Individual Environment) میں انسانی ماحول کي تقسیم اس عنوان سے کی ھے -

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کے تعلیمی اثرات سے بحث کر سکیں جو بچے کی زندگی کا احاطہ کئے ہوتے ہیں کیوں کیونکہ ان کی تفصیل کے لئے معاشرے کے ہر شغل کا تجزیہ لازم آتا ہے - اس لئے ہم مختصراً صرف ان اداروں کا ذکر کریں گے جو بچے کی زندگی سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں اور مدرسے کے نصاب اور نظام عمل پر اثر ڈالتے ہیں -

پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے اپنی تازہ تصنیف " تعلیم کی بنیادیں " (Foundations of Education) میں ان اداروں کو مندرجہ ذیل نقشے کے ذریعہ ظاہر کیا ہے -
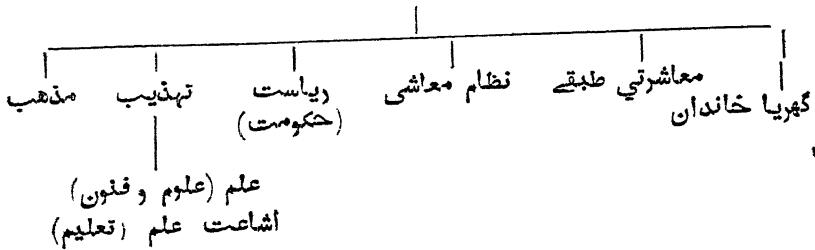
کتاب کے اس حصے میں ہم ان مختلف اداروں کے تعلیمی اثرات اور مطالبات سے بحث کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ دور حاضرہ میں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں جنہوں نے ہمارے نظام تعلیم کو صریحاً متاثر کیا ہے - البتہ تہذیب اور مذہب کے اثرات کی بحث کو کتاب کے آخری حصے کے لئے ملتوی رکھیں گے جس کا تعلق طلبہ کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے مسائل سے ہے -

باب سوم

خانگی اور معاشری زندگی کے اثرات

بچے کی درسگاہ اولین گھر کی زندگی اور خاندان کے افراد کا جو اثر اوائل عمر میں بچے کی شخصیت پر پڑتا ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات ہر شخص کے ذاتی مشاہدہ اور تجربہ میں آتی ہے - پہلے ماں کی گود میں اور اس کے بعد اور گھر والوں کی محبت میں بچہ وہ ابتدائی حرکات اور مشاغل سیکھتا ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں - اور یہی نہیں بلکہ اس کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر ہی میں ہوتی ہے- یہاں وہ سب سے پہلے یہ محسوس کرتا ہے کہ کس طرح متعدد افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر مشترک مقاصد کے لئے کوشاں ہیں، اور جب تک ان میں سے ہر ایک اپنا اپنا کام نہ کرے گھر کا کارخانہ نہیں چل سکتا - باہمی احتیاج اور امداد کا یہ احساس ساری اخلاقی اور تمدنی تربیت کی بنیاد ہے - اس میں شک نہیں کہ جیسا ارسطو نے کہا ہے اور سب تمدنی اداروں کی طرح خاندان کی ابتدائی غرض بھی محض زندگی کو قائم رکھنا ہے - لیکن رفتہ رفتہ اس کے مقاصد میں اچھی طرح زندگی بسر کرنا بھی شامل ہوجاتا ہے - لیکن یہ امر کہ خاندان کا اثر بچے کی طبیعت اور خیالات پر خوشگوار ہوگا یا نہیں خاندان کی پرانی روایات اور اصول اور بزرگوں کے طرز عمل اور مثال پر منحصر ہے - اگر اس کے محدود ماحول میں ایسے مواقع موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھاکر بچے اپنی شخصیت کی تشکیل اور

اپنی جبلتوں کا اظہار کرسکتے ہیں تو اس کا اثر ان کی زندگی پر اچھا پڑتا ہے - برخلاف اس کے اگر خاندانی روایات تنگ نظری پیدا کرکے بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا میدان بہت محدود کردیتی ہیں اور رسم ورواج اور بزرگوں کی سخت گیر طبیعت کے دباؤ سے ان کی شخصیت ابھرنے نہیں پاتی تو اسی کا مجموعی اثر جیسا کہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں بہت خراب ہوتا ہے - کیونکہ جب بچوں کی تربیت کی بنیاد ہی کمزور ہوگئی تو اس پر جو عمارت بنائی جائے وہ کسی طرح مستحکم نہیں ہوسکتی

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج !

بچے کی سیرت کی تشکیل میں گھر کی زندگی کے دواثرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ایک طرف تو وہ بچے کو تمدنی زندگی کے سب سے پہلے اور سادہ ترین نظام سے آشنا کرتی ہے اور اس کے دل میں محبت ہمدردی اور تعاون کا بیج بوتی ہے اور دوسری طرف بچہ کی شخصیت اور انفرادیت کی حفاظت کرتی ہے - ہر ماں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا بچہ دنیا سے نرالا اور سب بچوں سے بڑھکر ہے - وہ اس کی نظر میں غیر معمولی طور پر ذہین اور محبت کرنے والا اور عجیب و غریب صفات کا مالک ہوتا ہے یعنی ماں جو گھر کی سردار اور اس کی روح کا بہترین مظہر ہوتی ہے ہر بچہ کی غیر محدود انفرادی قدر کو تسلیم کرتی ہے - اس کا یہ نقطۂ نظر ' خواہ وہ محبت کی وجہ سے کتناہی مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو ' معلم کے رسمی نقطہ نظر کی نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے - معلم بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ سب بچے ایک لاٹھی سے ہانکے جاسکتے ہیں اور ان سے ایک ہی قسم کے

معیار عمل کی توقع کی جاسکتی ھے کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح محسوس نہیں ھوتی کہ ان میں سیرت اور قابلیت کے اعتبار سے کسی قدر بین فرق ھوتا ھے - زمانہ حال کی نفسیاتی تحقیقات نے پوری طرح ثابت کردیا ھے کہ ان بچوں میں بھی جو ایک ھی یا ایک سے ماحول میں رھتے ھیں اور ایک ھی تعلیمی منزل میں ھوتے ھیں بعض اوقات نہایت زبردست دماغی اور جذباتی اختلافات پائے جاتے ھیں جن کی طرف سے بے پروائی برتنے سے اکثر طلبہ کی زندگی برباد جاتی ھے یا کم سے کم ان کی ابتدائی تربیت ناقص رہ جاتی ھے اور ان کی صلاحیتوں کی ارتقا پوری طرح نہیں ھونے پاتی - مندرجہ بالا بحث میں بچوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ھے وہ بڑی حدتک ان نوجوانوں پر بھی عائد ھوتا ھے جو بچپن کی وادی عیش سے نکل کر شباب کی پر آشوب منزل میں قدم رکھتے ھیں - بچپن میں ' جب عادتیں مستحکم ھونی شروع ھوتی ھیں اور طلبہ کے جذباتی میلانات نشو ونما پاتے ھیں ' گھر کا اثر مدرسے سے بہت زیادہ دیرپا اور وسیع ھوتا ھے - اس کے بعد نوجوانی کے دور میں جب بچپن کا توازن تہ و بالا ھوجاتا ھے نئی جبلتیں اور نئے جذبات رونما ھوتے ھیں اور نوجوان طالب علم کو طرح طرح کی تحریکوں اور کششوں کے درمیان اپنے لئے راہ نکالنا پڑتی ھے - اس وقت بھی گھر کی فضا اور روایات اس کی رھنمائی کرتی ھیں - ممکن ھے کہ یہ فضا خراب اور یہ روایات ناقص اور گمراہ کن ھوں - ایسی حالت میں نوجوان کی بے مرکز زندگی کا خدا حافظ ھے - لیکن اگر اس وقت والدین اور بھائی بہن اور عزیز ترین دوستوں کی صحبت اور مثال خاموشی کے ساتھ اپنا عمدہ اثر ڈالتی ھے تو نوجوان کی زندگی ھمیشہ کے لئے سدھر

جاتی ہے - اسی جد و جہد اور کشمکش کے دور میں اگر نوجوان کو یہ احساس ہو کہ اس کا گھر اس کے لئے ایک امن و سکون کی منزل ہے جہاں ایسے اصولوں اور قدروں کی حکمرانی ہے جن کا وہ احترام کرتا ہے تو ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ اس تقویت اور اطمینان قلب کی بدولت تمام تحریصات پر غالب آئے - بقول ڈاکٹر وھیلر کے

> " والدین اور بھائی بہنوں کی محبت ' گھر کی مسرت بخش زندگی ' عزیزوں کی باھمی مراعات' وہ بے تکلفی اور ارتباط جو ایک چھوٹی سی قدرتی جماعت ھی میں پیدا ہوسکتا ہے ' حفظ حقوق و مراتب کی فضا میں زندگی بسر کرنا ' حق ' خیر اور حسن کا احترام ' یہی چیزیں ہیں جو فرد کے جذبات کی تربیت کرتی ہیں " [۱]

ھمارے ھندوستانی گھروں میں بچوں اور نوجوانوں کو دو مختلف خطرے در پیش ہیں - ایک خطرہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات ان کی اس قدر بے جا ناز برداری اور رعایت کی جاتی ہے کہ وہ بڑے ہوکر معاشرتی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رهتے یا بہت سے تلخ تجربے اٹھانے کے بعد دوسروں کے حقوق اور فرائض کا احترام کرنا سیکھتے ہیں - دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ اس قدر بے جا سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان میں آزادی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی ان کی اپچ دب جاتی ہے ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے یا ان کے دل میں والدین اور عزیزوں کی طرف سے نفرت اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو انہیں اندر ہی اندر " باغی " اور

---

[۱] Wheeler, Youth

" سرکش " بنادیتے ہیں - اور لطف یہ ہے کہ اکثر ایک ہی بچے کے ساتھ دونوں قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے - کبھی تو والدین ان کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں ' ان کی ہر بات اور ہر ضد کو مان لیتے ہیں اور کبھی کم از کم بچوں اور نوجوانوں کے خیال میں ' منطق کے تمام کلیے توڑ کر خواہ مخواہ ان پر ناراض ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی خواہشوں کو روکنا چاہتے ہیں - یا والدین میں سے ایک بے جا ناربرداری اور دوسرا غیر ضروری سختی کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے بڑوں کے ساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم نہیں کرسکتا - اور اس وجہ سے ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے بھی مستفید نہیں ہوسکتا - کچھ عرصے کے بعد جب بچہ بڑا ہوکر نوجوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ والدین اور گھر کے دوسرے لوگ ان تبدیلیوں اور انقلابات کی پوری اہمیت کو نہیں سمجھتے جو اس زمانے میں ہوتے ہیں - اس وقت بھی وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتے ہیں جو بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اب ان کو زیادہ آزادی رائے اور آزادی عمل حاصل ہونا چاہیئے اور بجائے تحکمانہ برتاؤ کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا زمانہ آگیا ہے - اس ناواقفیت یا تحکم پسندی کی بدولت والدین اور اولاد کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں اور روز مرہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ان کی نشو و نما کے لئے سازگار ماحول پیدا نہیں ہو سکتا - چنانچہ گھر جو در اصل ایک تعلیمی ادارہ ہے اپنے فرائض کی ادائگی سے قاصر رہتا ہے - اسی وجہ سے بچوں اور نوجوانوں کی نفسی زندگی کے صحیح اور واضح علم کی اشاعت والدین کی آگاہی کے لئے ضروری ہے - ورنہ یہ اندیشہ

ہے کہ ہماری موجودہ غلط فہمی اور جہالت ہماری طبیعت میں راسخ ہو جائیگی اور نو عمروں کی صحیح تربیت نہ گھر کے بس کی بات رہے گی نہ مدرسے کے بس کی - بچوں کی نشو و نما سے گھر کا جو تعلق ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کی تعلیم اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتی جب تک مدرسہ اور گھر دونوں مل کر اس میں حصہ نہ لیں اور باہمی اتحاد عمل کے ساتھہ ان کی زندگی کو سدھارنے اور مفید بنانے کی کوشش نہ کریں - آج کل تو یہ حالت ہے کہ مدرسے کے معلموں کو گویا طلبہ کی خانگی زندگی سے اور گھر والوں کو ان کی تعلیمی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں - یہ صورت حال بہت افسوسناک اور مضر ہے - کسی شخص کی زندگی بھی مختلف شعبوں میں اس طرح تقسیم نہیں کی جا سکتی کہ انہیں ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو چہ جائیکہ بچوں کی زندگی جن کی ذات سراسر وحدت کا مظہر ہوتی ہے-بچے روزانہ چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً اٹھارہ گھنٹے مدرسے سے باہر گھر میں اور اس کے آس پاس بسر کرتے ہیں - ان کے ذہن اور سیرت کی تشکیل صرف مدرسے کے وقت تک محدود نہیں بلکہ بیداری کے ہر لمحہ میں ہوتی رہتی ہے اور کم سے کم بچپن میں تو گھر کا اثر مدرسے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے - اگر گھر کا مجموعی اثر مفید ہے اور مدرسے کے کام میں اعانت کرتا ہے تو بچے کی نشو و نما مناسب طریقے پر ہوگی لیکن اگر ان دونوں کے اثرات ہم آہنگ نہیں اور مدرسے کی تربیت گھر میں آکر زائل ہو جاتی ہے یا گھر کی عمدہ روایات اور عادتیں مدرسے میں پختہ نہیں ہوتیں تو طالب علم کے نفس میں ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے - جس کا نتیجہ

اس کی زندگی کے لئے اچھا نہیں ہوتا - اس کی ایک معمولی سی مثال زبان اور گفتگو کا مسئلہ ہے - اکثر طلبہ کے گھروں پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ غلط یا گنواروں کی زبان ہوتی ہے - مدرسے میں بحیثیت مجموعی اس سے بہتر اور زیادہ صحیح زبان رائج ہوتی ہے - جب طالب علم مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو استاد کوشش کرتے ہیں کہ وہ صحیح زبان بولے لیکن گھر کی پڑی ہوئی عادات آسانی سے نہیں چھوٹتی بلکہ روز مرہ کے اثر سے اور پختہ ہوتی جاتی ہے - بالعموم یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی یا ثانوی مدارس کی تعلیم حاصل کر کے چھوڑ دیتے وہ پہلے تو ایک عجیب مخلوط زبان بولتے ہیں جس میں کچھ ان کی "تعلیمی" زبان کا جز و ہوتا ہے اور کچھ ان کے گرد و پیش کی روز مرہ کا - کچھ عرصہ کے بعد وہ مدرسے کی زبان رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں اور تقریباً وہی زبان بولنے لگتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج ہوتی ہے - اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اکثر تعلیمی مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک گھر اور مدرسہ یعنی والدین اور استاد مل جل کر' بچوں کی تربیت کا انتظام نہ کریں - یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں اداروں میں اشتراک عمل کے لئے کیا عملی طریقے استعمال کئے جائیں لیکن اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس مقصد کے لئے محض دو تین سالانہ جلسے کافی نہیں - جن میں والدین تماشہ دکھلانے کے لئے بلا لئے جاتے ہیں - اس کے لئے وہ مخصوص ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن سے والدین اور سر پرست یہ محسوس کریں کہ ان کے شہر یا گاؤں کا مدرسہ کوئی اجنبی یا سرکاری ادارہ نہیں جو

ان کی زندگی اور مشاغل سے بے تعلق ہے بلکہ ان کی تمدنی
زندگی کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے جس کے بغیر ان کا کام
نہیں چل سکتا - اس مقصد کے حصول کے لئے دو باتوں کی خاص
ضرورت ہے - ایک تو یہ بدیہی امر ہے کہ والدین اور معلموں میں
باہمی میل جول ہونا چاہئے تا کہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات
اور مقاصد سے واقف ہو جائیں اور اپنے بچوں کی تربیت کے لئے
بہترین اور مناسب ترین ذرائع اختیار کریں - دوسری بات جو ایک
لحاظ سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ مدرسے کو بحیثیت ایک تعلیمی
ادارے کے ایسے مشاغل اختیار کرنے چاہئیں جو گرد و پیش کے بالغ
لوگوں کو براہ راست فائدہ پہنچائیں - موجودہ نظریہ تعلیم کا یہ
اصول کہ مدرسہ کو اپنے شہر یا گاؤں کی تمدنی زندگی کا مرکز ہونا
چاہیے اور لوگوں کو بہتر طرز زندگی سے روشناس کرنا چاہئے اسی
خیال کی تفسیر ہے - مغربی ممالک میں جا بجا اور ہندوستان
میں کہیں کہیں اس قسم کے جو تجربے کئے گئے ہیں خصوصاً گاؤں کی
زندگی کی اصلاح اور لوگوں کی طرز معاشرت اور حفظان صحت کے انتظام
میں مدرسوں نے جو حصہ لیا ہے وہ غور اور مطالعہ کے قابل ہے
اور اس قسم کے کام اس سے بڑے پیمانہ پر کرنے کی ضرورت ہے -
اگر ہندوستانی مدارس کی تنظیم جدید میں اس خیال کو عملی
جامہ پہنایا گیا تو اس سے نہ صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا
جن کی مدرسے خدمت کریں گے بلکہ خود مدرسے کی تعلیم زیادہ
مفید، زیادہ دلچسپ اور زیادہ علمی ہو جائے گی کیوں کہ طلبہ
محسوس کرینگے کہ ان کے تعلیمی مشاغل بے کار اور بے مقصد نہیں
ہیں بلکہ ان سے ایسے کاموں کو کرنے میں مدد ملتی ہے جو

صریحاً مفید ہیں اور اُن کی تعمیری قوتوں کو اُبھرنے کا موقع دیتے ہیں -

معاشرتی زندگی کا تعلیمی اثر

گھر بچے کا سب سے پہلا اور قریبی ماحول ہوتا ہے - اس سے زیادہ وسیع ماحول جو اس کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اُن گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل ہے جن سے بچے کا قریبی تعلق ہوتا ہے - انہیں ہم مجموعی طور پر معاشرتی طبقے کہتے ہیں - اُن میں سے ایک تو وہ خاص جماعت ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور جسکا رکن وہ تقریباً اسی حیثیت سے ہوتا ہے جس حیثیت سے اپنے خاندان کا فرد ہوتا ہے - کسی گروہ کو اس معنی میں ایک جماعت بننے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اس کے افراد کی مالی حیثیت، رسم و رواج، طرز معاشرت، تہذیب و تمدن کی روایات کم و بیش ایک سی ہوں اور ان میں خود بخود اتحاد اور میل جول ہو - مثال کے طور پر اس معنی میں کسی شہر کے جلا ہے یا قصاب ایک "جماعت" ہوتے ہیں نہ اس وجہ سے کہ وہ ایک ہی پیشہ اختیار کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں ہر طرح یک جہتی اور یکسانی پائی جاتی ہے - وہ لفظاً اور معناً ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں - اسی طرح کسی شہر کے تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ لوگ جن کی اقتصادی اور معاشرتی حیثیت ایک سی ہوتی ہے اور آپس میں میل جول ہوتا ہے ایک جماعت کے افراد ہیں - یا انگلستان میں کچھ عرصہ بیشتر تک جو طلبہ وہاں کے بڑے بڑے تاریخی پبلک اسکولوں مثلاً ایٹن (Eton) اور رگبی (Rugby) وغیرہ میں تعلیم پانے کے لئے داخل ہوتے تھے وہ خوش حال امرا کے

طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی خاص روایات اور خاص نقطۂ نظر ہوتا تھا جو اپنی خوبیوں اور خرابیوں دونوں کے لحاظ سے اور تمام جماعتوں سے علحدہ اور ممتاز ہوتا تھا - یہاں ہم نے ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ گزشتہ چند سال میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہاں جمہوری تحریکوں کی بدولت ان مدرسوں میں بھی وہ امتیازی شان نہیں رہی جو پہلے تھی - اس معاشرتی ماحول میں ہم پڑوس کے اثرات اور بعض صورتوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کے مجموعی تمدنی اثرات کو بھی شامل کرسکتے ہیں - کیونکہ ان سب چیزوں کو مجموعی طور پر نہ صرف افراد کی سیاسی اور اقتصادی نشو ونما میں دخل ہے بلکہ وہ ان کی معاشرتی تعلیمی اور مذہبی حالت کو بھی متاثر کرتی ہیں -

جب بچہ زندگی کا سفر شروع کرتا ہے تو وہ نہ صرف گھر کی فضا میں پرورش پاتا ہے بلکہ اس کے گرد ایک دائرہ عمرانی زندگی کا ہوتا ہے جو اکثر غیر محسوس لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس کی عادات ، خیالات اور سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے - اس کی چال ڈھال ، اس کا طرز گفتگو اور ذخیرہ الفاظ ، اس کے اخلاقی اصول اور نصب‌العین اپنے ماحول کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں - اوپر کی مثالوں کو لے کر ان پر غور کیجیے - اگر بچے کی ابتدائی زندگی جلاہوں کی کسی منظم اور محنتی جماعت میں بسر ہوگی تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس میں اپنے اس ماحول کی وجہ سے عمرانی احساس بہت مستحکم ہوگا محنت کرنے کی عادت ہوگی ، ہاتھ سے کام کرنے میں عار نہ ہوگا ، لیکن اگر اس کے خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں تو وہ ان خوبیوں کے باوجود تنگ خیال اور تنگ نظر ہوگا - اس کی ہمدردی

اور مشاغل کا دائرہ محدود ہوگا - اس کو چند انی گنی چیزوں کے علاوہ دنیا کی کسی اچھی چیز سے دلچسپی نہ ہوگی - اس کے مقابلے میں کسی ایسے بچے کو لیجیے جو ایک تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ شخص کے گھر میں پیدا ہوتا ہے اور جیسے ہوش سنبھالتے ہی زیادہ تر اسی جماعت یا طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے - اس کی بول چال اس کے خیالات ' اس کی طرز زندگی سب پہلے بچے سے مختلف ہونگے - اغلب یہ ہے کہ اس کو ہاتھ کا کام کرنے کی نہ عادت ہوگی نہ شوق - بلکہ اگر اس کی تربیت " شرافت " کے غلط تصور کے زیر اثر ہوگی تو وہ محنت اور دستکاری کو ذلیل سمجھے گا اور تعلیم ہی کے زمانے میں " نوکری " کو اپنا مطمح نظر بنائے گا - اس کو شاید یہ احساس بھی نہ ہو کہ وہ زندگی کتنی محدود اور تنگ ہوتی ہے جس میں انسان کو ہمیشہ دفتر میں بیٹھ کر مشین کی طرح کام کرنا پڑتا ہے - فطرت کے مناظر اور مظاہر سے اسے نہ واقفیت ہوگی اور نہ دلچسپی - وہ اپنے خیال میں معاشرے کو دوطبقوں میں تقسیم کرے گا - ایک وہ لوگ جن کے رہنے سہنے کا طریقہ اس سے ملتا جلتا ہے ' جنہوں نے تھوڑی بہت تعلیم پائی ہے ' جدید تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے ہیں - دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس کے نزدیک " ذلیل " اور کم درجہ کے کام کرتے ہیں' اس سے کم ترحیثیت رکھتے ہیں اور معاشرتی زندگی کے آداب و رسوم میں بھی اس سے مختلف ہیں - اس کے ساتھ یہ امکان بھی ہے کہ یہ لڑکا گفتگو ' آداب مجلس ' عام علمی اور کتابی واقفیت اور ذہنی بیداری میں اپنے ہم عمر جلاہے کے لڑکے سے بہتر ہو کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بچے بغیر کسی خاص تعلیمی اہتمام کے خود بخود اپنے ماحول سے سیکھ لیتے ہیں - یہ دونوں مثالیں اس خاص مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہی

گئی ھیں کہ اگر تعلیم و تربیت کے اثرات اور طبعی اختلافات کا دخل نہ بھی ھو تو بھی قرین قیاس یہ ھے کہ محض عمرانی ماحول کے فرق کی وجہ سے دو اوسط درجے کے بچوں میں اس قسم کا فرق پایا جائیگا - یہ اور بات ھے کہ خاص اثرات کے ماتحت ان دونوں کی شخصی نشو ونما اس کے برعکس ھو - بہر حال اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں ھوسکتا کہ مقامی حالات اور روایات بڑی حد تک بچوں کے لباس ' گفتگو ' خیالات ' مذاق اور اخلاقی اصول کو بناتے یا بگاڑتے ھیں -

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرتا لیکن عملاً اس کی تعلیمی اھمیت اور نتائج کو لوگوں نے نہیں سمجھا - تعلیم کا کام بھی یہی ھے کہ وہ بعض معینہ اصولوں کے مطابق اور کسی اعلیٰ نصب‌العین کے ماتحت بچوں اور نوجوانوں کی زندگی کی تشکیل کرے یعنی ان کے موجودہ عادات وخیالات اور ان کی طبیعت اور مذاق کی اصلاح کرکے ان کو بہتر اور شائستہ تر بنائے - اس لئے ایک لحاظ سے تعلیم اور عمرانی اثرات کا دائرہ بڑی حد تک ایک ھی ھے اور معلموں اور تعلیم گاھوں کو ھرگز ان اثرات کی طرف سے بے پروائی نہیں برتنا چاھئے جو طلبا کے گرد وپیش کی جماعتی زندگی سے پیدا ھو کر ان کی شخصیت میں جذب ھوتے رھتے ھیں -

ھمارے ملک میں بعض خاص معاشرتی اسباب سے یہ اثر دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ راسخ اور مستحکم ھے - یہاں ذات پات کی بندشیں اور قیود ایسی ھیں جو نہ صرف افراد کی معاشرتی حیثیت کو بلکہ ایک حد تک ان کے خیالات ' ان کے باھمی میل جول کی حدود ' ان کے پیشوں کو بھی پہلے سے متعین کردیتی ھیں اور لوگ خواہ وہ سن رسیدہ ھوں یا نو عمر ' آسانی سے ان بندشوں اور ضابطوں کو نہیں توڑ سکتے

جو " ذات " ایک مطلق العنان اور جابر حاکم کی طرح ان پر عائد کرتی ھے - اُس میں شک نہیں که گزشته زمانے میں بہت سی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کی وجه سے ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ھوگئی ھیں اور ایسے اثرات کام کر رھے ھیں جو غالباً کچھه مدت میں ان کو بالکل توڑ دینگے لیکن ابھی تک اُن کا اثر اتنا وسیع اور راسخ ھے که نظریه تعلیم اُس کو نظر انداز نہیں کرسکتا -

اب سوال یه پیدا ھوتا ھے که تعلیم کا تعلق اُن جماعتی اثرات سے کیا ھے - اس مسئله کے بعض پہلو تو بالکل صاف اور واضح ھیں - مدرسه اکیلا اپنے طلبه کی تربیت کا فرض ادا نہیں کرسکتا اس کے ساتھ دوسرے تمدنی اداروں کی شرکت بھی ضروری ھے کیونکه اُس کا اثر ان کے روز مرہ کے اوقات کے ایک تھوڑے سے حصے تک محدود ھوتا ھے اور باقی اوقات میں ان کی تربیت وہ تمام عمرانی تعلقات اور روایات کرتی ھیں جن کا مرکز مدرسے سے باھر ھے لہذا کوئی تعلیمی اصلاح اس وقت تک پوری طرح کامیاب نہیں ھوسکتی جب تک اس کے ساتھ وسیع تر تمدنی اصلاح کی کوشش نه کی جائے تاکه تمام تمدنی اداروں کا مجموعی اثر هم آهنگ اور طلبه کی تربیت کے لئے مفید ھو - ظاھر ھے که اگر عمرانی اثرات مدرسے کے کام میں معین ھوں تو تربیت کا فرض بہت سہل ھوجاتا ھے - اور یه بات بھی غور کے قابل ھے که ان اثرات کی وجه سے مدرسے کے طلبه میں انفرادی اختلافات بہت نمایاں ھو جاتے ھیں - اول تو فطری اختلافات کا دائرہ بجائے خود بہت وسیع ھوتا ھے پھر جب اس کے ساتھ گھر اور عمرانی ماحول کا فرق بھی شامل ھو جائے تو افراد میں باھم اور زیادہ تفاوت ھو جاتا ھے - کیا به لحاظ جسمانی اور معاشرتی تربیت کے ' کیا به لحاظ اخلاقی اور دماغی

نشو و نما کے ہر طالب علم اور تمام طلبہ سے مختلف ہوتا ہے
یہاں تک کہ ان طلبا میں بھی جو کم سے کم ذہنی اعتبار سے
بظاہر ایک ہی معیار کے معلوم ہوتے ہیں پوری طرح غور اور امتحان
کرنے پر بہت بڑا فرق نکلتا ہے - ان سب کی تربیت کرنا مدرسے
کا فرض ہے - کسی قدر پیچیدہ اور دشوار ہے یہ فرض اگر اس کو
پوری طرح سمجھا جائے ! ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدرسہ ایک تمدنی
ادارہ ہے جسے معاشرہ اپنے مشترک اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے
قائم کرتا ہے - برخلاف اس کے خاندان کا نقطہ نظر تمام تر انفرادی ہوتا ہے
یعنی جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر بچہ ایک
مخصوص سیرت کا مالک ہے جس کی نشو و نما گھر کی تربیت کا
سب سے زیادہ اہم فرض ہے - مطالبات کی اس کشمکش میں مدرسے کا
نازک فرض یہ ہے کہ نہ صرف طلبا کی انفرادی بہبود کا خیال
رکھے بلکہ ان کو اجتماعی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری کے
لئے بھی تیار کرے - اس فرض کی دقت اور نزاکت کا پورا احساس
انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ اگرچہ حالت
کمال میں فرد اور جماعت کی اغراض بالکل متحد اور ہم آہنگ
ہونی چاہئیں لیکن عملاً ہماری اس ناقص دنیا میں ہر ہر قدم
پر انفرادی آزادی اور معاشرے کے اٹل مطالبات میں جنگ ہوتی
رہتی ہے - بہر حال اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ
بچوں اور نوجوانوں میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کی اہلیت
پیدا کی جائے اور ان تعصبات اور اختلافات کو دور کیا جائے جو
افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط و ضبط اور اشتراک عمل میں
سدراہ ہیں اور لوگوں کے دلوں میں قومی روح اور وحدت مقاصد

کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے - یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے یوں نظری طور پر تو ہر شخص تسلیم کرلیتا ہے لیکن اگر لوگ خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر عمل کریں تو نہ صرف تعلیم بلکہ تمام نظام معاشرت میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تعلیم کے اداروں اور انتظامات کا مجموعی اور متحدہ رجحان یہ ہو کہ ذات پات کی تمام بیجا بندشوں ' جماعتی خود غرضیوں ' اقتصادی مظالم اور نا انصافیوں کی بیخ کنی کی جائے - اگر تعلیم کے میدان میں یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو کسی ''اونچی'' ذات کا لڑکا کسی ''نیچی'' ذات کے لڑکے کے ساتھ تعلیم پانے سے کیوں کر انکار کر سکتا ہے ؟ مختلف طبقوں کے لئے مختلف قسم کے تعلیمی ادارے کب جائز رکھے جا سکتے ہیں ؟ محض دولت مند ہونا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی شرط کیسے قرار پا سکتا ہے ؟ ہر طبقے اور ہر گروہ میں اشتراک عمل کے بجائے مقابلہ اور رقابت کے جذبات پیدا کرنا کس طرح گوارا کیا جا سکتا ہے ؟ جمہوریت کا اصل مفہوم یہی ہے کہ ہر اس چیز کو جو معاشرے کے افراد کو اجتماعی بندشوں میں جکڑ کر ان کی آزادانہ نقل و حرکت اور میل جول کو روکتی ہے ' جو نام و نسب کی اضافی صفات کے مقابلے میں ذاتی صلاحیت کو خاطر میں نہیں لاتی ' جو بعض لوگوں کو صرف محنت کی کڑیاں سہنے کے لئے اور بعض کو محض فرصت کا لطف اٹھانے کے لئے مخصوص کرتی ہے ' مٹا دیا جائے ' تا کہ ہر فرد بغیر کسی روک ٹوک کے ایک آزاد اور سازگار ماحول میں اپنی قوتوں کو پوری طرح نشو و نما دے سکے اور ان کو اجتماعی اور قومی اور اس سے بڑھکر نوعی خدمت کے لئے استعمال

کرنا سیکھے - لہذا جمہوری تعلیم کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو ان ناجائز سہولتوں اور غیر معمولی رعایتوں کو دور کیا جائے جو بعض افراد یا جماعتوں کو بغیر ذاتی استحقاق کے حاصل ہوگئی ہیں اور تمام افراد قوم کے لئے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی معرکۃ الارا کتاب "تعلیم اور جمہوریت" (Democracy and Education) جو اس صدی کی بہترین تعلیمی تصنیف ہے اس مبحث پر ہر پہلو سے روشنی ڈالتی ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعہ ان تمام اجتماعی بندشوں اور سختیوں کو دور کیا جائے جنھوں نے افراد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جکڑ رکھا ہے اور عام لوگوں کے اندر جو جوہر ہے اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیتیں - اس طرح تعلیم تمدنی اصلاح کے لئے ایک زبردست آلۂ کار بن جاتی ہے جو نئی نسل کے افراد میں ایک نئی ذہنیت پیدا کرکے معاشرتی ناانصافیوں کو دور کرنے کی فکر کرتی ہے -

لیکن اسی کے ساتھ تعلیم کا یہ بھی کام ہے کہ وہ جماعتوں کی مختلف اور تمدنی روایات کا لحاظ رکھے اور افراد کی تربیت اسی طرح کرے کہ نہ صرف ان کی ذہنی قوتوں کی نشو و نما ہو بلکہ وہ ان کو اپنے عمرانی ماحول میں بغیر کشمکش اور تصادم کے خوبی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرسکیں - ہر شخص کی زندگی صرف مجموعی معاشرے کے زیر اثر نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا ماحول زیادہ تر ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں پر مشتمل ہے جو اس کی گھر کی زندگی کو کئی ہم مرکز دائروں کی طرح گھیرے ہوئے ہیں - ہم کیسے کسی شخص کو صحیح

طور پر تعلیم یافتہ کہہ سکتے ہیں جب تک اس یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے گھر والوں ' اپنے ہمسایوں اور پڑوسیوں ' اپنی " برادری " کے اشخاص کے ساتھہ مناسب سلوک کرسکے ؟ مناسب سلوک سے ہماری مراد یہ ھے کہ وہ ان جماعتوں کے اصول معاشرت ' روایات ' اور مخصوص معاملات کو سمجھے اور ان سے ہمدردی کرے ' بالعموم اس کے افعال ان کے ساتھہ ہم آہنگ ہوں اور وہ ان فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھہ ادا کرے جو ان جماعتوں کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے ذمے عائد ہوتے ہیں - مثال کے طور پر ہندوستان کے کسی گاؤں کے باشندے کو لے لیجئے جس نے مقامی یا ضلع کے مدرسے میں تعلیم پائی ھے - اگر یہ تعلیم اس کو اپنے مخصوص دیہاتی ماحول میں زندگی گذارنے کے قابل نہ بنا سکے ' اگر اس کو مناظر فطرت سے دلچسپی باقی نہ رھے ' کام اور محنت کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے ' گاؤں کی زندگی کے بنیادی اصول یعنی باھمی امداد اور اشتراک عمل اس کے دل کو نہ لگیں تو وہ تعلیم اس کے لئے نہ صرف بے کار ھے بلکہ نہایت مضر ھے - اس کو اپنی زندگی اسی ماحول میں گذارنی ھے اور سوائے خاص صورتوں کے اسی ماحول میں میں گذارنی چاھئے - لہذا اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود اپنے گاؤں میں اجنبی بن کر زندگی بسر کرے گا اور ان معاملات میں دلچسپی نہ لے گا تو ایک طرف وہ خود خوشی اور مسرت سے محروم رھیگا اور دوسری طرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی کوئی خدمت نہ کرسکے گا -

ہندوستان کے موجودہ تعلیمی حالات اور رجحانات کو دیکھہ کر اس بات پر زور دینے کی ضرورت خاص طور پر محسوس ہوتی

هے - اس سے ہمارا مقصد تنگ نظری اور محدود مذاق کی حمایت کرنا نہیں اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گاؤں کے رہنے والوں کو صرف گاؤں سے دلچسپی ہو اور شہروں کے رہنے والے اپنے سامنے کی چیزوں کے سوا کسی چیز کو نہ دیکھیں اور نہ اس پر غور کریں - موجودہ زمانے کی ایجادات اور سائنس کی ترقی نے دنیا کو اس طرح ملا دیا ہے اور تمام انسانوں کو تعلقات اور باہمی احتیاج کی زنجیروں میں اس شدت سے جکڑ دیا ہے کہ ہمارے لئے ہرگز مناسب نہیں کہ ہم اپنی فوری ضروریات کے علاوہ اور تمام مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں - لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کا باشندہ بننے سے پہلے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے گاؤں کے دیہاتی یا اپنے شہر کے مفید اور ذمہ دار شہری بنیں - حقیقت میں کوئی شخص جس کو اپنی مقامی حالات سے واقفیت اور دل چسپی نہ ہو وسیع ترقومی اور بین الاقوامی معاملات میں معقول اور مفید طریقے پر شرکت نہیں کرسکتا - وہ " لیڈری " کرسکتا ہے مگر خدمت اس کے بس کی بات نہیں - اکثر لوگ جنہوں نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت انجام دی اور صفحہ تاریخ پر اپنا نقش ثبت کرگئے وہی تھے جنہوں نے ابتدا میں کسی محدود حلقہ عمل میں خلوص اور محنت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام کرکے بڑے کارناموں کے انجام دینے کی قابلیت بہم پہنچائی - اس کے علاوہ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کے لئے یہ امکان ہی نہیں کہ براہ راست قومی یا بین‌الاقوامی معاملات پر کوئی زبردست اثر ڈال سکیں - وہ حلقہ عمل ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے اپنی قابلیت ' اپنی مسلسل محنت اور ایک حد تک اچھے موقعوں سے فائدہ اٹھا کر مسلمہ حیثیت پیدا کرلی ہے جس کی بدولت ' وہ ان معاملات میں حصہ لے سکتے ہیں -

باقی لوگوں کا فرض اور نہایت اہم فرض یہی ہے کہ وہ اپنے محدود حلقہ عمل میں اپنے متعلقین اور گرد و پیش کے لوگوں کی خدمت کریں - اس خدمت کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقامی ماحول کا مطالعہ کریں اور اس کو سمجھیں ' عمرانی زندگی کے نظام پر غور کریں اور اپنی اپنی قابلیت کے مطابق جہاں تک موقع ملے ان میں اصلاح اور بہتری کی کوشش کریں - معاشرے کے جمہوری نظام کی کامیابی کے لئے یقیناً قابل لیڈروں کی ضرورت ہے لیکن اتنی ہی ضرورت تربیت یافتہ اور فرض شناس پیرووں کی ہے جو ان لیڈروں کے ماتحت اپنا اپنا کام ذمہ داری اور دانش مندی کے ساتھ انجام دیں - اول تو لیڈر بجائے خود کچھ نہیں کرسکتے جب تک ان کے ساتھ ایک جماعت نہ ہو جو اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکے - دوسرے جمہوری نظام میں لیڈر بننے کے لئے کسی خاص طبقے میں پیدا ہونا یا دولتمند ہونا شرط نہیں بلکہ انہیں عام لوگوں میں سے غیر معمولی قابلیت کے لوگ اپنی اپچ اور کار کردگی کی بدولت آگے بڑھ کر قیادت کے فرائض انجام دیتے ہیں - لہذا قومی اصلاح اور سیاسی اور معاشرتی تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب تمام افراد قوم کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ چھوٹے چھوٹے مفید کاموں اور فرائض میں انہماک اور دلچسپی کا اظہار کریں اور ان کو نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ انجام دیں کیونکہ یہی وہ قطرے ہیں جو مل کر سمندر بن جاتے ہیں اور جن کے بغیر ساری کوششیں جو بڑی بڑی قومی انجمنوں اور اداروں میں کی جاتی ہیں بیکار ثابت ہوتی ہیں - ہندوستان میں جو مفید تحریکیں آئے دن ناکام ہوتی رہتی ہیں ان کی اصل وجہ یہی ہے کہ لوگ بڑے بڑے منصوبوں اور دعووں کے ساتھ ان کو شروع کرتے ہیں لیکن جب وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو کوئی ایسی

خاموش کارکن جماعتیں نہیں ملتیں جو باوجود مشکلات اور ہمت شکن حالات کے استقلال کے ساتھ انہیں اپنے اپنے حلقہ عمل میں چلاتی رہیں - ہماری موجودہ تعلیم کا ایک اندیشہ ناک رجحان یہ ہے کہ وہ افراد کو ایک حد تک ان کے قریبی ماحول اور اس کے اہم اور غور طلب مسائل سے بیگانہ کردیتی ہے اور دور از کار باتوں میں الجھادیتی ہے یا محض ذاتی فوائد کے بھیر میں ڈال دیتی ہے - ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ نصاب، طریقۂ تعلیم اور تعلیم کی اندرونی روح کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ میں مقامی " حب وطن " پیدا ہو اور وہ مقامی معاملات میں توجہہ اور ہمدردی کے ساتھ حصہ لے سکیں - اب آگے انہیں جہاں تک توفیق اور ان میں جتنی قابلیت ہو - انسان کا ذہن زنجیروں سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ آزادی سے لامحدود فضا میں اڑتا ہے - اگر اس میں مطالعے اور تخیل کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو انسان ادب اور فلسفہ اور سیاست کے بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے مسائل میں دلچسپی اور حصہ لے سکتا ہے -

هم چو پر کاریم در راہ شریعت مستقیم

پائے دیگر سیر هفتادو دو ملت می کنیم

اس میں " راہ شریعت " سے ہماری مراد سامنے کے فرائض اور معاملات ہیں اور "ہفتادو دوملت" وہ بیشمار مسائل جن کی بدولت ہمارا تعلق بحیثیت انسان کے تمام دنیا کے انسانوں سے ہے - مستقبل کی تعلیم کے لئے یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے کہ مخصوص مقامی حب وطن اور تعلقات اور ہمارے وسیع تر مفاد اور دل چسپیوں میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ تعلیم یافتہ لوگ ایک دو طرفہ خطرہ سے محفوظ رہیں - بعض تو ایسے ہیں جو بالکل اپنے سامنے کی چیزوں

کو نہیں دیکھتے بلکہ عام معاملات میں محض ایک سطحی اور نظری دلچسپی کا اظہار کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ نظام عالم میں ایک مفید خدمت انجام دے رہے ہیں - اور بعض ایسے ہیں جن کی توجہ ذاتی اور وقتی مسائل میں اس درجہ منہمک ہوتی ہے کہ ان کو دنیا کی وسعت اور گونا گوں دلچسپیوں اور مسائل کا علم ہی نہیں ہوتا - اس قسم کی تعلیم کا تشکیل دینا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں - انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں تعلیم طلبہ میں مقامی حب وطن کا احساس پیدا کرتی ہے اور لوگ اپنے اپنے ضلعوں اور شہروں کے مخصوص ادارات اور روایات سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے تحفظ اور استحکام کی کوشش کرتے ہیں - انگلستان کے ہر ضلعے کی کرکٹ ٹیم وہاں کے باشندوں کی مشترک چیز ہوتی ہے جس پر وہ نثار کرتے ہیں - اسی طرح ہر ضلع اپنے اپنے مدارس' اپنے حفظان صحت کے نظام وغیرہ میں دوسرے ضلعوں پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتا ہے - ہندوستان میں ابھی تک یہ احساس کسی مفید شکل میں پیدا نہیں ہوا - مختلف صوبوں کے باشندوں میں باہمی رقابت ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو حقیر سمجھنا اس جذبے کا بدل نہیں ہوسکتا - لیکن ہماری حالت کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی تربیت اور رہنمائی نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور جب اس میں عنقریب وفاقی نظام قائم ہوجائے گا تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کریگا کہ لوگوں میں کس طرح ملکی حب وطن کے ساتھ ساتھ مقامی حب وطن کا احساس گہرا اور مستحکم کیا جائے -

یہاں ہم ان تمام اصولوں کے عملی نتائج سے بحث نہیں کرسکتے - لیکن یہ ظاہر ہے کہ تعلیم اور معاشرتی جماعتوں کے باہمی تعلق کا صحیح

احساس تعلیم کے تمام پہلوؤں پر بہت نمایاں اثر ڈالے گا اور اس کی وجہ سے نہ صرف تعلیم کے عام مفہوم میں تبدیلی لازم آئیگی بلکہ مدرسوں کے نصاب اور تعلیمی طریقوں اور ضبط و تربیت کے نظام سب میں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑیگا کہ یہ چیزیں طلبہ کو معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتی ہیں یا نہیں - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل کی ترتیب اور انتخاب کرتے وقت ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ جس خاص ماحول میں مدرسہ واقع ہے جہاں اس کے طلبہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہاں معاشرے کی بہبود اور کامیابی کے لئے کن چیزوں پر زور دینے کی اور کیا کیا سکھانے کی ضرورت ہے - معاشرے کے مشاغل کیا ہیں ان کا تعلق صنعت و حرفت سے ہے یا تجارت سے یا زراعت سے - لوگوں کا طرز معاشرت کس قسم کا ہے - ان کے عام رجحانات ' کار و بار کے اصول ' تفریح اور فرصت کے مشغلے کیا ہیں - ان مشاغل اور معاشرت کے طریقوں کا پرتو مدرسے کے نصاب پر بھی پڑے گا - اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم براہ راست پیشوں کی تعلیم دینگے یا فرقہ وارانہ تعصبات اور تنگ نظری کو مستقل بنانے کی کوشش کرینگے اور تعلیم کے وسیع تر مقاصد یعنی دماغ اور روح کی بیداری اور انسانی قوتوں کی ہم آہنگ تربیت کو نظر انداز کر دیں گے - لیکن یہ ضرور ہے کہ مدرسے کی اونچی جماعتوں کی تعلیم میں پیشوں کی مناسبت کا خیال رکھا جائے گا اور ان مضامین میں بھی جو تمام مدارس میں مشترک ہونگے ایسے حصوں پر زور دیا جائیگا جن کا تعلق بالخصوص ماحول کی زندگی سے ہو - مثلاً یہ ضروری نہیں کہ سائنس یا جغرافیہ یا حساب پڑھانے میں دیہات اور شہر کے مدارس

میں یا زراعتی اور صنعتی اضلاع میں ان مضامین کا بالکل ایک هي نصاب مقرر کیا جائے - بلکه یه بہت بہتر هوگا که عام اصولوں کي تشریح کے لئے عملی مثالیں ایسی منتخب کی جائیں جو مدرسے کے مخصوص ماحول سے لی گئي هوں - اس طرح سائنس کی تعلیم میں هم دیہاتی مدارس ' علم نباتات و حیوانات ' مطالعه فطرت وغیره پر زیاده زور دینگے اور صنعتي علاقوں کے مدارس کی توجه ریاضي اور طبیعیات اور کیمیا کی طرف زیاده هوگی اگرچه تعلیمی مصلحت سے ان میں سے کسي شاخ کو بھی بالکل نظر انداز کرنا مناسب نه هوگا - ڈاکٹر وهیلر (Wheeler) نے اپنی کتاب Youth ;" شباب ") میں نوجوانوں کے نصاب تعلیم سے بحث کرتے هوئے یه تجویز پیش کي هے که ثانوی منزل میں نصاب کے دو حصے هوجانے چاهئیں - ایک وه حصه جو تمام طلبه کے لئے مشترک اور هر اسکول میں ایک سا هو اور جس کا پورا کرنا ذهین اور کند ذهن ' سائنس پڑھنے والے اور نه پڑھنے والے ' شہري اور دیہاتی غرض سب طلبه کے لئے لازمی هو - اس حصے میں وه مندرجه ذیل مضامین کو شامل کرتی هیں :—

جسمانی تربیت -

کوئی صناعی یا دست کاري -

مطالعه فطرت -

مادری زبان یا زبانیں -

ادب -

تاریخ وجغرافیه -

معاشرتي اور مذهبی تربیت -

دوسرے حصے میں ان کے نزدیک ایسے مضامین هونے چاهیں

جن کو نوجوان طلبہ اپنی مخصوص قابلیت اور ضروریات کے مطابق منتخب کرسکیں - اس حصے میں بقی تمام مضامین جو بالعموم نصاب کا جزو ہوتے ہیں شامل ہیں وہ اس ضمن میں لکھتی ہیں :—

" زیادہ ذہین طلبہ کے لئے اس چھوٹے سے چھوٹے نصاب میں بعض ایسے مضامین اور مشاغل بھی شامل کرنے چاہئیں جن کی تعداد اور نوعیت کا انحصار افراد کی ذاتی صلاحیت اور شوق اور مختلف مدرسوں کے ماحول کی ضروریات پر ہو - گزشتہ باب میں جن نفسیاتی تعلقات سے بحث کی گئی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ذہانت رکھنے والے طلبہ دو قسم کے ہوسکتے ہیں - ایک وہ جن کا رجحان علمی ہے یعنی ادب یا سائنس کی طرف ہے - دوسرے وہ جن کی دلچسپیاں زیادہ تر عملی ہیں - ان دونوں سے ہمیں یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اوسط یا کم تر ذہانت کے طلبہ کی نسبت مندرجہ بالا نصاب سے زیادہ کام کرینگے - لیکن پہلی قسم میں جو طلبہ شامل ہیں اُن کے نصاب میں حساب فرانسیسی' جرمن' لاطینی' طبیعیات' کیمیا جیسے مضامین پڑھائے جائینگے - اور دوسری قسم کے طلبہ کے لئے عملی مضامین کا اضافہ کیا جائیگا مثلاً مختلف دستکاریاں اور صنعتیں اور عملی سائنس کی وہ شاخیں جن کا ان سے تعلق ہے " [۱]

ظاہر ہے کہ مقامی حالات اور جماعتی ضروریات کا اثر نصاب کے دونوں حصوں پر پڑیگا لیکن پہلے حصے کی نسبت دوسرے حصے پر اس

[۱] صفحہ ۹۷ -

کا اثر زیادہ نمایاں ہوگا - " اگر مدرسہ دیہاتی ماحول میں ہے تو ان علوم و فنون پر زور دیا جائے گا جن کا زراعت سے قریبی تعلق ہے - اگر مدرسہ کسی کان‌کنی کے مرکز میں واقع ہے تو علوم طبیعی پر زیادہ زور دیا جائیگا " - لیکن ہر صورت میں یہ احتیاط شرط ہے کہ نصاب اور مشاغل کی وہ ترتیب و تدوین خراب نہ ہونے پائے جو طلبہ کی عام ذہنی بیداری اور جذبات کی نشو و نما کے لئے قائم کی گئی ہے -

دوسرا اہم مسئلہ جو ہم کو اس ضمن میں پیش آئیگا وہ یہ ہے کہ مدرسے کو عمرانی زندگی کا مرکز کس طرح بنایا جائے - ہم نے گھر اور مدرسے، والدین اور معلّموں کے باہمی تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے - ہمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ خیال بہت عام ہے کہ مدرسہ بھی بہت سے سرکاری دفاتر اور اداروں کی طرح ایک سرکاری ادارہ ہے جس کا قومی زندگی اور قومی ضروریات سے کوئی قریبی تعلق نہیں ہے - اس کے بہت سی تاریخی وجوہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - ان وجوہ کی بنا پر اس خیال کا پیدا ہونا ایک حد تک قرین عقل ہے - مگر اس کا اثر تعلیم کی ترقی پر بہت برا پڑا ہے اور قومی زندگی، اور تعلیم گاہوں کا وہ تعلق جو تعلیم میں روح پھونکتا ہے اور اسے اثر آفرینی کی قوت بخشتا ہے مفقود ہوگیا ہے - اس لئے ہمیں ایک طرف تو تعلیم کو بحیثیت مجموعی قومی ضروریات کا کفیل اور قومی مقاصد اور معیاروں کا ضامن بنانا ہے اور دوسری طرف یہ کوشش کرنی ہے کہ ہر مدرسہ اپنے خاص ماحول اور اس کے باشندوں کی زندگی کے لئے تہذیب کا ایک مرکز ہو تاکہ معاشرہ یہ محسوس کرے کہ یہ درسگاہ نہ صرف بچّوں کو بعض ضروری علوم و فنون کی تعلیم دیتی ہے بلکہ کل جماعت کے لئے براہ راست مفید ہے اور اس کو بہتر مقاصد اور

دل چسپیوں سے روشناس کرتی ہے - بعض ملکوں میں اکثر مدرسوں کی عمارت اور تمام تعلیمی وسائل اور آلات شام کے وقت گردو نواح کے لوگوں کے لئے بطور کلب اور تفریح گاہ بلکہ ایک حد تک بطور بالغوں کی تعلیم گاہ کے استعمال کئے جاتے ہیں اور اس طرح مدرسہ تبادل خیالات، باہمی میل جول اور تفریحی مشاغل کا مرکز بن جاتا ہے - مدرسے اور ماحول کی زندگی میں یہ زندہ رابطہ پیدا کرنا تعلیم کے اہم ترین وسائل میں سے ہے اور اس کو حقیقی معنوں میں " قومی تعلیم " بنانے کا جزو لازم ہے -

———————

باب چہارم

تعلیم اور مسئلہ معاش

اب ہم تعلیم اور مسئلہ معاش کے تعلق کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس تعلق کی نوعیت اور نتائج سے کسی قدر تفصیل کے ساتھہ بحث کرینگے کیونکہ صنعت و حرفت کے موجودہ دور میں اقتصادی مسائل کی اهمیت بہت بڑہ گئی ہے اور برابر بڑھتی جاتی ہے اور پیشے کی اهمیت محض اقتصادی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی بھی ہے - اس لئے نظریہ تعلیم کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے - علاوہ بریں اس مسئلے کے متعلق عام طور پر لوگوں میں اس قدر غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور تعلیمی مسائل میں ان کی وجہہ سے ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں کہ یہ بحث خیالات کو سلجھانے کے لئے ضروری ہے - اس ضمن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے معاشی نظام کو ان تمدنی اداروں میں کیوں شامل کیا ہے جو بچوں اور نوجوانوں کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کا اثر ان کی طبیعت اور سیرت پر کس طرح پڑتا ہے -

بالغوں کے پیشوں کا کوئی اثر بچوں کی زندگی پر گو براہ راست نہیں پڑتا اور ان کے تعلیمی نصاب میں پیشوں کی تربیت کو داخل کرنے کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے قابل تسلیم نہیں تاهم کسی خاص جماعت یا ملک کے پیشوں کے نظام کا جو اثر اس کے افراد پر پڑتا ہے وہ بالواسطہ بچوں کی طبیعت عادات اور مشاغل کو بھی متاثر کرتا ہے - بچہ اپنے تمدنی ماحول سے مختلف قسم کے اثرات قبول کرتا ہے - ان میں ایک بڑا اور

مستقل حصہ اس اثر کا ہوتا ہے جو کسی جماعت کے پیشوں اور وسائل معاش کی تنظیم کا لوگوں کی زندگی پر پڑتا ہے - لوگوں کی ذہنی اور عملی دلچسپیاں' ان کا نظریۂ حیات ، ان کی سیرت کا عام رنگ بہت کچھہ اس کام کی بدولت معین ہوتا ہے جو وہ اپنی روزی کمانے کے لئے آتھہ دس گھنٹے روزانہ کرتے ہیں - ہر شخص کو جو کسی پیشے میں داخل ہوتا ہے ایسے شرکائے کار سے سابقہ پڑتا ہے جن کی گفتگو ، خیالات ، عادتیں اور تفریحی مشاغل ایک خاص قسم کے ہوتے ہیں - وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا خواہ ابتدا میں اس کی طبیعت بالکل ہی مختلف کیوں نہ ہو - رفتہ رفتہ ان مشاغل اور خیالات کا رد عمل اس کی خانگی زندگی اور فرصت کے مشاغل پر بھی ہوتا ہے جو براہ‌راست اس کی اولاد کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں - اس مثال کو اگر زیادہ واضح کر دیا جائے تو ہم سمجھہ سکتے ہیں کہ پیشوں کی تنظیم کس طرح قومی سیرت اور ذہنیت کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور "کاروباری اخلاق" اور "کاروباری ذہنیت" کس طرح رفتہ رفتہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جاتی ہے - انگریزوں کو بعض نقادوں نے "دوکانداروں کی قوم" کا خطاب دیا ہے - اس نام سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کا سب سے بڑا اور اہم وسیلۂ معاش تجارت اور اس کے متعلقہ کاروبار ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کی قومی سیرت اور سیاسی ارتقا کو سمجھنے کے لئے اس خصوصیت کو پیش نظر رکھنا لازم ہے - اسی طرح سوئستان "یورپ کا مہمان خانہ" کہا جاتا ہے - جو شخص سوئس لوگوں کی قومی خصوصیات سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کے اخلاقی اور ذہنی رجحانات پر مہمانداری کے پیشے کا کس قدر گہرا اثر پڑا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں کو سمجھنے

میں اس سے کس قدر مدد ملتی ہے - علیٰ ھذالقیاس ہندوستان صدیوں سے زراعت کا گھر رہا ہے اس وجہ سے کوئی شخص ہماری قومی تاریخ اور قومی سیرت کی بھلائیوں اور برائیوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس مسئلہ پر غور نہ کرے کہ اس ملک میں اسی فی صدی لوگ کاشتکاری کرتے ہیں یا اسی کے متعلق اور کام انجام دیتے ہیں اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اسی قناعت آموز اور صبر طلب شغل میں بسر ہوتا ہے - پھر کیا تعجب ہے کہ بچے جو اپنے بڑوں کی سیرت اور ماحول کا اثر بڑی جلدی قبول کرتے ہیں ایک غیر محسوس طریقہ پر ان معیاروں کو تسلیم کر لیتے ہیں جو ان کے ماحول میں مانے جاتے ہیں اور اس پیشے کے گرویدہ ہو جاتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج ہے - خواہ وہ زراعت ہو یا تجارت یا صنعت و حرفت - پروفیسر اسپرانگر (Spranger) اپنی قابل قدر تصنیف "نفسیات عنفوان شباب" [ا] میں لکھتے ہیں :—

> "ہر پیشہ انسان کے لئے نوشتہ تقدیر بنجاتا ہے - چند سال کے عرصہ میں وہ انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے - کیونکہ یہی ذہن خارجی کا وہ پہلو ہے جس سے فرد کو بہت قریبی تعلق ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اس کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے - صرف پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہو جاتے ہیں - پیشے کے اثر سے انسان کے تصور کائنات کے بیشتر حصے

[ا] یہ کتاب جرمن زبان میں (Psychologie des Jugendalters) کے نام سے شائع ہوئی ہے - اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ہے جو اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے -

کی تشکیل ہوتی ہے - یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے
انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے......جہاں نوجوان کی
ذات پوری قوت سے مکمل خارجی تمدن سے ٹکراتی
ہے " [۱] -

ایک دوسرا سبب جس سے پیشوں کی تعلیمی اہمیت اور بڑھ گئی ہے وہ ان کی جدید اندرونی تنظیم ہے - یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں گذشتہ دو سو برس میں جو صنعتی انقلاب ہوا ہے اِس نے لوگوں کے کاروبار اور مشاغل کی نوعیت کو بالکل تبدیل کردیا ہے - پہلے تقریباً ہر قسم کا کام ہاتھہ سے یا بہت سادہ آلات اور اوزاروں سے کیا جاتا تھا جو ہاتھہ ہی سے چلائے جاتے تھے - ماہرینِ فن اپنے اپنے شاگردوں کو مختلف کاموں کی تعلیم دیتے تھے - لیکن اب تقریباً ہر قسم کا کام مشینوں کے ذریعے ہونے لگا ہے - بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں جن میں سینکڑوں مزدور مشین کے پرزوں کی طرح کوئی ایک مقرّرہ حرکت یا کام کرتے رہتے ہیں - ان ممالک کے علاوہ ہندوستان میں بھی دستکاروں اور صنّاعوں کی سرپرستی کم ہوتی جاتی ہے - کیونکہ جو کام وہ بہت وقت اور محنت صرف کر کے کرتے تھے وہ اب آسانی اور کفایت سے مشین کے ذریعے ہو سکتا ہے - لیکن اس تبدیلی سے جہاں ایک طرف وقت اور روپئے کی کفایت ہوئی وہاں دوسری طرف یہ نقصان ہوا کہ عام لوگوں کے مشاغل میں سے صناعی اور دستکاری کا وہ عنصر مفقود ہوگیا جو ان کی شخصیت اور سیرت کی تربیت میں مدد دیتا تھا - ایک صنّاع جو کوئی چیز مثلاً جوتیوں کا ایک جوڑا یا کپڑے کا ایک تھان محنت اور شوق سے بناتا ہے اس ذریعہ سے نہ صرف اپنی روزی پیدا کرتا ہے بلکہ اس میں اپنے ذوق طبع کا

---

[۱] صفحہ ۲۷۱ -

اظہار بھی کرتا ہے - ایک حدتک اس چیز میں جو وہ تیار کرتا ہے اپنی شخصیت کا رنگ بھرتا ہے اور اس طرح اسے اپنے کام میں اظہار خودی کی مسرت حاصل ہوتی ہے - برخلاف اس کے جو شخص تمام عمر کسی کارخانے میں محض مشین کے پرزے کی طرح کام کرتا ہے اور اس کا کام بھی محض چند مقررہ حرکات تک محدود ہوتا ہے اسے ہرگز اس میں لطف نہیں آسکتا نہ اس کے ذریعے اس کی قوتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہے - اس کا دماغ اس تمام عرصہ میں معطل رہتا ہے وہ نہ اس کام کی ابتدا سے واقف ہوتا ہے نہ انتہا سے' نہ اس کی پوری تنظیم کو سمجھتا ہے نہ یہ جانتا ہے کہ اس کی تمدنی اہمیت کیا ہے - اس صورت حال نے تعلیم کو نئی مشکلات اور نئے مسائل سے دو چار کر دیا ہے - چونکہ صنعت و حرفت وغیرہ کے معمولی مشاغل میں شخصی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع تقریباً مفقود ہو گئے ہیں اس لئے اکثر عمدہ عادتیں اور صنعتیں جو مدرسے کی تعلیم کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں بہت سے پیشوں کے ناساز گار ماحول میں ضائع ہو جاتی ہیں - تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ طلبہ میں جدت ، تجسس اور اپج کا مادہ ابھارے لیکن بچارے کارخانوں کے مزدوروں کو اپنے روز مرہ کے مشاغل میں ان چیزوں سے کیا مطلب ؟ ان کا وقت تو ایسے کاموں میں صرف ہوتا ہے جس سے نہ دماغ کی تربیت ہو سکتی ہے نہ روح کی - انسان کی نفسی ترکیب میں بے شمار عناصر شامل ہیں جن میں سے بعض جسمانی نشو و نما چاہتے ہیں ، بعض ذہنی جد و جہد کی طرف راغب ہیں ، بعض مشاہدہ حقیقت اور نظارہ جمال کے جویا ہیں- لیکن اس قسم کے مشین نما کام میں ان میں سے کسي خواهش کی تشفي بھي نہیں ہو سکتي اور انسان کی شخصیت پست اور محدود

ھوکر رہ جاتی ھے - اسپرانگر (Spranger) لکھتے ھیں :—

"اب اگر ھم موجودہ زمانے میں پیشے کی زندگی کی خارجی ترکیب پر غور کریں تو ھمیں یہ دیکھکر افسوس اور رنج ھو گا کہ ھر پیشے میں ، خصوصاً اقتصادی پیداوار کے کاموں میں اس عین پسندی (idealism) کی کس قدر کم گنجائش ھے - یہ شکایت کہ صنعتی کاروبار تخصیص پسندی اور مشین پرستی کے سبب سے روحانیت سے خالی ھو گئے ھیں ایک نغمہ دلدوز ھے جو ھمارے آھنگ تمدن میں نشید اجل کی طرح سنائی دیتا ھے .... مختصر یہ ھے کہ صنعتی پیداوار کے اکثر شعبوں میں انسان اور اس کے کام میں کوئی زندہ اور معنوی کلّی رابطہ باقی نہیں رھا ھے محض اس لئے کہ ایک انسان سے کوئی پورا کام نہیں لیا جاتا" [۱] -

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے اول تو صنعت و حرفت کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ھے کہ جو کام بالکل میکانکی ھیں یعنی جن میں صرف ایک مقرّرہ حرکت درکار ھے ان کو مشینوں ھی کے ذریعہ انجام دیا جائے تاکہ لوگوں کی زندگی اور وقت ان کے لئے وقف نہ ھو جائے - یہ ایک وسیع تمدنی اور عملی مسئلہ ھے جس کا تعلیم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں - البتہ تعلیم کا یہ فرض ضرور ھے کہ طلبہ کی علمی اور دماغی تربیت اس طرح کرے کہ وہ آئندہ زندگی میں اپنے محدود کاموں کی غیر محدود اھمیت کو سمجھ سکیں - خواہ ان کے ذمہ محض اتنا ھی کام ھو

---

[۱] صفحہ ۲۳۸

کہ مشین کے ذریعہ سوئی کے ناکے میں سوراخ کریں پھر بھی ان کو کارخانے کے پورے نظام سے واقفیت اور تمدنی زندگی میں اس کی اہمیت کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ کولھو کے بیل کی طرح کام نہ کریں بلکہ یہ سمجھ سکیں کہ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں ایک ضروری خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس قسم کی خدمتوں کی انجام دہی پر معاشرے کے پیچیدہ نظام معاش اور کاروبار کا دارومدار ہے - جو مزدور اور کاریگر اس حقیقت کو سمجھکر اپنا فرض انجام دیتا ہے ، جو خاکروب صفائی کے کام کی وقعت اور تمدنی اہمیت کا علم رکھتا ہے ، اس کے لئے اس کا کام اسی معنی میں متبرک ہو جاتا ہے جس معنی میں کارلائل (Carlyle) نے کہا تھا کہ "ہر قسم کا سچا کام متبرک ہے......جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے کوئی اور برکت طلب کرنے کی حاجت نہیں"- لہذا تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لئے طلبہ کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اہمیت سے آگاہ کر کے انھیں ان کی نظر میں معنی خیز بنائے اور ان میں یہ بات پیدا کردے کہ پیشے کی زندگی میں بھی اعلیٰ مقاصد اور عین پسندی کو ہاتھ سے نہ دیں ، محض مشین بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اپنی فطرت کی پوری بلندی اور وسعت کو حاصل کر سکیں - اس لحاظ سے ہماری موجودہ تعلیم جو محض رسمی علوم و فنون تک محدود ہے اور تمدن کے زندہ مسائل سے ان کا ربط ظاہر نہیں کرتی، بلکل نا قابل اطمینان ہے - وہ نہ صرف طلبہ کو معاشی نظام سے نا واقف رکھتی ہے بلکہ ان میں عملی کاموں کی صلاحیت کو بھی مردہ کر دیتی

ھے - محنت اور ھاتھ کا کام کرنے کے خلاف ان میں ایک تعصب پیدا ھو جاتا ھے جو آگے چل کر ان کو بہت تکلیف پہنچاتا ھے اور معاش کی بہت سی راھیں ان پر بند کر دیتا ھے -

مندرجہ بالا بحث کا تعلق زیادہ تر نوجوانوں کی تعلیم سے ھے - جیسا ھم اوپر بتا چکے ھیں بچوں کی تعلیم کو اس مسئلہ سے براہ راست زیادہ تعلق نہیں - بچپن میں طلبہ کی دلچسپی اور شوق کو تتلی کی طرح ایک جگہ قرار نہیں ھوتا - ان کی توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ھوتی رھتی ھے - بچہ اپنی بڑھتی ھوئی شخصیت کے لئے نئے تجربے اس طرح حاصل کرتا ھے کہ کبھی وہ ایک شخص کا پارٹ کرتا ھے کبھی دوسرے کا - کبھی انجن ڈرائیور بنتا ھے تو کبھی ڈاکٹر ' کبھی بچوں کو پڑھاتا ھے تو کبھی گھوڑا بن کر ایک خیالی گاڑی کھینچنے لگتا ھے گویا بقول ورڈزورتھ (Wordsworth) کے " اس کا کام یہی ھے کہ ھمیشہ نیا بھروپ بھرتا رھے" - اس کی کام کرنے کی خواھش جو آگے چل کر کوئی پیشہ اختیار کرنے کے ارادے میں تبدیل ھو جاتی ھے ' مختلف کھیلوں اور نقلوں کی شکل میں ظاھر ھوتی ھے - بچوں کے کھیلوں اور ان کے پیشوں کے شوق میں جو تعلق ھے اس کے بارے میں پروفیسر اسپرانگر (Spranger) جن کی رائے ھم نے اوپر بیان کی ھے لکھتے ھیں :—

> " بچے جو پیشے کے خواب دیکھتے ھیں ان پر کھیل کا اور نقل کا رنگ غالب ھوتا ھے لیکن ان کھیلوں میں نہ صرف گہرے معنی ھوتے ھیں بلکہ ایک مخفی قوت تشکیل بھی جو بڑی گہری اھمیت رکھتی

ھے - اس میں شک نہیں کہ پیشوں کے جو کھیل
بچے کھیلتے ھیں ان میں سے بعض عہد طفلی سے
مخصوص ھیں اور ان سے آئندہ ارادے کا پتہ نہیں
چلتا - بعض پیشے ھر بچے کو متوجہ کرتے ھیں
کیونکہ وہ عہد طفلی کی جبلی زندگی سے مناسبت
رکھتے ھیں یا ان میں آئندہ زندگی کے اھم پہلو
نمایاں ھوتے ھیں - مثلاً سپاھی یا کوچبان یا
سوداگر بننا ' عمارت یا دوسری چیزیں بنانا ' شکار
یا صیادی ' گھوڑے کی سواری ' شمشیر زنی اور
نشانہ بازی آئندہ زندگی کی عام ضروریات میں سے
ھیں - اس لئے اگر بچے کو ان کا شوق ھو تو ھم یہ
نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ وہ آئندہ چل کر ان میں
سے کسی چیز کو اپنا پیشہ بنائے گا " [۱]

لیکن بچہ منزل طفولیت اور شباب کی پہلی منزل سے گزر کر شباب کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ھے تو وہ ان نقلی مشاغل پر قانع نہیں رھتا - اب معاش کا مسئلہ درپیش ھوتا ھے یعنی اسے کوئی پیشہ اختیار کرنے کی خواھش اور ضرورت ھوتی ھے - اس کی بڑھتی ھوئی قوتیں عملی زندگی کے ساتھہ نبردآزمائی کرنا چاھتی ھیں - وہ یہ جاننا چاھتا ھے کہ اس کے گردوپیش دنیا میں کیا کیا کام ھوتے ھیں اور وہ ان میں سے کس کام کے لئے زیادہ موزوں ھے - اس کے شوق جو چند سال پیشتر نچلے نہیں بیٹھتے تھے اب کسی ایک مرکز کے گرد جمع ھونے شروع ھوتے ھیں - وہ محسوس

[۱] صفحہ ۲۵۲

کرنے لگتا ہے کہ اس کی طبعیت کو زیادہ لگاؤ ادبی مشاغل سے ہے ' یا سائنس سے ' یا عملی کاروبار سے - اس کا ذاتی مطالعہ ' اس کی دلچسپیاں اس کے فرصت کے مشاغل یہ سب اسی چیز کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں جس کی طرف اسے خاص رجحان ہے - بالفاظ دیگر آئندہ پیشہ کی جھلک ابھی سے اس کی درسی زندگی پر اپنا اثر ڈالنا شروع کرتی ہے اور وہ بالعموم انہیں مضامین اور مشاغل کا انتخاب کرتا ہے اور انہیں پر زیادہ توجہ اور شوق صرف کرتا ہے جو اس کے نزدیک اس کی آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہونگے اور اسے اس کی منزل مقصود کی طرف لے جاتے ہیں - میرا یہ مطلب نہیں کہ واقعاً ہمارے ملک میں تمام نوجوانوں کی عملی اور ذہنی دلچسپیوں کا ارتقا اسی طریقہ پر ہوتا ہے - بدقسمتی سے ہمارے یہاں ان میں سے اکثر کو یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانوں کے مطابق اپنے لئے کوئی شغل زندگی اختیار کریں - مدرسے سب کو ایک ہی قسم کی کتابی تعلیم دے کر ایک اندھیری گلی میں چھوڑ دیتے ہیں - اس میں جو راستہ بھی مل جائے وہ اسی کو اختیار کرلیتے ہیں خواہ وہ ان کے فطری میلانات کے لحاظ سے مناسب ہو یا نہ ہو - لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اگر بچوں کی ابتدائی تعلیم صحیح اصول پر ہو اور عہدشباب میں نوجوانوں کے شوقوں اور جبلتوں کی پرورش مناسب طریقہ پر کی جائے تو وہ ثانوی یا اعلیٰ مدارس میں پہنچ کر یقیناً بعض خاص مشاغل کی طرف زیادہ مائل ہونگے اور اپنی علمی اور عملی دل چسپیوں سے ظاہر کردینگے کہ ان کا فطری میلان کس طرف ہے - یہ تو مشکل ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں کہ

طالب‌علم صحیح اور قطعی طور پر بتا سکے کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے گا - اس کے لئے تجربے کی پختگی اور خودشناسی درکار ھے جو ابھی اسے میسر نہیں آسکتی - واقعہ یہ ھے کہ مناسب پیشے کا انتخاب نہایت مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ھے جس کے لئے ماھرین علم النفس اور والدین دونوں کی مدد درکار ھے - اس غرض کے لئے بعض ترقی یافتہ ممالک میں جابجا ایسے ادارے قائم کئے گئے ھیں جو پیشوں کے انتخاب میں نوجوانوں کی رھنمائی کرتے ھیں اور وھاں اس سلسلے میں بہت سے مفید مشاھدات اور تجربات ھوئے ھیں - ان سے ظاھر ھوتا ھے کہ بلوغ کے زمانے میں نوجوانوں کو اپنے مستقبل کے مشغلے اور پیشے کی بڑی فکر ھوتی ھے اور اگر ھم یہ چاھتے ھیں کہ نوجوان اپنی تمام دماغی جدوجہد اور توجہ تعلیم کی طرف مبذول کریں تو ان کی تعلیم میں پیشے کے رجحان کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ھے - محض نظری رسمی تعلیم جو ان کے نزدیک نہ ان کی موجودہ زندگی اور ضروریات کے لئے موزوں ھے نہ انہیں مستقبل کے لئے تیار کرتی ھے ھرگز یہ کشش نہیں رکھتی کہ وہ دل و جان سے اس میں محو ھو جائیں - اس سے ھمارا یہ مطلب نہیں کہ طلبہ کو قبل از وقت عام تعلیم سے ھٹا کر پیشوں کی تعلیم دلائی جائے کیونکہ یہ طریقۂ عمل نہ صرف ان کے شخصی ارتقا کے لئے مضر ھوگا بلکہ ان کی اقتصادی کارکردگی کو بھی یقیناً کم کردے گا - جو شخص اپنے بچپن اور نوجوانی میں عمدہ ادبی اور علمی تعلیم سے محروم رھتا ھے اس کی دماغی قوتیں پوری طرح نشوونما نہیں پاتیں - خواہ وہ کوئی شغل اختیار کرے اسے اس میں پوری کامیابی اور کمال حاصل نہیں ھو

سکتا - بعض لوگ ، خصوصاً وہ جن کا تعلق براہ‌راست کاروبار سے اور اقتصادی پیداوار کے کاموں سے ہے ، عام ادبی تعلیم کو بچوں اور نوجوانوں کے لئے غیر مفید سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وقت اور روپیہ کی کفایت کر کے جلد سے جلد بچوں کو کوئی " کام کی چیز" سکھادی جائے تا کہ وہ زیادہ وقت پیشے میں مہارت حاصل کرنے اور روزی کمانے میں صرف کر سکیں - اس خیال کی محرّک جس حدتک وہ بے اطمینانی ہے جو سمجھدار لوگوں کو ہمارے ملک کی کتابی اور نظری تعلیم سے ہے ہمیں اس سے ہمدردی ہے اور ہر شخص جو علمی دل‌چسپیوں کے علاوہ دنیا کے حالات اور ضروریات سے بھی واقفیت رکھتا ہے اس خیال کی تائید کرے گا کہ ہماری موجودہ تعلیم طلبہ کو اس زندگی کے لئے بخوبی تیار نہیں کرتی جو ان کو پیش آنے والی ہے - لیکن اس خیال کا وہ پہلو جو عام عقلی تعلیم و تربیت کو مضر اور فضول سمجھتا ہے اور اس کو بند کر کے وقت اور روپئے میں کفایت چاہتا ہے سراسر ناواقفیت اور تنگ نظری پر مبنی ہے - یہ کفایت اگر کی جائے تو آگے چل کر قوم کو بہت گراں پڑجائے گی - اس طرح یہ تو ممکن ہے کہ ہم ملک میں ایک بڑی تعداد معمولی کاری‌گروں اور پیشہ‌وروں کی مہیا کرسکیں جو لکیر کے فقیر بن کر ایک مقررہ راستے پر چلتے رہیں اور اپنے محدود دائرۂ عمل میں کافی مہارت پیدا کرلیں - لیکن قوم میں موجد اور مخترع، محقق اور نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں ہو سکتے جن کے بغیر کوئی ملک صنعت و حرفت کے سرگرم مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا - جب تک تمام لوگوں کو یہ موقع نہ ملے گا کہ وہ بہترین علوم و فنون اور خیالات کے مطالعے سے اپنی ذہنی قوتوں کو بیدار کریں اس وقت

تک غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے لوگ بھی اپنے جوہر کا اظہار نہیں کر سکینگے - اس کے بغیر نہ تو معاشرتی زندگی کے رہبر پیدا ہو سکتے ہیں نہ صنعت و حرفت کے ہر اول - یہ ضروری نہیں کہ وہ سب لوگ جو عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ‌ور ہوں قوت ایجاد کا اظہار کریں - لیکن کون کہ سکتا ہے کہ اگر ہم ایک ہزار طلبہ کو تعلیم دے کر نو سو ننانوے معمولی ذہانت کے محنتی اور ایماندار کام کرنے والے اور ایک غیر معمولی ذہانت کا موجد پیدا کر سکیں تو یہ دراصل بہت بڑی کفایت نہ ہو گی ؟ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی شخص اپنی خدا داد قابلیت کی بنا پر علم اور صنعت و حرفت میں ایسی کایاپلٹ کردے کہ باقی تمام کام کرنے والوں کی کارگزاری کئی گنی بڑھ جائے - جس شخص نے بھاپ کی قوت کو انسان کا مطیع بنایا اور اس کو مشینیں چلانے میں استعمال کیا اس نے نوع انسانی کی کارکردگی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ! لہذا عام تعلیم کا عمدہ انتظام کرنا نہ صرف ان اعلیٰ انسانی مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے جن کا ہم مختصراً گزشتہ باب میں ذکر کرچکے ہیں بلکہ کاروبار اور حصول معاش کے نقطہ نظر سے بھی مفید ہے - لیکن شرط یہی ہے کہ "عام تعلیم" اس قدر "عام" نہ ہو جائے کہ اس کو طالبہ کی نفسی کیفیات اور دنیا کی عملی ضروریات سے کوئی تعلق ہی نہ رہے اور وہ محض نظری اور کتابی مطالعے میں محصور ہو کر رہ جائے - یہاں بھی صحیح راستہ اعتدال کا، مختلف مطالبات کے درمیان توازن پیدا کرنے کا راستہ ہے - یعنی نہ تو ہمیں قبل ازوقت پیشے کی مخصوص تعلیم شروع کرنی چاہئے اور نہ عام تعلیم کے زمانے میں بچوں اور نوجوانوں کو دنیا کے عملی اور مادی مشاغل سے اس قدر

بے تعلق اور بے نیاز کردینا چاھئے کہ وہ ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی قسم کے کاروبار کے قابل ھی نہ رھیں اور انھیں محض یہ خواھش ھو کہ کسی دفتر میں محرری یا ملازمت اختیار کرلیں -

پیشے کی بحث میں ایک نہایت اھم سوال جس کی حیثیت ایک قدیم تاریخی مسئلہ کی ھو گئی ھے یہ ھے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا صحیح مفہوم کیا ھے اور آیا یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور مختلف ھیں یا ان میں ربط اور تعلق کا امکان ھے - قدیم نقطۂ نظر تو یہی ھے کہ ان دونوں کے مقاصد بالکل جداگانہ ھیں اور ھم دونوں کو کسی طرح جمع نہیں کرسکتے - لیکن ھمیں یہ یاد رکھنا چاھئے کہ بہر حال دونوں قسم کی تعلیم ایک ھی شخص کو دی جاتی ھے گو ان کا زمانہ مختلف ھو اور دونوں ایک ھی نظامِ تعلیم کے جزو ھیں - اس لئے ھم اپنے نقطۂ خیال کے بموجب کسی ایسے نظرئے سے مطمئن نہیں ھو سکتے جو ھمارے نظام تعلیم کے مختلف عناصر کو ایک سلسلے میں منسلک نہ کرے اور ان سب کو ان کے مشترک موضوع یعنی انسان کی شخصیت کی نشو و نما کا ذریعہ نہ بنائے - لہذا ھم ان الفاظ پر غور کر کے پہلے ان کے صحیح مفہوم کا تعین کرینگے اور اس کے بعد بتائینگے کہ ان دونوں میں اتحاد مقاصد کس صورت میں ممکن ھے -

مدرسوں میں جو تعلیم بالعموم رائج ھے وہ عام تعلیم کہلاتی ھے - یہ طلبہ کو براہ راست کسی پیشے کے لئے تیار نہیں کرتی - اس لئے کہا جاتا ھے کہ اس کا مقصد ھے طلبہ کی سیرت کی تربیت ، ان کی ذھنی قوتوں کو بیدار کرنا ، اُن میں تہذیب نفس پیدا کرنا - چونکہ یہ تعلیم روزی کمانے میں مدد نہیں دیتی اس لئے اس کو غیر افادی

تعلیم بھی کہا جاتا ھے لیکن اس کے حامی اس اصطلاح کو کسی برے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ فخر اور تعریف کے طور پر کہتے ھیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان شرفا کے لئے ھے جنھیں بوجہ اپنی خوش حالی کے کسب معاش کی ضرورت نہیں ، محض ذھن کی تربیت اور اخلاق کی جلا درکار ھے -

بر خلاف اس کے صنعتی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ھے وہ براہ راست طلبہ کو کسی خاص شغل یا پیشے کے لئے تیار کرتی ھے - وہ محدود مادّی معنوں میں " افادی " ھے اور عام طور پر ان لوگوں کے لئے ضروری سمجھی جاتی ھے جو اعلیٰ تعلیم پانے کی مقدرت نہیں رکھتے اور جن کے لئے ضروری ھے کہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے لگیں - لوگ بالعموم " غیر افادی " تعلیم کو " افادی " تعلیم پر ترجیح دیتے ھیں اور " افادی " تعلیم کو مقابلتاً کم تر اور حقیر سمجھتے ھیں - لیکن واقعہ یہ ھے کہ یہ سب خیالات غلط فہمی پر مبنی ھیں جس کے بہت سے تاریخی اسباب ھیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - یہ اسباب ایک طرف اس دوئی سے تعلق رکھتے ھیں جو فلسفہ اور انسانی عقائد کی تاریخ میں مدت سے چلی آتی ھے جس کی وجہ سے ھم بالعموم دنیا کے تمام امور اور مسائل کو بجائے ایک کل کی صورت میں دیکھنے کے دو متضاد حصوں میں منقسم سمجھتے ھیں - چنانچہ لوگ ھمیشہ انسانی زندگی کے لازمی اجزا یعنی علم و عمل ، عالم معقول اور عالم محسوس ، فرصت کے مشاغل یعنی فنون لطیفہ اور کام کے مشاغل یعنی دستکاری میں ایک حد فاصل کھینچتے آئے ھیں - ان کا خیال یہ رھا ھے کہ وہ تعلیم جو لوگوں کو نظری علوم سکھائے ان کو غور و فکر کی زندگی کے لئے تیار کرے ، ان میں

فنون لطیفہ کا مذاق پیدا کرے بجائے خود مکمل ہے اور اس تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے جو عملی مشاغل اور مادی علوم سکھاتی ہے اور لوگوں کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کے لئے تیار کرتی ہے - وہ انسان کی زندگی اور ضروریات پر ایک مجموعی اور ہمہ گیر نظر نہیں ڈال سکتے بلکہ اس کو بالکل دو جدا گانہ شعبوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کی علیحدہ قدر و قیمت مقرر کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جب تک ان دونوں میں اشتراک عمل نہ ہو متمدن اور مہذب معاشروں کا قیام ہی ممکن نہیں - اس خیال کی دوسری وجہہ جیسا کہ موجودہ زمانے کے بہت سے مفکرین اور تعلیم کے میدان میں بالخصوص پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی تصانیف میں ثابت کیا ہے بعض اقتصادی اور معاشرتی حالات ہیں جنھوں نے صدیوں سے انسانی سوسائٹی کو دو جماعتوں میں تقسیم کردیا ہے - وہ جماعت جس کو ہر قسم کی اقتصادی سہولیتیں حاصل رہی ہیں اور معاش کی جد و جہد سے فرصت نصیب ہے اپنی فرصت کے اوقات میں کتابی اور نظری علوم کی تحصیل کرتی رہی - اس نے اپنی پسند کے علوم اور مشاغل کو ان تمام علوم پر فوقیت دی جو صنعت و حرفت کے کار و بار سے یا مادی اشیا کے بنانے اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں - چونکہ ان لوگوں کو خود ہاتھہ سے کام نہیں کرنا پڑتا تھا اس لئے انہوں نے ان تمام مشاغل کو حقیر جانا جن میں ہاتھہ کا کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صنّاعیوں کو بھی نظری علوم مثلاً فلسفہ، منطق، اور ریاضی وغیرہ سے کم درجے کا قرار دیا - انہیں لوگوں نے اپنے محبوب خیالات اور تصورات کو مروجہ فلسفہ کا جزو بنا دیا اور اسی

کا نتیجہ ہے کہ آج تک تعلیم میں وہ فرق نمایاں ہے جو نظری علوم اور عملی مشاغل میں کیا گیا تھا -

جہاں تک ہمارے موجودہ نظام تعلیم کا تعلق ہے عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا - ہمارے یہاں کی " عام تعلیم " جس کو پیشے کی تعلیم سے علحدہ اور بر تر سمجھا جاتا ہے در اصل بہت تنگ اور محدود معنی میں پیشے کی تعلیم ہے - کیونکہ ہمارے مدارس طلبہ کو ایک خاص قسم کی کتابی تعلیم دیتے ہیں جو اُن کو سوائے چند مخصوص پیشوں مثلاً دفتروں کی نوکری یا قانون یا تعلیمی ملازمت کے اور کسی لائق نہیں بناتی - اس سے ذہنی قوتوں کی عام تربیت اور بیداری کا مقصد حاصل نہیں ہوتا گو اس کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ طلبہ کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے - لیکن جن لوگوں کو اصول تعلیم اور طلبہ کی نفسی ارتقا کے اصولوں سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی طریقے اس درجہ ناقص اور امتحانوں کے تابع ہیں کہ طلبہ کے ذہنی رجحانات اور قوتوں کی نشو و نما کی طرف توجہ کرھی نہیں سکتے - واقعہ یہ ہے کہ پیشہ آموزی کے نقطۂ نظر سے اس تعلیم میں اور تجارتی یا زراعت یا انجینری کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں - دونوں کے مقاصد، خواہ ان کا دعویٰ کچھ بھی ہو، تنگ اور محدود ہیں - فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ بعض نوکریوں کے لئے طلبہ کو تیار کرتی ہے اور یہ بعض دست کاریوں اور عملی فنون کے لئے - لہذا اس روایتی اختلاف کو نظر انداز کرکے ہمیں دیکھنا چاھئے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے اپنی اپنی جگہ پر کیا فوائد ہیں اور دونوں کے ذریعہ ذہنی تربیت اور بیداری کے اسباب مہیا ہوسکتے ہیں یا نہیں - موجودہ تعلیمی نظرئے کا دعویٰ یہ ہے کہ پیشے کی تعلیم کو حقیر سمجھنا

غلطی ہے کیونکہ اس میں ایسے امکانات موجود ہیں کہ اگر ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کو دانشمندی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ ذہنی تربیت اور تہذیب نفس میں بھی معین ہوسکتے ہیں - نفسیاتی تحقیقات نے اس امر کو ثابت کردیا کہ ذہنی عمل اور دست کاری میں بنفسہ کوئی تضاد نہیں اور یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی فن یا ہنر کے سیکھنے میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے تو وہ ذہنی تربیت کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا - اِس غلط خیال کا اثر نہ صرف فنی تعلیم کے مسائل میں نظر آتا ہے بلکہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مدارس کے نصاب کی بحثوں میں بھی نمایاں ہے - اکثر ملکوں کے تعلیمی نظام پر صدیوں یہ غلط فہمی حاوی رہی ہے کہ لڑکوں کی تعلیم میں نجاری ' پارچہ بافی اور مختلف قسم کی دست کاریوں اور فنون کو داخل کرنے سے یا لڑکیوں کی تعلیم میں امور خانہ‌داری ' کھانا پکانا ' گھر کی درستی اور صفائی کپڑوں کی سلائی وغیرہ کو اہمیت دینے سے ہم اس کو ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے ناقص بنادینگے اور طلبہ کو ان چیزوں کا سکھانا معلم کے بلند اور اعلیٰ فرائض سے فرو تر ہے - یہ قدیم تعصب آج تک پوری طرح دور نہیں ہوا اور ہندوستان میں خاص طور پر پھیلا ہوا ہے - اس بارے میں پروفیسر ڈیوئی کی رائے غور طلب ہے -

" اگر کسی نئے ہنر کے سیکھنے سے طالب علم بہت سے نئے خیالات سے روشناس اور متاثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خود انسانی زندگی کے مقصد اور منشا پر روشنی پڑتی ہے تو اس کو یقیناً علمی لحاظ سے بہت قابل وقعت سمجھنا چاہئے - حقیقت میں ہر فن اور ہنر کی علمی قدر کا معیار

یہی ہے کہ آیا وہ فن طالب علم کی دلچسپیوں کا
حلقہ وسیع کرتا ہے اور نئے حل طلب مسائل اور
بحث مباحثے کے مواقع پیدا کرتا ہے یا نہیں
[۱]"

ممکن ہے کہ غلط اصولوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے صنعت اور دستکاری کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ اس سے نہ طلبہ کی دلچسپیوں میں وسعت پیدا ہو، نہ ان میں ذہنی کاوش اور جدوجہد کا ملکہ بیدار ہو، نہ زندگی کے منشا پر کوئی روشنی پڑے بلکہ انسان محض نقل اور مشق کے ذریعے مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص کام کرنا سیکھ لے - لیکن یہ بات کچھ صنعتی تعلیم ہی پر موقوف نہیں - نظری اور کتابی تعلیم کی بھی یہ صورت ہو سکتی ہے - ممکن ہے (بلکہ بالعموم ہوتا یہی ہے) کہ استاد طلبہ کو مختلف علوم اس طرح پڑھائے کہ سوائے حافظے کے ان کی اور کوئی دماغی قوت کام میں نہ آئے اور وہ باوجود اعلیٰ امتحانات پاس کرلینے کے دماغی نشو و نما کے ابتدائی مدارج سے آگے نہ بڑھ سکیں - لہذا اصلی فرق طریقۂ تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے مضامین کی نوعیت کو اس میں زیادہ دخل نہیں - اگر مدرسوں میں عملی مضامین کی تعلیم یعنی ان مضامین کی جن کا رجحان پیشہ آموزی کی جانب ہے اس طرح دی جائے کہ اس کے دوران میں طلبہ نئے نئے مسائل سے دو چار ہوں جن کو حل کرنے کے لئے جسمانی اور دماغی کاوش کی ضرورت ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ تمدنی زندگی کے وسیع تر اغراض ومقاصد سے ان کا کیا تعلق ہے تو یہ مضامین بھی علمی اور معاشرتی اعتبار سے

---

[۱] Dewey : Democracy and Education

ایسے ہی قابل قدرثابت ہونگے جتنے خالص علمی مضامین - بلکہ ہمارے خیال میں مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی ' جو بیشتر آمور تعلیم ذہنوں میں دی جاتی ہے ' یہی اصول کارفرما ہے -

اس بحث سے عام تعلیم کے مسئلے پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اس سے بعض مفید نتائج مترتب ہوتے ہیں جن کو ماہرین تعلیم نظر انداز نہیں کر سکتے - نوجوانوں کی نفسی ارتقاء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدرسوں کی نظری اور کتابی تعلیم ان کی مکمل تربیت اور اُن کی شخصیت کی نشو و نما کی ضامن نہیں ہو سکتی - بہت سے نوجوانوں کی دلچسپیاں اور جبلی شوق زیادہ تر عملی ہوتے ہیں - ان کو یہ تعلیم بےکار اور مصنوعی معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ان کے عملی شوقوں کو اظہار کا موقع نہیں دیتی - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ کو اس پر صرف نہیں کرتے ' اس کے مقاصد کو اپنا نہیں بناسکتے ' اس کے مشاغل اور درس و تدریس میں اپنی شخصیت اور مخصوص ذاتی رجحانات کے اظہار کا موقع نہیں پاتے - ان نوجوانوں کے لئے تو خالص نظری تعلیم صریحاً بے سود ہوتی ہے - لیکن باقی طلبہ میں بھی اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت پر گو عملی دلچسپیاں حاوی نہ ہوں پھر بھی ان کی زندگی کا ایک اہم جزو ضرور ہوتی ہیں - ان سب کے لئے اس نازک اور اہم دور میں پیشے کا تصور اور اس کی طرف رہنمائی کرنے والے مشاغل بہت کشش رکھتے ہیں اور مفید ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ انہیں اپنے بہت سے نئے تجربات اور خیالات کا مرکز بنا سکتے ہیں - اگر معلم اس امر کی احتیاط رکھے کہ ان مشاغل کی وجہہ سے نوجوانوں کی نظر اور ان کی ذہنی دل چسپیاں تنگ اور محدود نہ ہونے پائیں

تو ہم تعلیم میں اس عنصر کو شامل کر کے ان کی تخلیقی قوتوں کو دعوت عمل دے سکتے ہیں جو موجودہ حالات میں نامناسب ماحول کی وجہہ سے مرجھا کر رہ جاتی ہیں -

ہم نے جو مفہوم پیشے کی تعلیم کا پیش کیا ھے وہ اس مفہوم سے جو عام طور پر سمجھا جاتا ھے بہت زیادہ وسیع ھے - ہماری مراد اس سے محض یہی نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام یا صنعت سکھادی جائے مثلاً ایک آدمی کو درزی ' دوسرے کو جلاھا ' تیسرے کو انجینیر ' چوتھے کو معلم بنا دینے سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا - کسی شخص کو دنیا میں صرف وہی ایک کام کرنا نہیں ہوتا جس کی علت غائی حصول معاش ہو بلکہ اس کے اور بھی بہت سے کام اور فرائض ہوتے ہیں - اگر درزی کا پیشہ یہ ھے کہ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اپنی روزی پیدا کرے تو اس کا دوسرا " پیشہ ' یہ ھے کہ وہ اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت اور آسائش کا اہتمام کرے - اس کا تیسرا " پیشہ " یہ ھے کہ وہ اپنے گردو پیش کے لوگوں ' اپنے شہر یا گاؤں کے رہنے والوں کے حقوق ادا کرے اور اس پر جو تمدنی فرائض بحیثیت معاشرے کے ایک رکن کے عائد ہوتے ہیں ان کو پورا کرے یعنی لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ہو ' اپنی بساط کے موافق ان کی امداد کرے، ہر قسم کی اصلاحی تحریکوں کا ساتھہ دے اور خراب رسموں اور روایتوں کو دور کرنے کی کوشش کرے - لہذا ہر شخص صرف ایک ہی پیشہ نہیں رکھتا بلکہ بہت سے پیشے رکھتا ھے جن میں سے ہر ایک کے خاص فرائض اور ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنا اس پر فرض ھے - وہ یہ نہیں کرسکتا کہ صرف ایک پیشے کو جس کا تعلق حصول معاش سے ھے اپنی توجہہ اور جدوجہد کا مرکز بنالے اور باقی سب

کی طرف سے غافل رہے - اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی شخصیت اور
اس کی ترقی کے امکانات بہت محدود ہو کر رہ جائیں گے اور وہ نہ
خود کامیابی حاصل کر سکے گا نہ معاشرے کے لئے مفید ثابت ہو گا -
اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا معاشی پیشہ " وہ مخصوص
گوشہ " ہوتا ہے جہاں سے وہ ' بہ قول اشپرانگر (Spranger) کے " دنیا
کا مشاہدہ کرتا ہے " اور ایک لحاظ سے وہی اس کی روز مرہ کی
جدو جہد اور سوسائٹی کی خدمت کا مرکز بن جاتا ہے - لیکن وہ مرکز
جس کے گرد کوئی دائرہ نہ ہو بالکل بے معنی اور مہمل ہوتا ہے -
اور اس کی معاشی جدوجہد کا صحیح منشا اور مفہوم بھی اس وقت
واضح ہوتا ہے جب وہ اس کو معاشرتی زندگی کے وسیع تر مقاصد کے
ساتھ ربط دیتا ہے - جس قدر کسی شخص کے معاشرتی تعلقات زیادہ
ہوتے ہیں ' اس کی تعلیم اعلیٰ ہوتی ہے ' اس کے عمل کا دائرہ وسیع
ہوتا ہے ' اسی نسبت سے اس کے فرائض اور " پیشے " بھی زیادہ ہوتے
ہیں - اس کو مقامی ' ملکی اور بعض اوقات بین الاقوامی معاملات
میں دلچسپی اور حصہ لینا پڑتا ہے ' اپنے حقوق سے مناسب طریقے پر
فائدہ اٹھانا اور فرائض کو مناسب طریقے پر انجام دینا پڑتا ہے - وسیع
انسانی نقطہ نظر سے پیشہ‌ورانہ تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو ان
تمام پیشوں اور فرائض کے لئے تیار کیا جائے تاکہ وہ محض اقتصادی
پیداوار کا ایک آلہ نہ بن جائے بلکہ ایک مفید اور کارکن شہری اور ذمہ‌دار
فرض شناس انسان ثابت ہو -

یہ ہے پیشے کی تعلیم کا وسیع مفہوم - لیکن اگر ہم اس کے
محدود اور معروف معنی پر غور کریں تو اس کے لحاظ سے بھی اس کا
مفہوم یہ نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام سکھا دیا جائے اور بس -

ضرورت اس بات کی ھے کہ تمام کام کرنے والوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ ذھنی تربیت اور بیداری کے ان مواقع اور امکانات سے فائدہ اتھا سکیں جو زمانۂ حال کی صنعت و حرفت کے نظام میں موجود ھیں - ممکن ہے بعض سرے سے اس کے قائل نہ ھوں کہ اس مشین کے عہد میں صنعت و حرفت کے مشاغل میں اس قسم کے کوئی امکانات پائے جاتے ھیں - ھم نے خود بھی اوپر اس بات کو تسلیم کیا ھے کہ عام لوگوں کے موجودہ مشاغل سے وہ عنصر مفقود ھوگیا ھے جو ان کی شخصیت کی تربیت میں مدد دیا کرتا تھا - لیکن اصل میں صورت حال یہ ھے - کہ اتھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد سے کام کی نوعیت بدل گئی ھے - یہ سچ ھے کہ موجودہ حالات میں اکثر لوگوں کو نہ اپنے کام میں کوئی دل چسپی ھے ' نہ اس کے نتائج اور عام اثرات سے واقفیت - لیکن اس کی وجہ یہ ھے کہ صنعتی انقلاب سے فائدہ اتھانے کے لئے تعلیم میں جو تبدیلیاں ھونی چاھئے تھیں وہ نہیں ھوئیں - زمانۂ حال کے صنعتی کاروبار میں سائنس کو بہت زیادہ دخل ھوگیا ھے بلکہ یوں کہنا چاھئے کہ اس کی بنیاد تمام تر سائنس ھی پر قائم ھے - اس وجہ سے پہلے کی نسبت اس میں علمی اور عقلی عنصر بہت بڑہ گیا ھے یعنی اسے سمجھداری اور قابلیت سے انجام دینے کے لئے بہتر اور وسیع تر تعلیم کی ضرورت ھے - موجودہ صنعتی نظام کا اثر تمدنی ترقی پر پڑا ھے اور اس کا جو تعلق انسان کی فلاح اور خوش‌حالی سے ھے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ذھنی بیداری اور ھمہ گیر دل چسپی درکار ھے - یہ بات اسی وقت حاصل ھوسکتی ھے جب نظام تعلیم میں ایسی اصلاح کی جائے کہ وہ کاری گروں' مزدوروں اور مشین چلانے والوں کو ان نئے تعلقات اور حالات کے لئے تیار کرے - کوئی کاری‌گر جس کو ابتدائی

تعلیم اور ذاتی مطالعے نے یہ نہیں سکھایا کہ سائنس کی حیرت انگیز نشو و نما اور وسائل آمد و رفت کی ترقی نے جماعتوں اور قوموں اور ملکوں کو ایک نئے مضبوط اور قریبی رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور لوگوں کے مفاد اور مقاصد میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کردی ہے یا کم از کم اس کے پیدا ہونے کا امکان بڑھ گیا ہے اور زندگی کو کامیابی اور خوش حالی سے بسر کرنے کے لئے افراد اور اقوام اور فطرت کی تمام قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے، وہ شخص نہ معاشرت اور معیشت کے جدید نظام میں مفید طریقے سے حصہ لے سکتا ہے نہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اس لئے بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے -

> " ایسی تعلیم کی شدید ضرورت اور تقاضا ہے جو کاریگروں کو ان مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرے کیونکہ جو لوگ اس تعلیم سے محروم رہینگے وہ محض ان مشینوں کے پرزے بن کر رہ جائینگے جن کو وہ چلاتے ہیں " [1] -

لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ کاریگروں کو مختلف پیشوں کا یا کارخانوں کا کام سکھا دیا جائے یا مدرسوں میں وہی اقتصادی اور صنعتی نظام رائج کر دیا جائے جو عملی دنیا میں پایا جاتا ہے - ہمارے سامنے یہ سوال ہرگز درپیش نہیں کہ مدرسوں کو تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت کی ایک شاخ یا شعبہ بنا دیا جائے بلکہ تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ " صنعت و حرفت کے مشاغل کو کس طرح کام میں لایا جائے کہ مدرسوں کی زندگی زیادہ معنی خیز اور طلبہ کی موجودہ ضروریات اور مدرسے سے باہر کے تجربات کے ساتھ زیادہ

[1] Dewey : Democracy and Education. صفحہ ۳۶۷

مربوط اور ہم آہنگ ہو جائے'' لہذا ہمارے ماہرین تعلیم کو خاص طور سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ موجودہ نظری تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو اس کو ملکی حالات کے لئے مناسب اور ملکی ضروریات کے لئے مفید بنا دیں - ہندوستان میں مفلسی اور بے روزگاری کا مسئلہ ایک نہایت اہم اور اندیشہ ناک مسئلہ ہے اور اس کی ذمہ‌داری ایک بڑی حد تک ہمارے نظام تعلیم پر عائد ہوتی ہے جو فارغ التحصیل طلبہ پر کسب معاش کی بہت سی راہیں بند کر دیتا ہے جن میں ترقی کرنے اور دولت پیدا کرنے کے مواقع ہیں - اور تعلیم یافتہ جماعت کے افراد کا ضرورت سے زیادہ ہجوم چند محدود اور مقابلتاً کم مفید پیشوں میں ہو جاتا ہے - ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل کو اس لئے شامل کرنا چاہیئے کہ وہ بچوں کی آرزوئے تخیلق و خواہش عمل کو پورا کرتے ہیں اور جسم و دماغ سے بیک وقت کام لیتے ہیں - اور ثانوی مدارس میں ایسے مضامین ' علوم اور مشاغل کو داخل کرنا چاہیے جن کا تعلق نوجوانوں کی آئندہ پیشے کی زندگی سے ہو تاکہ یہ تعلیم نہ صرف ان کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو بلکہ ان کے شوقوں اور دل‌چسپیوں کا مرکز بھی بن جائے - لیکن شرط یہی ہے کہ یہ پیشہ ورانہ رجحان عام ذہنی بیداری اور تہذیب نفس کے امکانات کو مسدود نہ کرے بلکہ ان کو رفتہ رفتہ زندگی کی عملی ضروریات کے ساتھ مربوط اور منسلک کرکے اور زیادہ مستحکم اور مستقل بنادے - اگر طلبہ میں علمی اور عملی مشاغل کے استمزاج سے اپنے مشاغل کی صحیح تمدنی اہمیت کا احساس پیدا ہو جائے گا تو وہ انسان نما مشینوں کے درجے سے گزر کر ذمہ‌دار اور آزاد انسانوں کے مرتبے پر پہنچ جائیں گے جن کو اپنے کام میں خوشی ' تہذیب نفس اور اظہار خودی کے موقعے

حاصل ھیں - ھم اس کتاب کے مختصر حدود میں پیشہ ورانہ تعلیم کا کوئی نظام نہیں پیش کرسکتے نہ یہ بحث چھیڑ سکتے ھیں کہ ھندوستان میں کس قسم کی صنعتی اور فنی تعلیم درکار ھے اور اس کے لئے بہترین انتظامات کیا ھوسکتے ھیں - لیکن مختصراً یہ واضح کردینا ضروری ھے کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد کن اصولوں پر رکھنی چاھئیے - ھمیں اندیشہ یہ ھے کہ کہیں رفتار زمانہ اور روزگار کے مسئلے سے پریشان اور ضرورت سے زیادہ متاثر ھو کر ھمارے مدارس اصلی تعلیمی مقاصد کو نظر انداز نہ کردیں اور محض مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم میں منہمک ھوکر نہ رہ جائیں , کیونکہ بہ ظاھر اس میں فوری فائدہ اور مالی نفع زیادہ معلوم ھوتا ھے اور فطرت انسانی کا تقاضا ھے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے قریب کی راہ ڈھونڈتی ھے خواہ آگے چل کر یہ جلد بازی نقصان کا باعث ھو - ایک حد تک یہ مطالبہ بعض جماعتوں اور ذمہ دار افراد کی طرف سے تحریر و تقریر کے ذریعہ کیا بھی جارھا ھے - اس لئے ماھرین تعلیم کا فرض ھے کہ وہ اس معاملے میں رائے عامہ کی صحیح رھنمائی کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھہ لیں اور لوگوں کو سمجھادیں کہ ابتدائی مدارج میں عام تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مقاصد میں حقیقی تناقض نہیں ھے - اس منزل میں تعلیم کے عام مقاصد کو جن میں دماغ اور مختلف انسانی قوتوں کی صحیح نشو و نما اور استعمال شامل ھیں ھر وقت پیش نظر رکھنا چاھئے لیکن اسی کے ساتھ ان عام مقاصد کے واسطے نصاب کی تدوین اور تعلیمی وسائل اور مدرسے کے مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرنی چاھیئے کہ طلبہ میں عمل اور ذھنی اجتہاد کی قوتیں بیدار ھوں جو دنیا کے تمام کاروبار اور پیشوں میں مفید ھیں - پیشہ ورانہ تعلیم کے لحاظ سے بھی تاریخ ' جغرافیہ ' ادب ' سائنس ' زبانیں

اور دستکاریاں سکھانا فضول نہیں بلکہ مفید اور لازمی ہے کیونکہ ان سے جو عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ہر قسم کے پیشے کے لئے مفید ہیں - مگر شرط یہی ہے کہ یہ تمام مضامین اس طرح نہ پڑھائے جائیں کہ بچوں کی عملی قوتیں اور جسم و دماغ بالکل معطل ہوجائیں اور وہ محض حافظے کی مدد سے واقعات اور غیر مفید معلومات کا ذخیرہ دماغ میں ٹھونس لیں جو بجائے محرک عمل ہونے کے ذہن پر بار ہوکر رہ جائے - طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہئے کہ طلبا کو اپنی جدت اور اپچ کے اظہار کا موقع ملے' ان میں اشتراک عمل کی صلاحیت اور کاموں کی تقسیم و ترتیب کا ملکہ پیدا ہو اور وہ عملی اور نظری مشکلات سے عہدہ‌برآ ہونا سیکھیں اور رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن جائیں -

ثانوی تعیلم میں پیشے کا رجحان مقابلتاً زیادہ نمایاں ہونا چاہئے اور اس کے نصاب اور مشاغل میں ایسے مضامین شامل کرنے چاہئیں جو آگے چل کر پیشوں میں براہ راست مفید ہوسکیں مثلاً عملی سائنس' تجارتی جغرافیہ' کارو باری واقفیت وغیرہ - لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ طلبہ کو انتخاب مضامین کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق بعض مضامین کو اختیار اور بعض کو ترک کرسکیں - ہمیں یہاں نصاب کی مفصل بحث منظور نہیں مگر جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ثانوی مدارس میں بعض مضامین تو لازمی ہونگے کیونکہ ان کے بغیر طلبہ کی تعلیم ادھوری اور نا مکمل رہ جائے گی - بعض مضامین ایسے ہیں جنھیں لازمی قرار دینا مذاق اور طبائع کے اختلاف کی وجہ سے قرین مصلحت نہیں - مثلاً اگر ایک طالب علم صریحاً ادبی ذوق رکھتا ہے اور اس کو زبانوں سے' فنون لطیفہ سے' تاریخ سے دل چسپی

ہے تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو ہندسہ اور جبر و مقابلہ سیکھنے پر مجبور کیا جائے - یا اگر ایک طالب علم فطرتاً سائنس کے عملی پہلو کی طرف زیادہ متوجہ ہے اور اس کی دماغی جدت اور جولانی کا اظہار اس کے ہاتھوں کے ذریعے ہوتا ہے تو کیا ضرور ہے کہ اس کا وقت اور محنت زبانوں کی تحصیل پر صرف کی جائے - ابتدائی مدارس میں وہ اپنی مادری زبان سیکھتا ہے اور کسی قدر انگریزی جو اس وقت ہمارے ملک میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے - ثانوی مدرسے میں وہ ان زبانوں کا مطالعہ جاری رکھتا ہے لیکن اونچی جماعتوں میں اس کی توجہ زیادہ تر ایسے مضامین کی جانب رہنی چاہئیے کہ بحیثیت مجموعی اسے سائنس سے زیادہ گہری دلچسپی اور واقفیت پیدا ہو - مثلاً ایک طالب علم حساب اور طبیعات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کو مشینوں اور آلات سے دلچسپی ہے - وہ اپنے آپ کو انجینیری کے کسی شعبے کے لئے تیار کرتا ہے - یا ایک دوسرا طالب علم کیمیا اور حیاتیات سے شوق رکھتا ہے اور اُن علوم کو حاصل کرتا ہے جن کا تعلق اجسام نامیہ سے ہے - اس کے لئے آئندہ چل کر موقع ہے کہ وہ زراعت یا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے - کیا ان طلبا کے نصاب میں بہت سے غیر ضروری مضامین اس خیال سے داخل کرنا مناسب ہوگا کہ ان سے " دماغ کی تربیت " ہوتی ہے ؟ ایسا کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ ہم ان کے مخصوص اور نمایاں رجحان کو بھی کمزور یا معدوم کردینگے - ان طلبہ کو ایسے مضامین پسند کرنے کا موقع دینا چاہئے جن میں باہمی ربط ہو اور وہ سب ان کے خاص مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہوں اور ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ وہ ان چند مضامین کا مطالعہ وسیع اور گہری نظر سے کر سکیں - ہماری موجودہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی کمزوری اور پیشوں کی تعلیم کی

خرابی کا بڑا سبب یہی ہے کہ طلبہ تمام مضامین کا بالکل سرسری مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی واقفیت بہت سطحی ہوتی ہے وہ کسی مضمون پر بھی پورا عبور اور مہارت نہیں رکھتے - وہ مجبوراً محض امتحان کی ضرورت سے مر کھپ کر سب مضامین یاد کر لیتے ہیں - اس قسم کی تعلیم نہ ان میں علمی قابلیت پیدا کرسکتی ہے نہ عملی صلاحیت جو اکثر پیشوں میں درکار ہوتی ہے - اس بحث کا ما حصل یہ ہے کہ جب تک ثانوی تعلیم کی تنظیم نو اس طرح نہ کی جائے کہ طلبہ چند مضامین کا گہرا مطالعہ کرکے ان میں واقعی قابلیت حاصل کریں فنی تعلیم میں کامیابی نہیں ہوسکتی - تعلیمی مقصد اس وقت بھی معلم کی نظر میں پیش پیش رہنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی معلم اور متعلم دونوں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک عملی دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے جہاں محض لفظی اور سطحی علم سے کام نہیں چلتا بلکہ کم از کم کسی ایک چھوٹے سے شعبے میں ٹھوس معلومات اور مہارت کی ضرورت ہے -

اسي ضمن میں ایک بات ماہرین تعلیم سے زیادہ ارباب حکومت اور اهل سیاست کي توجه کي محتاج ہے - پیشوں کي تعلیم کے لئے ایک خاص اهتمام کی ضرورت ہے - ایک طرف جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں طلبہ کي صلاحیتوں اور رجحانات کا امتحان کرنا لازم ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کن مشاغل اور پیشوں کے لئے فطرتاً موزوں ہیں - اس تفتیش میں ہمیں ان " آزمائشوں " (Tests) سے مدد ملے گي جو گذشتہ سالوں میں ماہرین فن نے ترتیب دی ہیں - اس کام کو نظم اور ترتیب سے کرنے کے لئے جابجا ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جن میں وہ تمام مواد جمع کیا جائے جس کا اس مسئلہ سے

تعلق ہے یعنی تمام مقامی طلبہ کے متعلق ان کے والدین اور اساتذہ کی رائیں ' ان کے مدرسوں کی رپورٹیں ' آزمائشوں کے نتائج وغیرہ - پھر ان اداروں کا یہ فرض ہو کہ ان تمام چیزوں کی بنا پر طلبہ کو پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں معقول اور معتبر مشورہ دیں - لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے - ہم کسی ملک کی معاشی تنظیم محض افراد کی صلاحیتوں کی بنا پر نہیں کرسکتے - ہمارا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ ہم باقاعدہ تحقیق کر کے معلوم کریں کہ ملک میں مختلف پیشوں اور کاروبار میں کہاں کہاں اور کس قدر گنجائش ہے - کہاں ایک خاص پیشے کے امید واروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے اور کس شعبے میں ایسے مواقع ہیں جن سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا - ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اس کا انتظام کرنا یقیناً بہت مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو تمام مفید تحریکوں کا مضحکہ اڑایا کرتے ہیں یہ نا ممکن معلوم ہو - لیکن اب جب کہ تعلیم کا مسئلہ تمام و کمال صوبجاتی حکومتوں کے سپرد کردیا گیا ہے ہر صوبے کے تعلیمی اور مالی محکموں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبے میں اس قسم کا عام معائنہ کرائیں اور وقتاً فوقتاً اس کا اعادہ اور تصحیح کرتے رہیں اور مناسب تعلیم اور وسائل معاش کي تنظیم کے ذریعہ رفتہ رفتہ کام کرنے والوں اور کسب معاش کے مواقع میں صحیح نسبت قائم کریں - موجودہ صورت حال کسي طرح قابل اطمینان نہیں ہے کیونکہ مروجہ تعلیمي پالیسي کا حال بالکل ایساهی ہے جیسے کوئی اندھی مشین بغیر بازار کی طلب اور خریداروں کی ضروریات کا خیال کئے کسي ایک قسم کي چیز بے تحاشا بنائے چلی جائے ' اور اس سے بحث نہ ہوکہ یہ تمام پیداوار کس مصرف میں آئیگی - لہذا اس حالت کی اصلاح کے لئے اولاً صوبوں

کو علیحدہ علیحدہ کوشش کرنی ہوگی اور اس کے بعد تعلیم کے لئے وفاقی نظام میں جو محکمہ بھی قائم کیا جائے اس کو ان انفرادی کوششوں میں ربط اور تعاون قائم کرنا پڑیگا کیونکہ اگرچہ بہت سے معاشی وسائل ایسے ہیں جن کا تعلق محض علیحدہ علیحدہ صوبوں سے ہوگا لیکن بعض ایسے مسائل اور مشکلات بھی ہوں گی جن کا حل تمام ہندوستان کے لئے ایک ہی طرح پر سوچنا پڑیگا - آج کل نہایت سرعت کے ساتھ تمام صوبوں میں یہ پالیسی مروج ہوتی جاتی ہے کہ روزگار کے معاملے میں پنجاب پنجابیوں کے لئے ہے بنگال بنگالیوں کے لئے بمبئی بمبئی والوں کے لئے اور علی ہذالقیاس ایک حد تک یہ نقطہ نظر صحیح اور جائز ہے اور ہر صوبے کو حق ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو اپنے یہاں کی ملازمتوں اور پیشوں کے لئے ترجیح دے لیکن اندیشہ یہ ہے (بلکہ یہ بات اندیشہ کی حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور واقعہ بن گئی ہے) کہ مختلف صوبے ریوڑی بانٹنے والے اندھے کی طرح اس پالیسی پر اس قدر سختی کے ساتھ عامل ہوں کہ اس سے ملک کے بہترین تعلیمی مفاد اور ترقی کو نقصان پہنچے - بعض کام اور پیشے ایسے ہیں جن میں معمولی قابلیت ذہانت اور تعلیم کی ضرورت ہے یا جن میں کوئی خاص فنی مہارت درکار نہیں ہوتی - ان کے لئے تقریباً تمام اُمیدوار صوبے کے اندر سے حاصل ہوسکتے ہیں - لیکن ان پیشوں اور نوکریوں میں جن کے لئے مخصوص قابلیت اور تربیت کی ضرورت ہے یا جن میں شخصیت کا عنصر سب سے زیادہ اہم ہے حلقۂ انتخاب کو محدود کردینا اور تنگ نظری اور صوبجاتی تعصب سے کام لینا سراسر حماقت اور نادانی ہوگی - ظاہر ہے کہ وہاں انتخاب کا صحیح معیار سکونت نہیں بلکہ قابلیت ہے - بہترین اُمیدوار جہاں سے ملیں بلا کر مقرر کرنا چاہیئے - اس کے مصداق سول سروس سے

زیادہ تعلیم کے عہدے، علمي تحقیق و تفتیش کے کام، صنعت و حرفت کے ماہروں کي جگہیں۔ غرض وہ تمام خدمات ہیں جن کے لئے موجد، مخترع، محقق اور غیر معمولي طور پر ذہین لوگ درکار ہیں -

ہم نے پیشوں کے متعلق جس قسم کے عام معائنے کي ضرورت بتائي ہے وہ یورپ اور امریکہ کے بعض ممالک میں بارہا کیا جاچکا ہے اور روز بہ روز زیادہ احتیاط کے ساتھہ کیا جاتا ہے - وہاں ایسے ادارے قائم ہیں جن میں ماہرین نفسیات، ارباب صنعت و تجارت اور سرکاري محکموں کي مدد سے طلبہ کو ان کے مستقبل کے متعلق مفید مشورہ دیتے ہیں - اس کا نتیجہ نہ صرف طلبہ کے لئے اچھا ہے کہ وہ بے روزگاري اور پریشاني سے محفوظ رہتے ہیں اور غیر موزوں کاموں میں اپني صلاحیت اور زندگي کو برباد نہیں ہونے دیتے، بلکہ ملک کے لئے بحیثیت مجموعي یہہ بات بہت اطمینان بخش ہے کہ اس کے افراد کي قوتیں صحیح مصرف میں لائي جائیں اور انہیں تخریبي مشاغل میں پڑنے سے بچا لیا جائے - کسي ملک میں بے روزگاري کا بڑھ جانا مرض کي علامت ہے اور اس کے تدارک کے لئے مناسب وسائل اختیار کرنا حکومت اور جمہور دونوں کا فرض ہے - حال ہي میں جرمني نے استادوں کي تعلیم کا جو جدید نظام رائج کیا ہے اس کا ایک جز و لازم یہہ ہے کہ ہر علاقہ کا ترینگ کالج مقامي حکام کي مدد سے یہہ اندازہ کرے کہ مثلاً آئندہ پانچ سال میں کتنے نئے معلموں کي ضرورت ہوگي - کالج میں ہرسال طلبہ کو اسي اندازے سے داخل کیا جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معلموں کي تعداد ضرورت سے بہت بڑھ جائے اور محکمہ تعلیم میں ان کے لئے گنجائش نہ نکل سکے - حال ہي میں ہندوستان کے ایک صوبے میں ایک ترینڈنگ کالج کو اپني معمولي تعداد دفعتاً نصف کر دیني پڑي کیونکہ ترینڈنگ کے بعد معلموں کے لئے مدرسوں میں

آسانیاں نہیں نکلتی تھیں - لیکن فوری حالات سے بالکل مجبور ہوکر یہہ
طرز عمل اختیار کرنا اور بات ہے اور دور اندیشی کے ساتھہ مستقبل پر نظر
ڈال کر ایک مناسب شاہراہ عمل اختیار کرنا دوسری بات ہے - ہندوستان
میں آج کل تعلیم یافتہ طبقے میں بے روزگاری اور بیکاری کا مسئلہ روز بروز
زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے - اس کی اصلاح کے لئے ہر صوبے میں وسائل
معاش اور پیشوں کے امکانات کا ایک باقاعدہ جدول تیار کرنے کی ضرورت ہے
تاکہ ان کے مطالبات اور مواقع کے مطابق لوگوں کو مختلف راستوں پر
لگایا جائے - اس میں یقیناً ایک حد تک انفرادی آزادی کی روک ضرور ہے
لیکن یہہ روک افراد اور معاشرے دونوں کے فائدہ کے لئے ہے اور موجودہ
زمانے میں ہر متمدن حکومت ایک حدتک افراد کی آزادی کو روکتی ہے
تاکہ اجتماعی زندگی کے نظام میں فرق نہ آئے - اس کی وجہہ سے افراد
کا باہمی بے قید مقابلہ بھی کم ہوجائیگا جو ممکن ہے انتخاب طبیعی کے
ناسمجھہ حامیوں کو برا معلوم ہو لیکن ہر تمدنی نظام کا کام انتخاب
طبیعی کے سخت گیر اور نقصان‌دہ اصول کی ترمیم کرنا ہے - لہذا ان کا
اعتراض قابل توجہہ نہیں - ہماری سمجھہ میں یہہ بات نہیں آتی کہ
کیوں ملک کی تمام یونیورسٹیاں ہرسال ہزاروں کی تعداد میں وکلاء پیدا
کر رہی ہیں جب ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس پیشے میں پہلے ہی
ضرورت سے زیادہ لوگ بھرے ہوئے ہیں اور تعداد کی یہہ روز افزوں اور
غیر مناسب زیادتی نہ صرف اس پیشے کے اراکین کے لئے مضر ہے بلکہ ان
کی اندرونی زندگی اور باہمی مسابقت پر ایسا اثر ڈالتی ہے جو اخلاقاً اور
عقلاً ہر طرح قابل اعتراض ہے - اس بد نظمی کا ایک ادنیٰ سا نتیجہ یہہ ہے
کہ آئے دن کئی کئی سال کا تجربہ رکھنے والے وکلا ناکامی سے عاجز آکر معلمی
اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معلم جو اپنے پیشے میں زیادہ

توقعات نہیں پاتے وکالت کا امتحان پاس کرکے اس اُمید موہوم پر عدالتوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں کہ شاید وہ وہاں کامیاب ہوسکیں - ایسی ہی اور بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن ان سب کا ماحصل یہی ہے کہ ملک کی معاشی تنظیم نہایت ابتر ہے - یہ ابتری نہ صرف بے انتہا اقتصادی نقصان اور عام افلاس کا باعث ہے بلکہ اس کی وجہہ سے بے شمار افراد مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہوگئے ہیں- ہمارے نظام تعلیم کو جو مسائل در پیش ہیں ان میں سب سے اہم غالباً یہی مسئلہ ہے کہ یہ تنظیم کس طرح درست کی جائے تاکہ پیشہ شخصیت کی تربیت میں سدراہ ہونے کے بجائے اس میں معین ہو -

---

باب پنجم

حکومت اور تعلیم

هم اب تک کئی تمدنی اداروں سے بحث کرچکے هیں جو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم اور ان کی زندگی کی تشکیل پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالتے هیں اور جن کی وجہہ سے بہت سے اهم تعلیمی مسائل پیدا هوتے هیں - اب هم ایک ایسے منظم ادارے کی طرف متوجہہ هوتے هیں جو ان سے زیادہ وسیع هے اور جس میں یہ مقابلتاً چھوٹی جماعتیں شامل هیں ' یعنی کسی ملک کی حکومت کا نظام جس کے ذریعے سے کوئی قوم یا جماعت اپنی عمرانی زندگی کی تنظیم کرتی هے اور افراد کے لئے مشترک اور متمدن زندگی بسر کرنے کے اسباب اور وسائل مہیا کرتی هے - همیں یہاں حکومت کے عام مقاصد اور اغراض سے بحث نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود هے کہ تعلیم کی اشاعت اور رهنمائی کے ضمن میں حکومت پر کیا فرائض عائد هوتے هیں اور حکومت اس میں کس طرح اور کس حد تک دخل دے سکتی هے - اس زمانے میں جب حکومت کا اثر اور مداخلت بڑھتی جاتی هے اس کے اور تعلیم کے باهمی تعلقات کو سمجھنا اور ان کی مداخلت کے حدود معین کرنا نہایت ضروری هے -

حکومت افراد کی زندگی میں کیوں دخل دیتی هے ؟ اس کو انفرادی آزادی میں حائل هونے کا کیا حق هے ؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے همیں یہ سمجھہ لینا چاهئے کہ حکومت کے قیام کی غرض یہی هے کہ وہ افراد کی کوشش کو مجتمع اور منظم کرکے ان کے مقاصد کے حصول میں امداد دے جو ان سب میں مشترک هیں - افراد کا دائرہ عمل جدا جدا رهے

تو وہ بہت سے بڑے بڑے کام مثلاً ذرائع آمد و رفت ' وسائل معاش کی فراهمی وغیرہ کے انجام دینے سے قاصر رهیں گے - لہذا اس قسم کے کاموں کو حکومت خود اپنے هاتهہ میں لیتی هے یا ان کے انجام دینے میں امداد کرتی هے - اس کے علاوہ جب افراد میں یا جماعتوں میں باهم اشتراک عمل یا مسابقت هو تو ان کے اغراض و مقاصد میں اکثر اختلاف پیدا هوتا هے اور ان میں انصاف کرنے اور سمجهوتا کرانے کے لئے کسی ایسے ادارے کی ضرورت هے جو ان سب پر حاوی هو اور قوی کو محض قوت کی وجهہ سے کمزور پر غالب نہ آنے دے - اسی لئے حکومت افراد کے معاملات اور کار و بار میں دخل دیتی هے اور ان کو باقاعدگی اور انتظام کے ساتهہ چلانے کے لئے قوانین بناتی هے سزائیں معین کرتی هے ' افسر اور حکام مقرر کرتی هے جو قانون کی پابندی کراتے هیں اور امن قائم رکهتے هیں - غرض اس کی یہ کوشش هوتی هے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کا ایسا نظام بن جائے جس کے ماتحت وہ اطمینان کے ساتهہ اپنے جائز مشاغل میں مصروف رهیں اور ان کی جائز انفرادی جد و جہد میں دقتیں اور مجبوریاں حائل نہ هوں - مگر شرط یہ هے کہ حکومت کا یہ دخل انہیں مشاغل اور کار و بار تک محدود رهے جو هماری مشترکہ زندگی پر اثر ڈالتے هیں اور اس میں معین یا سد راہ هیں - وہ افعال جو همارے ذاتی افعال هیں ' جن کا تعلق اور اثر هماری ذات تک محدود هے ان سے عموماً حکومت کو براہ راست نہ کوئی واسطہ هوتا هے نہ هونا چاهئے - همارے خیالات اور جذبات ' همارا مذهب اور عقیدہ هماری اپنی چیز هیں - ان میں حکومت کا کوئی حصہ نہیں اور جب تک هم ان کے اظہار میں یا ان پر عمل کرنے میں دوسروں کے ساتهہ بے جا تعرض نہ کریں حکومت ان میں کسی طرح دخل نہیں دے سکتی - اگر حکومت اس شعبہ زندگی میں بهی دست اندازی

شروع کردے گی تو افراد کی جائز آزادی سلب ہوجائیگی اور حکومت کی مداخلت صحیح حد سے، جو صرف اس قدر ہے کہ افراد اور جماعتوں کی ترقی میں جو رکاوٹیں حائل ہوں انہیں دور کرے، تجاوز کر جائے گی - پروفیسر سمتھ (Smith) اپنی کتاب "Nation's Schools" قوم کے مدرسے) میں لکھتے ہیں -

"حکومت کی مداخلت کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ ہماری آزادی میں اضافہ ہو نہ یہ کہ اس میں اور کمی ہو جائے - اس کی بدولت ہمیں (اپنے کاروبار کے لئے) ایک ایسا ماحول ملنا چاہیے جس میں بے کھٹکے، بے تکلف رہنا سہنا چلنا پھرنا ممکن ہو - مثلاً ایک منظم حکومت میں تمام افراد کو سیاسی آزادی حاصل ہوتی ہے - علاوہ بریں چونکہ حکومت کے تمام افعال کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کی اخلاقی قدر میں اضافہ ہو، اس کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ خود ایسے کام انجام دے کر، جو افراد اس کے برابر یا اس سے بہتر انجام دے سکتے ہیں، ان کی قوتوں کو معطل کردے - حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کی ذاتی کوششوں کے لئے مناسب مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ ان کے بجائے کام کرے یا ان کی کارکردگی اور حوصلے کو پست کردے" [۱]

یہ اصول حکومت کی مداخلت کی جائز حدود کا تعین کرتا ہے لیکن تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دراصل حکومتوں نے کبھی خود کو

[۱]

ان حدود کے اندر نہیں رکھا بلکہ ہمیشہ اپنے امکان بھر یہ کوشش کی ھے
کہ افراد کے افعال اور خیالات دونوں کو اپنے قابو میں رکھیں - چنانچہ
اس مقصد کے لئے انہوں نے نہ صرف قوانین حکومت کا استعمال کیا
بلکہ تعلیم پر حاوی ھو کر اس کے ذریعے لوگوں کے خیالات کو خاص سانچوں
میں ڈھالنا چاھا - اس کی بہت سی مثالیں قدیم زمانے سے لے کر آج تک
تاریخ میں مل سکتی ھیں - سپارٹا (Sparta) کی تعلیم کا نصب العین
علانیہ طور پر یہ تھا کہ ایسے شہری پیدا کئے جائیں جو اپنی جسمانی
طاقت اور تربیت کی بدولت ملک کے لئے مفید ثابت ھوں اور اس کی
سیاسی حکومت کو مستحکم کریں - اسی وجہہ سے اسپارٹا میں بچپن ھی
سے لڑکوں کی تربیت خود حکومت اپنے ھاتھ میں لے لیتی تھی اور اس
میں والدین کا حصہ محض برائے نام ھوتا تھا - اس طرح قرون وسطے
میں جب یورپ میں تعلیم کا نظام ملکی حکومتوں کے ماتحت نہ تھا
بلکہ عیسائی کلیسا ، جو اس زمانے میں صرف مذھبی قوت کا مرکز ھی نہ
تھا بلکہ بہت زبردست سیاسی اقتدار بھی رکھتا تھا ۔ اکثر ملکوں کے
تعلیمی نظام پر حاوی تھا ، اس کی بھی یہی کوشش تھی کہ
اپنے خاص مقاصد تعلیم کے ذریعے حاصل کرے - اس کی سب
سے زیادہ موثر اور کامیاب مثال یسوعیوں (Jesuits) کا نظام تعلیم ھے
جس نے ایک زمانے میں تقریباً تمام یورپ میں اپنا سکہ بٹھا دیا تھا
اور ھر قسم کی مذھبی اور سیاسی تحریکوں کی سر کردگی حاصل کرلی
تھی - اس کے بعد رفتہ رفتہ اس فرقے کا مذھبی اقتدار کم ھوگیا اور
تعلیم بھی بڑی حد تک ان کے قبضے سے نکل گئی - اس زمانے میں
مختلف اسباب ایسے جمع ھوگئے جن کی وجہہ سے جماعتوں اور افراد کی
متفرق تعلیمی کوشش قومی مقاصد کے لئے ناکافی ثابت ھوئی اور اس

نظام تعلیم کی بنیاد پڑی جس کو هم اب تقریباً تمام متمدن ممالک میں رائج پاتے هیں - یعنی تعلیم کا انتظام حکومتوں نے اپنے هاتھ میں لے لیا - لیکن یہ یاد رکھنا چاهئے کہ حکومت کا یہ فعل خود مطلبی سے خالی نہ تھا - خصوصاً ابتدا میں اکثر ملکوں کے مطلق العنان بادشاهوں نے مدرسے اسی غرض سے قائم کئے تھے کہ اپنی رعایا کے خیالات کو اپنی رائے اور مقاصد کے مطابق ڈھالیں - نپولین نے اس خیال کو صاف صاف ظاهر کردیا تھا :—

" اس نظام تعلیم قائم کرنے سے میری سب سے بڑی غرض یہی هے کہ میرے هاتھ میں ایک ایسا ذریعہ هو جس سے سیاسی اور اخلاقی معاملات میں میں لوگوں کی رائے پر اثر ڈال سکوں "

اس تحریک پر جرمن فلسفہ اور خیالات کا خاص طور پر اثر پڑا اور تعلیم ایک ملکی مسئلہ تسلیم کرلی گئی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس صورت حال سے اپنی کتاب میں بحث کی هے اور بتایا هے کہ اس کی تاریخی وجوہ کیا تھیں - جرمنی کو "نپولین کے هاتھوں شکست هو چکی تھی - اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اپنی سیاسی قوت دوبارہ حاصل کرنے اور اپنی بگڑی حالت کو سدھارنے کے لئے تعلیم کو آلۂ کار بنائے اور مدرسوں کا ایک وسیع اور منظم سلسلہ قائم کرے - چنانچہ اس سیاسی صورت حال کا اثر نہ صرف تعلیم کے عملی نظام پر پڑا بلکہ تعلیم کا فلسفہ اور مقاصد بھی اس سے متاثر هوئے - " جب ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک سارے نظام تعلیم کا مقصد یہی ٹھہرا کہ وطن دوست شہری اور سپاهی اور حکام اور افسر تیار کئے جائیں اور ملک کی

فوجی صنعتی اور سیاسی تحفظ اور استحکام کا اهتمام هو تو لازماً نظام یه
تعلیم میں بھی " اجتماعی افادے " (Social Efficiency) کے اصول
کو اهمیت دی گئی " [۱]

اس کا ایک نتیجه یه بھی هوا که " اجتماعی افادے " کو بہت
تنگ اور محدود معنی پہنائے گئے اس سے مراد " انسانی " فرائض کی
ادائگی نه تھی بلکه ان خاص فرائض کی ادائگی جو ایک انسان پر مثلاً
بحیثیت ایک جرمن یا فرانسیسی یا انگریز شہری کے عائد هوتے هیں -
تعلیم کا مفہوم بجائے نوجوانوں کی شخصیت اور انفرادی قوتوں کی آزاد
نشو و نما میں مدد دینے کے یه قرار دایا که وه بنے بنائے سانچوں میں ڈھالے
جائیں خواه ان کی نمو پذیر شخصیت ارباب سیاست کے پسند کئے هوئے
سانچوں میں سمائے یا نه سمائے - یہی طریقه جمہوری حکومتوں نے اختیار
کیا جو شخصی حکومتوں کے بعد قائم هوئیں اور اب جن ملکوں میں
جمہوری حکومتیں هیں ان کی بھی یہی کوشش هے که هر نئی نسل کو
ان خیالات اور روایات کے مطابق تربیت دیں جن پر جمہوری حکومت
کا قیام هے - اس کی ایک عمده مثال ممالک متحده امریکه کی هے
جہاں حکومت نے تمام باشندوں کے لئے عام اس سے که ان کا تعلق کسی
مذهب یا طبقے سے هو ' ایک هی نظام مدارس قائم کردیا هے تاکه امیر
اور غریب ' عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو دوش بدوش تعلیم دے کر
تمام لوگوں میں ایک مخصوص جمہوری ذهنیت پیدا کی جائے - یہاں
همیں اس امر سے بحث نہیں که انہیں اس کوشش میں کس حد تک
کامیابی هوئی هے اور یه نظام تعلیم کہاں تک تعصب اور دوسرے نقائص
سے پاک هے - همیں تو یه دکھانا هے که جمہوری حکومت کو بھی اپنے

---

[۱] جمہوریت اور تعلیم صفحه ۱۰۹ -

شہریوں کی تعلیم سے کم از کم اتنی ہی دل چسپی ہے جتنی کسی اور نظام حکومت کو - بلکہ ایک وجہہ سے بہت زیادہ دل چسپی ہے کیونکہ یہاں ملک کے کار و بار اور فلاح کی ذمہ داری خود جمہور پر ہے - اگر ان میں معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی کمی ہوگی تو تمام کام درہم و برہم ہوجائینگے - پس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے زمانے میں بادشاہ بالعموم اپنے ذاتی یا خاندانی مفاد کی خاطر تعلیم میں دل چسپی لیتے تھے اور اب جمہوری حکومت ان مقاصد کی خاطر تعلیم کی رہنمائی کرتی ہے جنھیں وہ اپنے خیال میں عام رعایا کے لئے مفید اور عمدہ سمجھتی ہے اور جن کے بغیر اس کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوسکتیں - مگر بہرحال مدرسہ پروپگینڈا کا ایک ذریعہ پہلے بھی سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے - موجودہ زمانے میں اس کی نہایت واضح مثال روس جدید کا نظام تعلیم ہے جس کے بنیادی اور صریحی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ مدرسوں کے ذریعے سوریت کے خیالات اور عقائد کی اشاعت کی جائے - پروفیسر پنکےوچ (Pinkevitch) جو موسکو یونیورسٹی کے صدر اور روس کے چوٹی کے تعلیمی ماہرین میں سے ہیں مدرسے کے فرائض سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں [۱] -

> " مزدور بچوں کے مدرسہ جدید کی ایک اور خصوصیت امتیازی اس کا یہ مقصد ہے کہ آنے والے انقلاب کے لئے جنگ جو شہریوں کی ایک جماعت تیار کرے اور نئے معاشرے کی تعمیر کے لئے معماروں کی، قابل منتظموں، اور انقلاب پسندوں کی تربیت کرے " -

---

[۱] New Education in Soviet Republic (ریاست سوویت میں تعلیم جدید) ۱۰۲

۱۰

دوسری جگھہ وہ اسی ضمن میں لکھتے ھیں :—

" تعلیم عامہ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کا کام یہ ھوگا کہ وہ نوخیز نسلوں میں اشتمالی (Communist) خیالات پھیلائیں اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ کریں جو اشتمالی حکومت کے قیام کے لئے جد و جہد کر رھے ھیں یعنی مقصد یہ ھے کہ پرولتاری (Proletarian) فلسفہ کا بیج نوجوانوں کے دل و دماغ میں بویا جائے.....اس کا ایک ذریعہ یہ ھوگا کہ نظام تعلیم کی رھنمائی ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اشتمالی اور اشتراکی ھیں اور مزدوروں کے انقلاب سے ھمدردی رکھتے ھیں - دوسرے یہ کہ اخباروں اور بچوں کی کتابوں کے ذریعے اشتمالی خیالات کی اشاعت کی جائے اور تیسرے تعلیم عامہ کی تمام درسگاھوں کی تنظیم اسی اصول پر کی جائے " [۱] -

اسی معاملے میں روسی پالیسی اور دوسرے ملکوں کی پالیسی میں یہہ فرق ھے کہ روس میں علی الاعلان یہ مقصد تسلیم کیا جاتا ھے اور دوسرے ملکوں میں اس پر عمل کیا جاتا ھے لیکن یہ نظریہ تعلیم میں صراحت کے ساتھہ داخل نہیں کیا گیا -

ھندوستان کی تعلیمی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ھوتا ھے کہ زمانۂ قدیم میں حکومت نے تعلیم کے نظام کو اس طرح اپنے مقاصد کا تابع نہیں بنایا جس طرح اوپر کی مثالوں سے ظاھر ھوتا ھے - ھندؤں اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تعلیم سے زیادہ تر اھل علم کو

[۱] صفحہ ۱۵۱

سروکار تھا جو کبھی بغیر کسی خاص مالی امداد کے اور کبھی اہل ثروت کی سر پرستی میں مدرسے چلاتے تھے - بادشاہ اور رؤسا اکثر تعلیم گاھوں اور عالموں کی سر پرستی کرتے تھے ' شاھی عطیوں سے ان کی امداد کرتے تھے - بعض اوقات ان لوگوں کو با قاعدہ سالانہ وظائف بھی ملتے تھے لیکن حکومت نہ نظام تعلیم قائم کرنے کی ذمہ دار تھی نہ اس کے تمام مصارف کی کفیل - مختلف علوم کے عالم اور ماھر اپنی اپنی جگہہ پر اپنے خاص فن میں درس دیتے تھے - ان کا حلقۂ درس اعلیٰ تعلیم گاہ کا کام دیتا تھا جہاں علم کے پیاسے دور اور نزدیک سے آکر جمع ھوتے تھے اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرکے اپنی پیاس بجھاتے تھے - ان درسگاھوں اور یورپ کی قرون وسطیٰ کی یونیورسٹیوں میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ھے کہ وھاں بھی شائقین علم ملک ملک پھرا کرتے اور جہاں کہیں کوئی جید عالم ھوتا اس کے درس سے مستفید ھوتے - یہاں تمام لوگوں کے لئے تعلیم کا انتظام نہ تھا لیکن مفلسی تعلیم کی راہ میں زیادہ حارج نہ ھوتی تھی اور سچا شوق رکھنے والوں کے لئے تعلیم کے دروازے کھلے رھتے تھے - مذھبی جماعت کو مدارس پر اقتدار ضرور حاصل تھا کیونکہ اکثر علوم میں وھی لوگ اُستادی کا درجہ رکھتے تھے جنہیں علوم دین میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی - لیکن چونکہ ان بزرگوں کو سیاست اور حکومت سے کوئی گہرا اور بلاواسطہ تعلق نہ تھا اس لئے حکومت تعلیم کی آزادی میں سدراہ نہ تھی -

انگریزی عہد حکومت میں تعلیم اور حکومت کے درمیان ایک نیا اور مضبوط رشتہ قائم ھوگیا ھے اور کمپنی کے عہد کی ابتدا سے اب تک کم و بیش واضح طور پر حکومت کی یہی کوشش رھی ھے کہ تعلیمی مدارس کے ذریعے طلبہ کو اپنے مقاصد کے لئے تیار کرے - اس زمانے سے قطع نظر کر لیجے

جب عیسائی مشنریوں کی تعلیمی کوششیں " کفر اور جہالت میں بھٹکے ہوئے دیسیوں کو راہ ہدایت دکھانے " کے لئے وقف نہیں - ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں جو مراسلات اور تعلیمی ریکارڈ ملتے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی تعلیم کا نفاذ اس غرض سے کیا گیا تھا کہ کمپنی کے روز افزوں کاروبار کو چلانے کے لئے متحرر اور چھوٹے درجے کے افسر تیار کئے جائیں تاکہ ذرا ذرا سے کام کے لئے کمپنی کو انگلستان سے لوگ نہ لانے پڑیں جو بیش قرار تنخواہوں کے طالب ہوتے تھے - پھر یہ مصلحت بھی تھی کہ کچھ ایسے لوگ کمپنی کے پاس رہیں جو تجارت اور ملک داری دونوں کے معاملات میں ان کے اور ہندستانیوں کے درمیان واسطے کا کام دیں - اس کے ساتھ ہی لارڈ میکالے (اور بعض اور نیک نیت لوگوں) کو یہ فکر بھی تھی کہ اس وسیع براعظم کے لاتعداد باشندوں کو اس جہالت سے نکالا جائے جس کی تاریکی میں یہ بیچارے ان بزرگ کے نزدیک شہد اور مکھن کے سمندر میں غوطے کھارہے تھے ! اس وقت سے اب تک اگرچہ تعلیمی نقطۂ نظر میں بہت کچھ تبدیلی ہو چکی ہے اور سرکاری بیانات ، مراسلوں اور تحریروں میں دوسرے اور بہتر مقاصد کی جھلک بھی نظر آتی ہے لیکن عمل کے لحاظ سے تعلیم بحیثیت مجموعی اب بھی متوسط طبقوں کو نوشت و خواند سکھانے اور ان کو سرکاری نوکریوں کے واسطے تیار کرنے تک محدود ہے - علاوہ اس کے سرکاری اور نیم سرکاری دونوں قسم کے مدارس کی تعلیم اور پالیسی حکومت کی دست نگر ہے کیونکہ حکومت ہی بڑی حد تک ان کے مصارف کی ذمہ‌دار ہے - انگریزی مثل ہے " جو دام دے کر بین بجوائے وہی راگ کی لے بتائے " اگر ملک میں ایسی تعلیم کاہیں

قائم کی جائیں جن کے مقاصد اور پالیسی عام مروّجہ مقاصد سے بالکل یا بہت کچھ مختلف ہو تو اُن کا کامیابی کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہے - کیونکہ وہ نہ صرف حکومت کی مالی امداد اور ملک کے اہل ثروت کی سرپرستی سے محروم رہینگے بلکہ اُن کے فارغ التحصیل طلبہ کو، جن کی اسناد پر سرکاری مہر نہ ہوگی، وسائل معاش تلاش کرنے میں بھی مشکلات پیش آئینگی - یہی دقّت اِن " قومی تعلیم گاھوں " کو دبش آرھی ہے جو گزشتہ پندرہ بیس سال میں جابجا قائم کی گئی ہیں -

اس مختصر سے تبصرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم اس زمانے میں یہ نا ممکن ہے کہ کوئی حکومت تعلیم میں بالکل مداخلت نہ کرے یعنی اس کی پالیسی اور مقاصد پر اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے - لیکن اس ناگزیر صورت حال کی وجہہ سے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم اس مداخلت کی حدود کا تعین کریں - ایک حد تک ہر حکومت کو اپنی حفاظت کے لئے اس دست اندازی کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن حکومت کا یہ اقتدار اور غلبہ جتنا زیادہ اور قوی ہو اسی نسبت سے اندیشہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے اصلی مقاصد فوت ہو جائینگے - اگر حکومت بہترین قومی روایات اور اخلاقی صفات کا مجسمہ ہوتی تو اس کی مداخلت نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہوتی - لیکن یہ محض ایک خیالی تصویر ہے جس کا وجود کہیں نہیں - دراصل حکومت ہمیشہ ان مختلف جماعتوں اور ہم غرض طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی خاص وقت میں ملک پر حاوی ہوتے ہیں - یعنی جو جماعت یا طبقہ برسر حکومت ہوتا ہے وہ لازمی طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں اپنے خیالات اور مقاصد کی اشاعت کرے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی

نسلوں کے خیالات اور دماغوں پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش میں تعلیم کے اولین اور اعلیٰ ترین مقاصد نظر انداز ہوجاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ مدرسہ بچوں کے قوائے ذہنی کی تربیت کرے اور ان کو " صحیح انسانی " زندگی کے قابل بنائے استادوں اور شاگردوں کی محنت اور توجہ دور از کار چیزوں میں صرف ہوتی ہے - تعلیم کا ایک مقصد جیسا کہ ہم پہلے باب میں بتا چکے ہیں ' یہ ہے کہ وہ خود بچوں میں تعلیم اور نشو و نما کو جاری رکھنے کی صلاحیت پیدا کرے یعنی اس کے پیش نظر فرد کی صحیح اور مکمل ارتقا رہتی ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ تعلیم کا عمل آزاد ہو لیکن حکومت کی دست اندازی کی وجہ سے آزادی کا عنصر مفقود ہوجاتا ہے ' تعلیم خارجی مقاصد کی مطیع ہوجاتی ہے ' اور موضوع تعلیم بجائے ایک آزاد اور ارتقا پذیر ہستی کے ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے جو دوسروں کے ارادے سے چلتی ہے -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کو تعلیم کے میدان میں کس حد تک اور کن کن امور میں دخل دینا چاہئے ؟ جہاں تک تعلیم کی غایت کا تعلق ہے ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ حکومت کو اس پر کوئی دسترس نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس کا انحصار دو ایسے امور پر ہے جو حکومت کے اثر سے بالکل باہر ہیں ایک طرف تو قومی روایات ' قومی سیرت اور قومی ضروریات اور دوسری طرف خود متعلم کی نفسی زندگی ' اس کی طبیعت ' اس کی نشو و نما کے قوانین - انہیں دونوں کے باہمی تعامل اور اثر سے تعلیم کے مقاصد کا یقین ہوتا ہے - اگر حکومت ایک منظم اور با اختیار جماعت ہونے کی حیثیت سے تعلیم کے مقاصد کو جزوی و کلی طریقہ پر معین کرے گی تو اس سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ خالص تعلیمی مقاصد سیاسی اور خارجی مقاصد کے لئے قربان کردیئے

پڑیں گے - عملاً اس خرابی کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ ملک کے تمام مختلف مدارس جن کے ماحول اور روایات اور ضروریات مختلف ہیں حکومت کے مقرر کئے ہوئے یکساں مقاصد کے حصول میں کوشاں ہوتے ہیں اور ان میں آزادانہ نشو و نما کی فضا پیدا نہیں ہوتی - اسی طرح مدرسے کے اندرونی معاملات یعنی طریقہ تعلیم اور نظم و نسق میں استادوں اور تعلیمی جماعتوں کو آزادی حاصل ہونی چاہئیے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق کام کریں اور نئے تجربوں کے ذریعے تعلیمی ترقی اور اصلاح ہوتی رہے - جب کبھی مدرسے کے تعلیمی معاملات میں حکومت کی دل چسپی ' مشورے ' ہمت افزائی ' عام نگرانی اور انفرادی کوششوں کی تنظیم کی حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم بے جان اور بے روح ہوکر رہ جاتی ہے - اس کی ایک جدید مثال یہ ہے کہ انگلستان میں جس قدر تعلیمی ترقی گزشتہ عرصے میں ہوئی وہ سب اس وقت سے جب حکومت کے تعلیمی محکموں اور افسروں نے مدرسوں پر سے اپنی آہنی گرفت ڈھیلی کردی -اس وقت مدرسوں کو ایک گو نہ آزادی نصیب ہوئی کہ خود اپنی تعلیم اور زندگی کی تعمیر کریں اور " بورڈ آف ایجوکیشن " کی حیثیت محض ایک مشورتی ادارے کی قرار پائی - ہمارا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ حکومت ' جو قومی زندگی کا سب سے منتظم اور زبردست ادارہ ہے ' نظام تعلیم سے بالکل سبکدوش ہو جائے - رفتار زمانہ کا تقاضا تو اس سے بالکل مختلف ہے یعنی یہ کہ حکومت ان تمام تعمیری کاموں میں پہلے سے زیادہ حصہ لے جو ملک کی بہبودی کے لئے ضروری ہیں - لیکن جہاں تک تعلیم کے میدان کا تعلق ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس مداخلت کی نوعیت بہت مختلف ہونی چاہئیے

اور حکومت کے لئے لازم ہے کہ اسے معقول اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے چند مخصوص فرائض انجام دے -

حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ تعلیم کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور وہ تمام انتظامات کرے جو ایک وسیع نظام تعلیم کو کامیابی کے ساتھہ چلانے کے لئے ضروری ہیں - ایک نہایت ضروری کام مدرسوں کے لئے موزوں عمارتیں اور وہ سامان مہیا کرنا ہے جس کے ذریعے بچوں کی تعلیم موثر اور خوشگوار بنائی جاسکے - گذشتہ سو سال میں اس لحاظ سے اکثر متمدن ممالک میں نہایت زبردست ترقی ہوئی ہے کیونکہ حکومت اور ماہرین تعلیم دونوں نے اس کوشش میں شرکت کی ہے کہ مدرسے کو ایک ایسا ماحول بنائیں جہاں بچے خود بخود خوشی سے کام کریں ، کھیلیں ، مختلف مشاغل میں شریک ہوں اور اس طرح ان کی جسمانی اور دماغی نشو و نما آزادی کے ساتھہ ہوسکے - مدرسے کے ماحول کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے لئے طرح طرح کے اہتمام کی ضرورت ہے - اس کا ایک جز و طبیعی ماحول کی درستی ہے - "مدارس عمل" (Activity Schools) قائم کرنے کی جو تحریک گذشتہ چند سال میں یورپ اور امریکا کے بعض ملکوں میں جڑ پکڑ چکی ہے اس کا ایک نمایاں عنصر ان مدرسوں کا طبیعی ماحول ہے - ڈاکٹر فیریر (Ferriere) نے جو سوئستان اور وسطی یورپ میں اس تحریک کے قائدین اعظم میں سے ہیں اپنی کتاب "L'Ecole Active" (مدرسہ عمل) میں پورا ایک باب اس بحث کی نظر کیا ہے کہ مدارس جدید کا طبیعی ماحول کیسا ہونا چاہئے - اسی طرح بلجیم کے ایک مشہور ماہر تعلیم واس کونسلو (Vasconcellos) جنھوں نے جنگ یورپ سے چند سال پیشتر ایک تجربی مدرسہ قائم کیا تھا

اپنی کتاب [۱] میں اسی مدرسے کا حال لکھتے ہوئے نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ مدرسے کی عمارت ' ساز و سامان آلات تعلیم اور گرد و پیش کی فضا بچوں کے جسم اور سیرت کی نشو و نما پر کیا اثر ڈالتی ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی چھوٹی سی کتاب (School and Society) (مدرسہ اور معاشرہ) میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے اسکول کے فرنیچر کی اهمیت معلوم ہوتی ہے - بہت سال گزرے ایک معلم نے نیو یارک کی تمام بڑی بڑی دکانوں کا گشت لگایا جہاں اسکول کا فرنیچر فروخت ہوتا تھا - اور ایک خاص قسم کے ڈسکوں اور کرسیوں کی تلاش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی - ایک دوکاندار نے جو دوسروں سے زیادہ سمجھدار تھا معلم موصوف کا مطلب سمجھہ کر جواب دیا - " اچھا آپ کو ایسے ڈیسکوں کی تلاش ہے جس پر طلبہ کام کرسکیں لیکن ہم لوگ جو ڈسک بناتے ہیں وہ تو اس لئے ہوتے ہیں کہ طلبہ ان پر بیٹھہ کر اُستاد کے لکچر سن سکیں "- اس قصے سے پروفیسر موصوف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کچھہ عرصہ پہلے مدرسوں میں اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ طلبہ خود کوئی عملی کام کرسکیں بلکہ وہ اُستاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بے حس و حرکت بیٹھہ کر اس کے سبق کو سنتے تھے یا سوالات کا جواب دیتے تھے اور جب موقع ملتا تھا تو اس خلاف فطرت خاموشی کے بدلے میں بے تحاشا اودھم مچاتے تھے - بہر حال اُس وقت سے اب تک امریکا کے مدرسوں میں بہت کچھہ تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور ان کے فرنیچر تک میں اس قدر ترقی ہوگئی ہے کہ ایک ناواقف شخص کو ' جو نئے تعلیمی خیالات سے

---

[۱] Une Ecole Nouvelle in Belge جس کا ترجمہ انگریزی میں A New School in Belgium کے نام سے شائع ہوا ہے -

آگاہ نہیں ہے کسی جدید مدرسے کو دیکھکر یہ پہچاننے میں بھی دقت ہوگی کہ یہ عمارت کسی تعلیم گاہ کی ہے یا بچوں کے کھیلنے، تفریح کرنے اور دستکاریاں سیکھنے کے لئے ہے - اس لحاظ سے ہمارا ملک بہت پیچھے ہے کیونکہ ہمارے مدرسے کیا به لحاظ عمارت کے اور کیا به لحاظ سامان کے بالعموم نہایت ابتر حالت میں ہیں - اس کی ایک وجہہ تو یقیناً ملک کا افلاس ہے لیکن اسی کے ساتھہ اس کی ذمہ داری پبلک اور محکمہ تعلیم کی بے حسی پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ ان کو یہ احساس ہی نہیں کہ بچوں کی نشو و نما میں ایک موزوں ماحول کو کس درجہ دخل ہے - ورنہ باوجود روپئے کی کمی کے بھی یہ ممکن ہے کہ شہری اور دیہاتی مدرسوں میں بہت کم خرچ سے ایسی چیزیں مہیا کی جائیں جو طلبہ کے لئے مفید اور آرام دہ ثابت ہوں - مگر بالعموم سوائے خال خال خوش قسمت مدرسوں کے ' اور کہیں ہمیں سوائے ٹوٹے پھوٹے ڈسکوں، بنچوں اور چند نقشوں اور سیاہ تختوں کے کچھہ بھی نہیں ملتا - پھر ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ ایک ایسی عمارت میں بچے دل چسپی کے ساتھہ ہر روز کئی گھنٹے گذار سکیں اور ان مدرسوں کے گرد ایسی روایات مجتمع ہو جائیں جن کو نوجوانوں کی نسلیں یکے بعد دیگرے عزیز رکھیں ؟ وہاں ان کے مذاق کی اصلاح اور تربیت کیسے ہوسکتی ہے ؟ تعلیمی اصلاح کا ایک اہم تقاضا یہہ ہے کہ مدرس اور محکمہ تعلیم دونوں اس جانب توجہہ کریں اور مدرسوں کی مادی حالت کو بہتر بنائیں اور حکومت کا فرض ہے کہ اس کوشش میں ان کی مدد کرے -

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت کے فرائض میں قومی تعلیم کے مصارف کامہیا کرنا بھی شامل ہے - گزشتہ دو

صدیوں کے اندر اندر اکثر حکومتوں نے یہ ذمہ‌داری قبول کرلی ھے اور
ان کے سالانہ بجٹ کا مطالعہ کرنے کے لئے معلوم ھوتا ھے کہ ان کے تعلیمی
اخراجات سال بہ سال نہایت تیزی کے ساتھہ بڑھتے جاتے ھیں کیونکہ
انھوں نے محسوس کرلیا ھے کہ تعلیم پر خرچ کرنا ایک ضروری مصرف
ھونے کے علاوہ قومی کفایت کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ھے - اگر صحیح قسم
کی تعلیم ملک میں رائج ھو تو اس بے شمار رقم میں بہت کفایت ھو
سکتی ھے جو اس وقت مختلف قسم کے جیل خانوں ' اسپتالوں ' مجرموں
کی بستیوں اور دیگر تعزیری انتظامات پر صرف ھوتی ھے - پہلی نظر
میں یہ دعویٰ بہت مبالغہ آمیز معلوم ھوتا ھے اور اس کی تردید میں
ایسے اعداد و شمار پیش کئے جاسکتے ھیں جن سے ثابت ھوتا ھے کہ
بعض ملکوں میں تعلیم کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ تعداد اور نوعیت
دونوں کے اعتبار سے جرائم بہت بڑہ گئے ھیں - لیکن اس اضافے کی
ذمہ‌داری ناقص اور نا مکمل تعلیم پر ھے اور اس علامت یر ھے جو تربیت
کی طرف سے برتی جاتی ھے نہ کہ نفس تعلیم پر ! ڈاکٹر کرشن اشٹائنر
(Kerschensteiner) نے جو جرمنی کے ایک نہایت زبردست تعلیمی
مفکر اور منظم ہے اور جن کا انتقال حال ھی میں ھوا ھے اپنی کتاب
" Schools and the Nation " (مدرسے اور قوم) میں تعلیم کے اس
اصلاحی اور کفایتی پہلو پر زور دیا ھے - ھندوستان میں بھی گذشتہ
پچاس سال میں مقابلتاً تعلیمی بجٹ میں بہت اضافہ ھوا ھے لیکن
ضروریات کے لحاظ سے موجودہ تعلیمی بجٹ بالکل ناکافی ھے اور
ھندوستانیوں کو حکومت سے ایک عام شکایت یہ ھے کہ وہ فوجی مصارف
میں ملک کے مداخل کا تقریباً نصف خرچ کر دیتی ھے اور تعلیم پر اس کا
بہت تھوڑا حصہ صرف ھوتا ھے - مالی دقتوں کی وجہہ سے حکومت نے

اب تک نہ تعلیم کی توسیع کے لئے کافی وسائل بہم پہنچائے ہیں نہ موجودہ تعلیم کی اصلاح ' بہتری اور استحکام میں اسے کامیابی ہوئی ہے - اُس ذمہ‌دار ہندوستانی حکومت کو جو جدید آئینی اصلاحات کے نافذ ہونے پر وجود میں آئے گی بہت جلد اس مسئلہ سے سابقہ پڑے گا اور بجٹ بنانے کے تمام پرانے اصولوں کو بدلنے کے بعد اس میں تعلیمی مصارف کو وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوگی جس کے وہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستحق ہیں - یہ سوال قومی زندگی اور فلاح کے لئے نہایت درجہ اہم ہے اور اگر ہمیں ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام سے پیچھے رہنا گوارا نہیں تو ہمیں بھی تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے لئے اسی مستعدی اور یک جہتی کے ساتھ جدوجہد کرنی پڑے گی جس طرح مثلاً روس میں انقلاب کے بعد سے ہو رہی ہے - ہم اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ تیس چالیس برس پہلے کی حالت سے نہیں کرسکتے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس زمانے میں دوسرے ملک جن کے دوش بدوش ہمیں چلنا ہے ' کیا کر رہے ہیں اور تعلیم پر کس قدر صرف کر رہے ہیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حکومت کے تعلیمی مصارف میں محض یہی خرچ شامل نہیں کہ اعلیٰ اور ثانوی مدارس قائم کئے اور چلائے جائیں اور غیر سرکاری مدرسوں کو امداد دی جائے - تمام متمدن ممالک میں لازمی ابتدائی تعلیم کا اجرا ہوچکا ہے یا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ یہ تعلیم مفت دی جائے تاکہ ملک کے تمام بچے اس سے مستفید ہوسکیں - اس خرچ کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے - مگر یہ ذمہ داری یہیں ختم نہیں ہوجاتی - ایک فرض شناس حکومت کا کام یہ بھی ہے کہ مالی امداد کے ذریعے سے جہاں تک ممکن ہو ان رکاوٹوں کو دور کرے جو غریب طلبہ کی راہ میں حائل ہیں تاکہ

وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں اطمینان کے ساتھہ اپنے کام میں مشغول رہ سکیں اور امیر و غریب کا فرق کم سے کم مدرسے میں ان کو حتی الامکان محسوس نہ ہو - اکثر متمدن حکومتوں نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا ھے اور اپنی اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق ایسے انتظامات کئے ھیں جن سے غریب طلبہ اور ان کے والدین کی مشکلات میں کمی ہوگئی ھے - چنانچہ یورپ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں جو تعلیمی قوانین حال میں نافذ ہوئے ھیں ان میں یہ امر بھی شامل ھے کہ حسب ضرورت حکومت طلبہ کی خوراک اور لباس کے مصارف میں امداد دے گی تاکہ ناقص یا ناکافی خوراک اور لباس کی وجہہ سے ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑے - اسی طرح محکمہ حفظان صحت کا تعلق مدرسوں سے قائم کیا گیا ھے تاکہ وہ طلبہ کی نگہداشت کرے اور وقتاً فوقتاً طبّی معائنہ کرکے بیماریوں کی روک تھام اور صحت کے قیام کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لائے - بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار سے لگانے کے لئے بھی حکومت نے کوششیں کی ھیں اور جیسا ھم ذکر کرچکے ھیں بعض ملکوں میں ایسے دفتر (Employment Bureaus) قائم کئے گئے ھیں جن کا تعلق ایک طرف مدرسوں، ھیڈ ماسٹروں اور والدین سے ھے اور دوسری طرف صنعت و حرفت کے نظام اور مختلف پیشوں سے، اور وہ اپنی واقفیت اور تحقیق کی بناپر طلبہ کو مناسب کام حاصل کرنے میں مدد دیتے ھیں - علاوہ بریں غریب طلبا کو معقول وظائف دیے جاتے ھیں جس سے نہ صرف ان کی ضروریات پوری ھوتی ھیں بلکہ ایک حد تک ان والدین کی بھی دستگیری ھوجاتی ھے جو اپنے بچوں کو مدرسے بھیجنے کی وجہہ سے ان کی مالی امداد سے محروم ھوجاتے ھیں اور خود معذور ھونے کی وجہہ سے اپنی روزی نہیں کما سکتے -

حکومت کے ذمے یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ نظام تعلیم کی عام نگرانی اور رہنمائی کرے تاکہ مختلف مدارس کے تعلیمی معیار میں یکسانی رہے - اگر مناسب نگرانی نہ کی جائیگی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ بعض معلیم گاہیں اپنے تعلیمی فرائض کو محنت اور دیانتداری کے ساتھہ انجام نہ‌دیں گی اور ان کا معیار بہت گر جائے گا - محکمۂ تعلیم کو ایسی مناسب تجاویز اختیار کرنی چاہیئں جس سے معلموں کے دل میں اپنے فرائض کا احساس تازہ رہے اور انہیں بجالانے کی ترغیب ہو اور نئے تعلیمی تجربوں اور تحریکوں سے واقف ہونے کا موقع ملے - اسے ایسی عام ہدایات اُستادوں کی رہنمائی کے لئے شائع کرني چاہیئں جن پر اُستاد اپنے اپنے مقام پر عمل کرسکیں لیکن ان کی جائز آزادی میں فرق نہ پڑے - گذشتہ صدی تک انگلستان میں بورڈ آف ایجوکیشن (مرکزی مجلس تعلیم) اور اس کے کارکن گورنمنٹ انسپکٹر اُستادوں اور مدرسوں پر جابر جاسوسوں کی طرح مسلّط تھے - ان کے لئے صدر دفتر سے تفصیلی احکام جاری کئے جاتے تھے جن پر آنکھیں بند کرکے عمل کرنا اُستادوں کا کام تھا - وہ امتحانوں کے نتیجے کی کسوتی پر کسے جاتے تھے اور ان کا مستقل ہونا اور ترقی پانا سب کچھہ اس بات پر منحصر تھا کہ کسي طرح امتحانوں کا نتیجہ خاطر خواہ رہے اور اس طرح تعلیمی دیوتا خوش رکھے جائیں - لیکن یہ صورت حال اب بالکل بدل چکی ہے - بورڈ کا کام مشورہ دینا اور رہنمائی کرنا قرار پایا ہے - وہاں سے اُستادوں کے لئے مختلف تعلیمی مباحث پر رپورٹیں اور رسالے شائع ہوتے ہیں جو ان کو نئے راستے سمجھاتے ہیں - بورڈ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک عام معیار تجویز کردیتا ہے جس سے مدرسوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنھیں ایک مقررہ مدت میں کم و بیش اس قدر کام کرنا ہے اور پھر وہ

اس کے لحاظ سے اپنے کام کی تنظیم کرسکتے ھیں - اسی اصول پر انسپکٹر بھی کام کرتے ھیں - اس میں شک نہیں کہ ھر شخص کا نقطہ نظر بہت کچھہ اس کی طبیعت اور خیالات پر منحصر ھوتا ھے لیکن بحیثیت مجموعی اب انسپکٹروں کی جماعت کا کام پولیس کے سپاھیوں کی طرح معلموں کے جرائم اور کمزوریوں کی تفتیش کرنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان کو مدد دینا اور ان کو نئے تعلیمی طریقوں سے اور تجربوں سے روشناس کرنا ھے - بقول زمانۂ حال کے ایک مصنف کے " محکمہ تعلیم کا انسپکٹر ھیڈ ماسٹر کے پاس بیٹھہ کر سگرٹ کا کش لگائےگا اور دوستانہ گفتگو کے دوران میں اپنا وسیع تر تجربہ اس کے سامنے پیش کردےگا "

ممکن ھے ھندوستان کے بعض " دفتری " ذھنیت رکھنے والے انسپکٹر اور تعلیمی افسروں کو اس تصور سے غش آجائے لیکن امر واقعہ یہ ھے کہ محکمہ تعلیم کے نگران افسروں اور معلموں میں جب تک اس قسم کے امداد باھمی کے تعلقات قائم نہ ھونگے ملک میں تعلیمی اصلاح ممکن نہیں کیونکہ تعلیم بالخصوص ان مشاغل میں سے ھے جن میں دفتری ذھنیت اور بندشیں نقصان دہ ثابت ھوتی ھیں -

اُستادوں کی تعلیم کی ذمہداری بھی حکومت کے سر ھے کیونکہ اس اھم کام کو تمام تر افراد اور جماعتوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا - مدتوں تک لوگوں کا یہ خیال رھا کہ ھر شخص بچوں کو پڑھانے کا کام انجام دے سکتا ھے جو خود تھوڑا بہت پڑھا لکھا ھو - اس کے لئے کسی خاص تعلیم و تربیت یا انتخاب کی ضرورت نہیں - جب تک تعلیم خاص طبقوں تک محدود تھی اور افراد اپنی مرضی اور طبیعت سے تعلیم کے فرض کو اپنے ذمے لیتے تھے اس طرح کام چلتا رھا - طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور معلمی کا فرض اکثر

وہ لوگ انجام دیتے تھے جو کم از کم اپنے خیال میں اس سے کچھہ طبعی مناسبت رکھتے تھے - علاوہ بریں اس وقت مدرسہ یا معلم کا کام یہی تھا کہ اپنے شاگردوں کو علم سکھائے یعنی ان کو درسی کتابیں پڑھا دے - تعلیم کے دوسرے پہلوؤں یعنی کسب معاش اور تمدنی زندگی کی تیاری کی طرف معاشرہ خود توجہہ کرتا تھا - بچے مختلف قسم کے عملی کاموں اور معاشرتی مشاغل میں شرکت کرتے تھے اور اس طرح ان کی درسی تعلیم کی تکمیل زندگی کے مدرسے میں ہوتی تھی - لیکن اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے - تعلیم عام ہوگئی ہے اور کم از کم ابتدائی مدارج تک ہر بچے کے لئے مدرسے جانا ضروری ہے - زندگی کا نظام بہت پیچیدہ ہوگیا ہے اس لئے والدین اور پیشہ ور لوگ براہ راست اکثر کاموں کی تعلیم نہیں دے سکتے - اور بعض ملکوں میں جہاں صنعت و حرفت کی بے اندازہ ترقی نے انسانوں کو مشین اور زندگی کو ایک بندھا ہوا معمول بنا دیا ہے گھر کی زندگی کا قدیم نقشہ بھی بالکل بگڑ چکا ہے - حالانکہ یہی بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مرکز اور ان کی تربیت کا موثر ترین ذریعہ تھا - اس لئے یہ نئے فرائض بھی اب مدرسے کے ذمے پڑگئے ہیں - اور ہم ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ ہرکس و ناکس اس اہم فرض کو بجالائیگا خواہ وہ اس کام کے لئے با قاعدہ طور پر تیار کیا گیا ہو یا نہیں - جب اس تخصیص اور مہارت فن کے دور میں ہم معمولی کاموں کے لئے بھی با قاعدہ تعلیم یافتہ ماہرین کی تلاش کرتے ہیں اور اس امر پر مصر ہوتے ہیں کہ ڈاکٹری، انجینیری، زراعت غرض ہر قسم کے کام کے لئے ایسے آدمی مقرر کئے

جائیں جنھیں ان شعبوں میں خاص مہارت ہو تو یہ کیسے جائز رکھ جاسکتا ھے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایک ایسی جماعت کے سپرد کردیں جو اس اہم فرض کی اہلیت نہ رکھتی ہو - ہم جانوروں اور انسانوں کی جسمانی صحت کی نگہداشت اور پھولوں اور پودوں کی نشو و نما کا انتظام جاہل اور نا واقف لڑکوں کے سپرد نہیں کرسکتے - مگر یہ کیسے تعجب کی بات ھے کہ صدیوں تک انسانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایسے اشخاص کے ھاتھوں میں رکھا جن کو اس فرض کی ادائیگی کی کوئی تعلیم نہیں دی گئی تھی - اگر ان میں سے کوئی اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے اچھا معلم نکلتا تو یہ طلبہ کی خوش قسمتی تھی ورنہ بالعموم وہ لوگ جو دوسرے کاموں میں نا کامیاب رہتے یا ابتدا ھی سے اور کاموں کے لئے نا قابل ھوتے وہ بچوں کو پڑھانے کے لئے مدرسہ کھول دیتے تھے - انگلستان میں گزشتہ صدی تک یہ حالت دیکھنے میں آتی تھی اور مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس (Charles Dickens) نے اپنے سحر نگار قلم سے سکویرز (Squeers) کے مدرسے کی جو تصویر کھینچی ھے اس میں مبالغے کی چاشنی ضرور ھے لیکن نہ وہ خلاف واقعہ ھے نہ غیر معمولی - ھمارے ملک میں بدقسمتی سے اب بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے مدرسے ایسے ھیں جن میں بالکل نا قابل استاد نہایت کم مشاھرہ پر بچوں کو پڑھانے نہیں - بلکہ پڑھاتے کیا ھیں اپنا وقت اور ان کی عمر ضائع کرتے ھیں - ھر وہ شخص جو کسی شہر یا قصبے میں مقامی اھمیت اور حیثیت حاصل کرنا چاھتا ھے چندے سے تھوڑا بہت روپیہ اکٹھا کرکے ایک مدرسہ کھول دیتا ھے اور اس میں کم سے کم تنخواہ پر اکثر ایسے استاد "معلم" رکھہ لیتا ھے جو معلمی تو کیا کسی کام کے لئے بھی موزوں نہیں

ہوتے ۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے مدرسوں کی تعداد کو بڑھنے نہ دے کیونکہ ناقص تعلیم ' جو ایک خراب ماحول میں دی جائے ' ہرگز جہالت سے بہتر نہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک غیر ملکی حکومت کے لئے افراد کی تعلیمی کوششوں کو روکنا خطرہ سے سے خالی نہیں کیونکہ اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ تعلیمی جد وجہد اور تجربوں کی جائز آزادی میں فرق آجاے اور ملک میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے ۔ لیکن اب کہ تعلیم کا شعبہ بہت کچھہ ہندوستانیوں کے ہاتھہ میں آگیا ہے اور تھوڑے دنوں میں اس کی تمام تر ذمہ‌داری انہیں پر عائد ہوگی ہمیں اس معاملے میں جرات کے ساتھہ ایک سخت پالیسی اختیار کرنی چاہئے تاکہ محض جذبات سے متاثر ہوکر اور مروت میں آکر لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کو برباد نہ ہونے دیں ۔ محکمہ تعلیم کو اس بات پر اصرار کرنا پڑے گا کہ بالعموم مدرسوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جو باقاعدہ معلمی کے کام کے لئے تیار کئے گئے ہوں اس شرط سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہر سند یافتہ معلم لازمی طور پر قابل ہوتا ہے اور جو شخص کسی ٹریننگ سکول یا کالج کی چکی میں سے نہیں گذرا وہ معلمی کا کام کر ہی نہیں سکتا ۔ یہ امر مشاہدے اور تجربے کے خلاف ہے ۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے دل و دماغ اور سیرت میں قدرتاً وہ خصوصیات ہوتی ہیں جو معلم کے لئے لازم ہیں اور بعض لوگ با وجود اعلیٰ درجہ کی فنی تعلیم کے معلمی کے لئے بالکل نا اہل ثابت ہوتے ہیں ۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ امر مسلم ہے کہ اچھا معلم فنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنا کام اور زیادہ خوبی کے ساتھہ اور برا معلم اپنا کام قدرے بہتر کرسکتا ہے ۔ محکمہ تعلیم کو یہ حق

ہمیشہ حاصل ہونا چاہئے کہ خاص صورتوں میں بہت اچھے معلموں کو فنی تعلیم کی شرط سے بری کردے لیکن بالعموم حکومت کو محکمہ تعلیم کے توسط سے تمام معلموں کے لئے یہ تعلیم لازم کردینا چاہئے ۔ جن ملکوں میں گذشتہ پچاس سال میں تعلیمی ترقی ہوئی ہے اور یہاں تعلیمی ترقی سے ہمارا مطلب محض تعلیم کی توسیع نہیں بلکہ تعلیمی اصلاح بھی ہے۔ وہاں معلموں کی تعلیم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اس کی مدت بھی ہمارے ملک سے بہت زیادہ ہے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس تعلیم کو لازم قرار دینے سے پہلے اس کی اصلاح اور تنظیم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ وہ بے روح تعلیم جو عموماً ہمارے نارمل اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے ہرگز اس عظیم‌الشان فرض کے شایاں نہیں جو انہیں انجام دینا ہے ۔ اس لئے کہ استادوں کا کام اس زمانے میں محض بچوں کو چند علوم و فنون سکھا دینا نہیں بلکہ نئی نسلوں کی دماغی نشو و نما اور سیرت کی تربیت کے ذریعے قومی تنظیم میں حصہ لینا ہے ۔ مگر یہ مبحث بجائے خود اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ۔

حکومت کو ایک حق یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ کرے ۔ اس حق کا جواز کس بنا پر ہے ؟ اگر گھوڑے کو اس کی مرضی کے خلاف گھاٹ پر لے جانا اور مجبور کرکے پانی پلانا جائز نہیں تو کیا انسانوں کو جبری طور پر تعلیم دلانا جائز ہوسکتا ہے ؟ حکومت کا فرض اس پر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ملک میں ابتدائی مدارس کا ایک نظام قائم کردے اور لوگوں کو آزادی ہو کہ خواہ وہ اس سے مستفید ہوں یا نہ ہوں ۔ حکومت

معاشرے کے مقاصد اور اعراض کو عمل میں لانے کا ایک آلہ ھے - اس لئے اس کا فرض ھے کہ وہ تمام ایسے ذرائع اختیار کرے جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ھوں — اگر حکومت تعلیم کو اختیاری رکھے اور اس بات کو لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں تو اندیشہ ھے کہ بعض لوگوں کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے تمام معاشرے کے لئے خطرات پیدا ھو جائیںگے — تعلیم نہ صرف افراد کے لئے ضروری ھے کہ وہ اپنی زندگی کی باقاعدہ تنظیم کریں بلکہ حکومت اور معاشرے کے قیام کے لئے بھی وہ ناگزیر ھے خصوصاً جمہوری حکومتوں کے لئے کیونکہ وھاں ملک کا کاروبار چلانے کی ذمہ داری تمام تر لوگوں پر ھے - اگر ملک کے ھر باشندے کو کم از کم اتنی تعلیم نہ دی جائے جو اس کو اچھے شہری اور ملکی حقوق و فرائض سمجھنے میں مدد دے سکے تو اس کو ایک ذمہ دار شہری کا رتبہ کیسے دیا جاسکتا ھے اور وہ اپنے رائے دھندگی وغیرہ کے حقوق کا صحیح استعمال کیسے کرسکتا ھے ؟ اس صورت میں ملک میں جاھل اور ناواقف لوگوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ھو جائیگی جو باقی لوگوں کے لئے خطرے کا باعث ھوگی - ھندوستان میں آج کل یہ حالت بہت عام اور بہت اندیشہ ناک ھے ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد نہایت کم ھے اور آبادی کا بہت بڑا حصہ ان لوگوں کا ھے جو خواہ اپنے کام میں مستعد اور اچھے ھوں لیکن ابھی اُن حقوق و فرائض سے پوری طرح واقف نہیں جو ھندوستانی شہری کی حیثیت سے انہیں اس وقت حاصل ھیں یا بہت جلد حاصل ھونے والے ھیں - اس وجہ سے وہ بہت آسانی سے مختلف قسم کی نا معقول تحریکوں کا شکار ھو جاتے ھیں - ھر طرف سے سختیاں

اور حق تلفیاں سہتے ہیں اور کچھ نہیں کرسکتے - اس صورت حال کو جمہوری نظام حکومت کے قیام کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ـ بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ ملک میں بہت دیری کے ساتھ صحیح تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ جمہور اپنے نئے فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دے سکیں ـ یہ مقصد جمہوری حکومت کے قائم ہو جانے سے جلد تر حاصل ہوگا - عملی طور پر سیاسی اور مدنی تعلیم پانے کا موقع اسی صورت میں مل سکتا ہے -

تعلیم اور حکومت کا باہمی تعلق مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوگیا ہوگا ـ ہم نے بتا دیا ہے کہ بالعموم حکومت پر تعلیم کے متعلق کیا فرائض عائد ہوتے ہیں - لیکن علاوہ اس ظاہری تعلق کے حکومت اور تعلیم کی ماہیت میں بھی ایک گہرا رشتہ ہے جس کو نظام تعلیم سے زیادہ تعلیم کی روح اور غایت سے سروکار ہے - ہم نے پہلے باب میں صراحت کے ساتھ ظاہر کردیا ہے کہ تعلیم کو اپنے ماحول کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی ماحول ہو یا معاشرتی اور اگر اس ماحول میں تبدیلیاں واقع ہوں تو تعلیم کے منشا اور مفہوم پر اس کا اثر یقیناً پڑتا ہے - گذشتہ دو صدیوں میں حکومت کے نظام اور فلسفہ سیاست میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ، جن کو انقلاب فرانس نے استحکام اور قبول عام بخشا ہے ، انہوں نے تعلیم کے نئے نئے مسائل پیدا کردئے ہیں اور اب ہمیں اس پر غور کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ ان سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے تعلیم میں کیا تبدیلیاں لازم ہوگئی ہیں - ہندوستان میں اس مسئلہ کی فوری اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمیں عنقریب نظام

حکومت میں ان تبدیلیوں اور ذمہ داریوں سے سانتہ بڑنے والا ہے جو دنیا کے بیشتر ملکوں میں اس وقت پائی جاتی ہیں -

حکومت کا جو تصور آج کل ہمارے ذہن میں ہے وہ اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا - افلاطون نے نظام حکومت کا جو تخیلی خاکہ اپنی ریاست میں پیش کیا ہے اس میں اور موجودہ فلسفہ سیاست میں یہ بات ضرور مشترک ہے کہ دونوں حکومت کو افراد کی فلاح اور بہبود کا ضامن سمجھتے ہیں - لیکن افلاطون کے نظریہ حکومت میں ملک کے تمام افراد کے حقوق یکساں نہیں ہیں - وہ جنگ آزماؤں اور حکم رانوں کے لئے تعلیم کا ایک نظام پیش کرتا ہے جس کے ذریعے ان میں اپنے مخصوص فرائض کی ادائگی کی اہلیت پیدا ہو لیکن اس سب سے بڑے طبقے کا کوئی ذکر نہیں کرتا جس میں مزدور اور دولت کمانے والے لوگ شامل ہیں - وہ تعلیم کو حکومت کے اہم ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقی جمیعت مانتا ہے - ڈاکٹر ذاکر حسین خاں افلاطون کی " ریاست " کے مقدمے لکھتے ہیں -

" فلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمیعت مانا جاتا تھا یعنی ایسی جمیعت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو - اس لئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اِس مشترک متاع روحانی میں

اچھے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اهتمام
کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ
بنادے جس میں رہ کر هر شخص اپنی
صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس
مشترک متاع روحانی کے ذریعہ دوسرے
افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے - اس متاع
مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین
تھے جن پر عمل پیرا هونا جماعت کی
فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا
جاتا تھا - فلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی
مقصد کا قائل ہے وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست
میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام
افراد کو جمیعت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور
انہیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے " [۱]

لیکن ریاست کے افراد کو اس نے دو مختلف جماعتوں
میں تقسیم کردیا ہے - اس میں ایک جماعت " فلسفی حکمرانوں "
یا " فلسفی بادشاهوں " کی هوگی جن کو بہترین معاشرتی
اور انفرادی تعلیم دی جائے گی ' جو عقل مند ' فیاض اور باخبر
هونگے اور رعایا کی ضرورت اور بہتری کو بخوبی سمجھ سکینگے -
ان کا فرض یہ هوگا کہ وہ قانون بناکر ریاست کے لئے انہیں نافذ
کریں اور باقی لوگوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ بے چوں و چرا

---

[۱] افلاطون کی Republic کا ترجمہ " ریاست " کے نام سے انجمن ترقی
اردو اورنگ آباد نے شائع کیا ہے - دیکھو صفحہ ۱۸ -

اس قانون کی پابندی کریں - کیونکہ وہ عقل کل فلسفی جو قانون بھی بنائینگے ان کی اطاعت لوگوں کے لئے سراسر بہتری کا باعث ہوگی - اس معاشرے کے لئے اس نے وهی نظام تعلیم تجویز کیا جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - یعنی کچھ لوگوں کو جن میں اعلیٰ صلاحیت ہو منتخب کرکے ان کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ حکمرانی کے قابل بنیں اور باقی لوگوں کو اطاعت اور فرماں برداری سکھائی جائے تاکہ ریاست کے سب کام عمدگی کے ساتھ چل سکیں - یہ کہنا غلط ہے کہ فلاطون کو تعلیم کی تمدنی اهمیت کا احساس نہیں تھا - اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے ماہرین تعلیم کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ معاشرے کے قیام اور اس کی اصلاح میں تعلیم کا کیا درجہ ہے - لیکن وہ وقتی اور مقامی حدود سے باہر نہیں نکل سکا اور اس کے خیالات قدرتی طور پر ان حالات سے متاثر ہوئے جو اس زمانے کے معاشرے میں پائے جاتے تھے - اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے ان جماعت بندیوں اور معاشرتی اور اقتصادی اختلافات کو مستقل اور دائمی سمجھ لیا تھا جن کی وجہ سے اس کے زمانے میں یونانی معاشرہ مختلف طبقوں میں منقسم ہوگیا تھا - یہی وجہ تھی کہ اس نے مختلف جماعتوں کے لئے مختلف قسم کی تعلیم تجویز کی جس کی بنیاد محض نفسی اختلافات پر نہ تھی -

اُس زمانے کے حالات اور نظام معاشرت کے لحاظ سے ہم اس نظام تعلیم کو غیر مناسب نہیں کہہ سکتے گو ہمارے اخلاقی اصولوں کے مطابق وہ قرین انصاف نہ ٹھہرے - لیکن اس وقت سے اب

تک جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں انہوں نے ہماری زندگی کے سیاسی ماحول میں کایاپلٹ کردی اور اس کے لئے یہ نظام تعلیم کسی طرح موزوں نہیں ہوسکتا - یہ صحیح ہے کہ اب تک ہماری معاشرت اور تعلیم دونوں میں ایسے اثرات موجود ہیں جنھوں نے معاشرے کو علیحدہ علیحدہ طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اس میں پوری طرح یک جہتی اور باہمی ربط موجود نہیں - لیکن جوں جوں جمہوری نظام مستحکم ہوتا جاتا ہے اور لوگ اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے جاتے ہیں یہ تفرقے کم ہو رہے ہیں اور مروجہ رسمی اختلافات بھی مٹ رہے ہیں - سیاسی نقطہ نظر سے تعلیم کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس تحریک کو قوت پہنچائے اور جمہوریت کو سطحی معنوں میں نہیں بلکہ حقیقی اور گہرے معنی میں ملک میں رائج کرے -

جمہوری حکومت کا تصور سیاست کی تاریخ میں کوئی جدید تصور نہیں - انقلاب فرانس سے پہلے بھی اس کی مثالیں مختلف زمانوں میں بالخصوص اسلام کے ابتدائی دور میں ملتی ہیں لیکن بحیثیت ایک عملی سیاسی نظام کے اس نے انقلاب فرانس کے بعد ہی رواج پایا ہے - اس کی نمایاں سیاسی خصوصیت اور پہچان کیا ہے ؟ شخصی حکومت میں فرماں روائی کی قوت جو کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے قوم سے بالکل آزاد ہوتی ہے اور فرماں روا ، قوم سے برتر یا جدا سمجھا جاتا ہے - ممکن ہے یہ بادشاہ یا فرماں روا لوگوں کی مرضی اور رضا جوئی کا خیال کرے لیکن اس پر ایسا کرنا لازم نہیں - اُسے اختیار ہے کہ وہ ایسا کرے یا نہ کرے - برخلاف اس کے جمہوری نظام میں کم از کم نظری طور پر قوم کی متفقہ رائے اور ارادے کی حکومت ہوتی ہے یعنی حکومت بجائے ایک خارجی

ارادے کے ایک داخلی قوت بن جاتی ھے جس کی حامل قوم کی نمائندہ جماعتیں ھوتی ھیں - اور اُن کے مشورے سے اور اُن کی نگرانی میں حکومت کے کاروبار انجام پاتے ھیں - سیاسی آزادی کا موجودہ تصور یہ ھے کہ لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتیوں کو بے روک ٹوک نشو و نما کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے تربیت یافتہ ارادے اور آزاد رائے سے وہ راہ اختیار کریں جو اپنے لئے اچھی سمجھتے ھیں - اُن پر جبراً ایسے قاعدے اور قوانین عائد نہ کئے جائیں جو دوسرے لوگ اُن کے حق میں اچھا سمجھیں - البتہ یہ شرط ضرور ھے کہ وہ اس آزادی کے استعمال میں دوسروں کی جائز آزادی میں مداخلت نہ کریں - جب ھم اس اصول کا اطلاق تعلیم پر کرتے ھیں تو اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ تمام لوگوں کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ خود اپنا برا بھلا سمجھیں اور اپنے ذاتی اور معاشرتی فائدے کو اچھی طرح پہچان کر اس کے حصول کی کوشش کریں - بہ‌الفاظ دیگر ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ چونکہ جمہوری حکومت کا کاروبار قوم کے تمام بالغ افراد کی رائے دھندگی پر منحصر ھے اور اس میں براہ راست یا بذریعہ نیابت سب لوگ شریک ھیں اس لئے اس میں ھرگز اُس وقت تک کامیابی نہیں ھو سکتی جب تک جمہور میں ذمہ‌داری اور سیاسی اور معاشرتی معاملات کی سمجھ پیدا نہ ھو - یہ ممکن ھے کہ شخصی حکومت بغیر رعایا کے تعاون کے بغیر اُن کو تعلیم دئے ایک حد تک کامیاب ھو جائے لیکن جمہوری حکومت کی کامیابی کے لئے ایک وسیع ھمہ گیر اور مناسب نظام تعلیم شرط لازم ھے - انیسویں صدی کے ایک مشہور انگریز مدبر نے کہا تھا کہ " اب ھمیں اپنے آقاؤں کی تعلیم کی فکر کرنی چاھئے " - اس کا مطلب یہ تھا کہ اب سیاسی انقلاب کی وجہہ سے جماعتوں کی قوت کا توازن درھم برھم ھو گیا اور حکومت کے اختیارات رفتہ رفتہ چند لوگوں کے ھاتھہ سے نکل کر عوام کے ھاتھہ میں

آگئے ہیں جو صدیوں سے جہالت یا بے حسی میں گرفتار ہیں اور اپنی طاقت سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے - یہ نقطۂ خیال محض جمہوریت کا پیش خیمہ ہے اصل جمہوریت اس وقت شروع ہوتی ہے جب " آقاؤں اور " نوکروں " کا یہ امتیاز جس میں استہزا کی جھلک نظر آتی ہے بالکل اُٹھ جائے -

ایک تعلیمی اصول مدت سے یہ چلا آتا ہے کہ " تعلیم کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے " اور اس اصول کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مقصد کے لئے حسب ضرورت استعمال کیا ہے لیکن اس اُصول کے سمجھنے میں اکثر لوگ ایک غلطی کرتے ہیں جس کا صاف کرنا ضروری ہے - ہم یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ایسا زمانہ تو کوئی بھی نہ ہوا جب تعلیم کو سیاست سے نہایت قریبی تعلق نہ رہا ہو - قدیم زمانے سے اب تک ہمیشہ حکومت کی غالب جماعتوں نے یہی کوشش کی ہے کہ مدرسوں کی تعلیم کے ذریعے نوجوانوں کے سیاسی خیالات پر اثر ڈالیں - اس قسم کی اثر اندازی کو ہم تعلیمی لحاظ سے جائز قرار نہیں دے سکتے - نوعمر لڑکوں کے دماغ میں قبل از وقت جب ان کی قوت فیصلہ میں پختگی نہیں آتی کسی قسم کے سیاسی خیالات ٹھونسنا سراسر نامناسب ہے کیونکہ وہ ان کی آزادی فکر اور دماغی نشو و نما کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے - لیکن یہ اعتراض اس سیاست پر عائد ہوتا ہے جس کا تعلق کسی خاص پارٹی یا جماعت سے ہوتا ہے اور جو بجائے سیرت کی تربیت میں معین ہونے کے عقل اور دماغ کو چند یک طرفہ اور محدود خیالات میں جکڑ بند کر دیتی ہے - سیاست کا ایک مفہوم زیادہ وسیع اور عام ہے جس کا تعلق تمام قوم سے ہے - اس مفہوم کے مطابق سیاسی احساس صحیح حب وطن کی بنیاد ہے - وہ بچوں اور نوجوانوں کو اُن کے حقوق و فرائض

سے آگاہ کرتا ھے اور اُن کے دلوں میں انحصار باھمی اور ذمہ‌داری کے احساس کو تازہ رکھتا ھے - یہ وہ قوت ھے جو کسی ملک یا قوم کے افراد کو ایک رشتہ میں منسلک کردیتی ھے اور اُن اثرات کو جو انتشار کا باعث ھوتے ھیں روکتی ھے - اس سیاست کو کسی حالت میں تعلیم اور مدرسے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ مدرسوں کا فرض ھے کہ وہ اپنے طلبہ کو شہریت کی تربیت دیں اور اُن کی تعلیم کو محض رسمی اور نظری علوم تک محدود رکھنے کے بجائے انہیں معاشرت اور سیاست کے زندہ مسائل سے روشناس کریں جو آج کل کی متمدن دنیا میں عموماً اور خود اُن کے ملک میں خصوصاً نہایت درجہ اھمیت رکھتے ھیں - شخصی حکومت کے دور میں سیاست کو مدرسے میں دخل دینا غیر ضروری اور غیر مفید ھے کیونکہ اس حالت میں بے غرضی کے ساتھ اس کام کو انجام دینا تقریباً ناممکن ھے - مگر جمہوری حکومت کے قیام اور استحکام کے لئے صحیح قسم کی سیاسی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اسی کے ذریعہ سے آئندہ شہری ان تمام مسائل اور فرائض سے واقف ھوسکتے ھیں جو انہیں پیش آنے والے ھیں - اس میں بھی یہ اندیشہ ضرور ھے کہ اگر معلموں کا انتخاب اور نصاب تعلیم کی تدوین بہت احتیاط سے نہ کی جائے گی تو شہریت کی تعلیم کے بھیس میں فرقہ وارانہ سیاست کے اثرات طلبہ پر ڈالے جائینگے - لیکن اول تو ھر کام میں حذر کرنے کے قابل ھوتا ھے خطرے ھوتے ھیں - مگر ان کی وجہہ سے کوئی دانشمند اس کام کو ترک نہیں کرتا بلکہ ان خطرات کو دور کرنے کی تدبیریں کرتا ھے - دوسرے اگر جمہوری حکومت صحیح اصولوں پر قائم ھو اور رفتہ رفتہ لوگوں میں جمہوری ذھنیت پیدا ھو جائے تو اُن کے اغراض و مقاصد میں اس درجہ ھم آھنگی پیدا ھوجاتی ھے کہ سیاسی فرقہ بندیوں کے مضر اثرات مقابلتہً کم ھوجاتے ھیں اور سیاست کو مدرسوں

میں دخل دینے میں نقصان کا زیادہ امکان نہیں رہتا - مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کی وجہہ سے جو کسی نہ کسی شکل میں آج کل ہر ملک میں جاری ہے۔ ابھی تک صحیح جمہوری ذہنیت پیدا نہیں ہوسکی اور مثلاً انگلستان میں جہاں کم از کم جمہوری ادارے مدتوں سے قائم ہیں آئے دن یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ مختلف پارٹیاں مدرسوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوششیں کرتی ہیں - مگر باوجود اس کے بھی بعض مقاصد تمام جماعتوں میں مشترک ہیں جو باسلوب مناسب شہریت کی تعلیم کے ضمن میں مدرسوں میں سمجھائے جاسکتے ہیں - اور جب ان زبردست سیاسی حریفوں میں ایک حد تک اغراض کی ہم‌آہنگی پیدا ہوگی تو صورت حال بہت بہتر ہوجائے گی - ہندوستان میں باوجود تمام اختلافات کے بھی یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ شہریت کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے اور ابھی گذشتہ چند سال کے اندر مختلف تعلیمی محکموں نے اسے مدرسوں میں رواج دیا ہے - صوبجات متحدہ میں ہائی اسکول کی اعلیٰ جماعتوں میں حال ہی میں مدنیات (Civics) نصاب میں داخل ہوئی ہے -

جمہوری حکومت محض اسی وجہ سے دوسری حکومتوں سے مختلف نہیں کہ اس میں ملک کے انتظام کا طریقہ ، حکم رانوں کا تقرر ، اور اختیارات کی تقسیم مختلف ہوتی ہے بلکہ اس کے ماتحت جو معاشرہ نشو و نما پاتا ہے اس کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی ہے - اس معاشرے کے لئے لازم ہے کہ اس کے افراد اور جماعتوں میں باہمی ربط اور میل جول، تبادل خیالات اور شرکت عمل بہت زیادہ ہو اور وہ تمام بندشیں اور حدود جو انسانوں کو انسانوں سے علیحدہ رکھتی ہیں اور

ان کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کرتی ھیں
توڑ دی جائیں - یعنی یہ معاشرہ زیادہ متحرک ہوتا ھے ' تبدیلیوں
کو اور جدید اثرات کو جلد قبول کرتا ھے اور اس کے ماحول میں جو
نئے حالات اس کی اپنی کوششوں یا خارجی اسباب سے پیدا ہوتے ھیں
ان کے مطابق خود کو ڈھالتا رھتا ھے تاکہ وہ زمانے کے دوش بدوش
ترقی کرے ' اس سے پیچھے نہ رہ جائے - پروفیسر جیمز وارڈ
(James Ward) نے اپنی قابل مطالعہ کتاب " نفسیات تعلیم " [1]
میں دو قسم کے ماحول میں تمیز کی ھے - ایک ماحول وہ ھے جس
کی حالت کم و بیش یکساں رھتی ھے اس میں ایک ایسا مستقل
سکون پایا جاتا ھے کہ اس میں زندگی بسر کرنے والے اپنی عادتوں اور
افعال میں صدیوں تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے - اس قسم کے
افراد اور جماعتوں کو وہ ساکن مثالیں (Stationary types) کہتے
ھیں - برخلاف اس کے بعض افراد اور جماعتیں ایسی ھیں جو اپنے
ماحول کے ساتھہ اتنی ھم آھنگ نہیں ھیں کہ اُن کے نظام اور افعال
میں تبدیلی کی ضرورت ھی نہ ھو - ان کو مسلسل نئے تجربوں اور
تبدیلیوں سے سروکار رھتا ھے - اور یہ جماعتیں اپنی کوشش اور جد و جہد
سے ایک طرف تو اپنے ماحول کو زیادہ پیچیدہ اور معنی خیز بناتی ھیں
اور دوسری طرف اس ماحول کے ساتھہ ھم آھنگ ہونے کی کوشش میں
افراد کی نشو و نما کے سلسلہ کو جاری رکھتی ھیں - اس طرح ان
" متحرک جماعتوں " (Dynamic Types) میں ایک حرکت پیہم پائی
جاتی ھے جس کی وجہ سے ان کے تمام اداروں اور نظام زندگی میں تبدیلی
اور نشو و نما ہوتی رھتی ھے - جمہوری معاشرہ اس قسم کی متحرک

---

[1] Psychology applied to Education -

جماعت کی بہترین مثال ہے کیونکہ اس میں افراد اور جماعتیں برابر اُوپر نیچے آگے پیچھے حرکت کرتی رہتی ہیں - اس کی زندگی مقررہ راستوں پر اور تنگ حدود کے اندر مقید نہیں رہتی بلکہ آزادی کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس میں نئے راستے تلاش کرنے کی آرزو اور نئے تجربے حاصل کرنے کا جوش ہوتا ہے - اِس لئے اس معاشرے میں جو تعلیم دی جائے وہ لازماً ایسی ہونی چاہئے جو نوجوانوں میں جدت اور اپج کا مادہ پیدا کرے اُن کو مناسب قدامت پرستی سے بچائے اور اُن کی تمام مخفی قوتوں کے لئے نشو و نما اور اظہار کے مواقع پیدا کرے - شخصی حکومت کی کامیابی کے لئے رعایا کی تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ وہ آنکھیں بند کر کے حاکم کے حکم کی تعمیل کرے اور اپنی سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت کو معطل رکھے - لیکن جمہوری حکومت جس کا دار مدار افراد کی ذاتی جد و جہد اور کاوش پر ہے ایسے لوگوں کی طالب ہے جو اپنی عقل اور قوت عمل دونوں سے کام لیں اور اپنے شوق اجتہاد کی بدولت نئے راستوں اور نئے تجربوں کی تلاش میں رہیں - اس قسم کے معاشرے میں جمود پیدا ہوجانا اس کی خرابی کی صریح علامت ہے - مشہور انگریزی مفکر برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب " تعلیم " (On Education) میں دونوں قسم کے معاشروں کی مثالیں دیتے ہیں - وہ کہتے ہیں [۱] کہ چین کا معاشرہ اور چین کی تعلیم اب سے کچھ عرصہ پہلے تک سکون اور جمود کی نہایت عمدہ مثال تھی - وہاں کی تہذیب نے اپنی انتہائی ترقی کے زمانے میں دو چیزیں پیدا کیں یعنی سکون و استقلال اور آرٹ - لیکن وہ نہ سائنس پیدا کر سکی نہ ترقی کی خواہش اور قابلیت - اس کا ذہنی میلان ایک

---

[۱] دیکھو صفحہ ۳۰ -

قسم کے فلسفۂ تشکیک (Scepticism) کی جانب تھا جس میں عقائد کی پختگی اور جوش و خروش نہ پایا جاتا تھا - جہاں کہیں یہ جوش اور حرکت پائی جاتی ہے وہاں اس کا نتیجہ یا تو انتہائی ترقی ہوتا ہے یا تباہی سکون ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا - پرانی یونانی تعلیم بالخصوص ایتھنز (Athens) کی تعلیم میں یہ بات پائی جاتی تھی - کیونکہ یونانی لوگ چینیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صاحب قوت اور صاحب حوصلہ تھے - وہ ان دونوں کا فرق سمجھانے کے لئے ایک دل چسپ مثال دیتے ہیں :
" سیاست اور حب وطن کے جوش میں یونانیوں کو اپنی قوت کے اظہار کے عملی موقعے ملتے تھے - جب کوئی سیاسی لیڈر اپنے وطن سے نکال دیا جاتا تھا تو وہ ایک چھوٹی سی فوج جمع کرکے اپنے وطن پر حملہ کردیتا تھا - برخلاف اس کے اگر کوئی چینی افسر معزول کر دیا جاتا تھا تو وہ پہاڑوں میں کوئی جائے پناہ ڈھونڈھ لیتا تھا اور وہاں دیہاتی زندگی کے مسرتوں اور لطف کے متعلق نظمیں لکھتا تھا " - موجودہ زمانے میں متحرک سوسائٹی کی مثال امریکہ اور یورپ کی بعض اقوام ہیں جنھوں نے سائنس کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا ہے اور اس کے ذریعے سے وہ قوت حاصل کی ہے جس کے بغیر آج کل کی دنیا میں جہاں مقابلہ اور جنگ و جدل کا دور دورہ ہے بسر ہونی مشکل ہے - موجودہ زمانے میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے بقول رسل کے اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت نہیں جیسے انگلستان کے پبلک اسکول اور پرانی یونیورسٹیاں پیدا کرتی رہتی ہیں - یہ درسگاہیں اعتماد نفس ' اعتقاد راسخ ' مضبوطی اور حوصلہ مندی پر زور دیتی تھیں اور عقل ' ہمدردی اور انسانی احساس کو ان صفات پر قربان کردیتی تھیں - اس زمانے میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے " جو

میں تخیل اور ہمدردی زیادہ ہو ، جن کی عقل میں زیادہ رسائی ہو ، جو معاملات کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں ، جن کو کتنے کی سی بہادری اور استقلال پر کم اور فنی معلومات پر زیادہ بھروسہ ہو "۔

ہمارے لئے اس وقت یہ سوال در پیش ہے کہ ہندوستان میں اس وقت کس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں اور ان سے ہمارے تعلیمی مسائل کے متعلق کیا نتیجہ نکلتا ہے - ہندوستان سیاسی لحاظ سے اس وقت تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے - شخصی غیر ملکی اور دفتری حکومت کا باب اب ختم ہوا چاہتا ہے اور دیر سویر ختم ہو کر رہے گا اور اس کے بجائے ملک میں بہت جلد یا کچھ عرصہ کے بعد جمہوری نظام اور ادارے قائم ہونے والے ہیں - اس تبدیلی اور تغیر کے زمانے میں قدیم رسوم و عقائد اور جدید خیالات اور اداروں میں کشمکش ہو رہی ہے - ایک طرف وہ سکون اور قدامت پسندی لوگوں میں باقی ہے جس کی مثال میں رسل نے چینی تہذیب کو پیش کیا ہے اور دوسری طرف زمانے کے حالات اور تقاضے سے متاثر ہو کر ملک میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہوگئی ہے جو نئے سیاسی اور تمدنی تجربوں کے لئے تیار اور آمادہ ہے - اس کشمکش کے عرصے میں تعلیم کو نہایت اہم فرائض انجام دینے ہیں - اگر تعلیم کا اثر اور رحجان جمود اور قدامت پرستی کی طرف ہوگا تو نہ صرف آنے والی جمہوری حکومت کا تجربہ نا کامیاب ثابت ہوگا بلکہ علاوہ سیاست کے میدان کے ہمارا ملک زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ترقی نہ کرسکے گا اور دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیگا - بر خلاف اس کے اگر تعلیم گاہیں اور معلم اپنا تمام اثر جمہوری حکومت اور جمہوری معاشرے کے مناسب ذہنیت پیدا کرنے میں صرف کریں تو اس کے نتائج بہت گہرے اور وسیع ہوں گے کیونکہ ان کی مدد سے نوخیز

نسلیں اُن معاشرتی اختلافات اور تعصبات کو دور کر سکیں گی جو سوسائٹی میں حرکت اور تموج کو روکتے ہیں اور افراد کی مفید صلاحیتوں کو اُبھرنے نہیں دیتے - موجودہ ہندوستانی سیرت کی ایک قابل افسوس کمزوری یہ ہے کہ اس میں حوصلہ ' ہمت ' اپج اور مشکلات کو استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کی قوت کم ہے - وہ اپنی ذمہ داری پر بڑے بڑے کاموں کو شروع کر کے ان کو انجام تک نہیں پہنچاتے ہندوستانیوں کے لئے یہ بات باعث ننگ ہے کہ غیر ملکوں کے لوگ اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر ان کے سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچیں اور ان میں ایسے جان پر کھیلنے والے سیاح موجود نہ ہوں جن کے نصیب میں یہ سرخروئی آے - ان کے لئے یہ شرم کا موجب ہے کہ ان کے یہاں کی بیماریوں اور امراض کا علاج معلوم کرنے کے لئے یورپ اور امریکہ کے ماہرین فن جد و جہد کریں ' اپنا روپیہ صرف کریں ' اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور وہ خود اس جہاد میں پیش پیش نہ ہوں - ان باتوں کے تاریخی وجوہ جو کچھ بھی ہوں اور اس کی ذمہ داری اور الزام جس کسی پر بھی عائد ہو تعلیم کو بہر حال اس خرابی کا علاج کرنا ہے اور ملک کے افراد کو ان دشواریوں اور ذمہ‌داریوں سے عہدا برآ ہونے کی تربیت دینی ہے جس سے ان کو آگے چل کر سابقہ پڑے گا اور ان میں سائنس کی تعلیم کے ذریعہ تسخیر فطرت اور ترقی کی صلاحیت پیدا کرنی ہے - جب تک تعلیم میں ایک نئی روح نہ پھونکی جاے اور اس کو اُن جدید میلانات سے روشناس نہ کیا جائے جو جمہوری معاشرے کا خاصہ ہیں اس وقت تک ہندوستان کی آئندہ حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی ان میلانات میں ' جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہیں ــ ایک تو یہ کہ افراد میں ان تمام صلاحیتوں کو ابھارا جائے جو

ترقی اور حرکت کے لئے ضروری ہیں - دوسرے یہ کہ افراد اور جماعتوں میں اعراض اور مقاصد کا ایسا اتحاد پیدا ہوجائے کہ ان میں باہمی ہمدردی اور باہمی احتیاج کا احساس ہردم تازہ رہے جس معاشرے میں حرکت ہو ہر جدید چیز کی اشاعت کے لئے راہیں کھلی ہوئی ہوں اسمیں یہ انتظام ہونا چاہئے کہ اس کے تمام افراد میں جدت کا مادہ اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت پیدا ہو - ورنہ وہ ان تبدیلیوں کے گرداب میں پڑکر رہ جائینگے جو انکے گرد و پیش ہو رہی ہیں اور جن کی اہمیت سے وہ ناواقف ہیں' [۱] اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے ہر فرد کی صلاحیتوں کو پوری پوری نشو و نما کا موقع دیا جائے - تاکہ ہر طرح کی صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے افراد مل کر معاشرے میں ترقی اور تبدیلی کی گنجائش پیدا کریں - یہ تعلیم افراد میں ایک بےرنگ اور بےروح یکسانی کو رواج نہیں دیگی بلکہ ان تمام قوتوں کو ابھارے گی جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتی ہیں تاکہ ان رنگ برنگ کے سروں کے میل سے ایک ہم‌آہنگ نغمہ پیدا ہو - جمہوری تعلیم انفرادیت پر زور دیگی لیکن انفرادیت کی تربیت ایسے معاشرتی ماحول میں کریگی جہاں ایک دوسرے کے تجربات' خیالات اور مشاغل میں شرکت کرکے اور باہمی داد و ستد کی بدولت اس میں تمدنی قدروں اور تعلقات کا احساس مستحکم ہو جائے گا جمہوریت کا ایک طرف تو یہ تقاضہ ہے کہ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ اظہار خودی کا موقع دیا جائے لیکن دوسری طرف یہ شرط ہے کہ یہ اظہار اپنے لئے وہ وہ راستے اختیار کرے جو معاشرے کے اعلیٰ ترین مفاد کے منافی نہ ہوں بلکہ ان کے حصول میں مدد دیں - ہندوستان کی جدید حکومت کا

---

[۱] Dewey : Democracy and Eduction صفحہ ۱۰۲ -

اولین فرض یہ ہوگا کہ وہ تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی وسائل کا جائزہ لے کر ان کو منظم اور مربوط کرے اور ایک وسیع اور مکمل نظام قائم کرے جسکے دامن میں رفتہ رفتہ ملک کی نوخیز نسل کے تمام افراد آجائیں جن کی تربیت اسی احتیاط اور غور کے ساتھہ کی جائے جو آج کل صرف بعض اہل ثروت لوگوں کے حصہ میں آتی ہے - وہ تمام رکاوٹیں جو مفلسی کی وجہہ سے ان کے راستے میں حائل ہیں دور کی جائیں اور انھیں بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے تعلیمی اثرات میں رکھا جائے کہ قوم کے جس طبقے میں جہاں کہیں بھی کوئی جوہر قابل پیدا ہو اس کو اعلیٰ ترین تربیت اور نشو و نما کا موقع ملے اور باقی تمام لڑکے اور لڑکیاں اپنی ذہنی استعداد اور رحجان کے مطابق تعلیم پائیں اور اپنی قوتوں کو ذاتی اور قومی مقاصد کے حصول میں صرف کریں - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہوگا کہ وہ فلسفہ تعلیم کی اور نظریہ تعلیم کی تشکیل کریں اور نصاب ، طریقہ تعلیم ، اصول ضبط اور مدرسوں کے داخلی اور خارجی نظم و نسق میں مناسب ترمیم کرکے تعلیم گاہوں کو ایسا ماحول بنادیں کہ جو طلبہ وہاں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلیں وہ ہندوستان کے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دے سکیں جو اُس نئے جمہوری معاشرے میں ان پر عائد ہونگے جس کی تشکیل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے ، اگرچہ کبھی کبھی باہمی اختلافات اور مناقشات کی وجہہ سے فضا اِس درجہ تاریک اور مکدر ہو جاتی ہے کہ اُس میں مستقبل کا روشن رخ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے -

---

حصہ دوم

" درسی تعلیم "

باب اول – علم اور زندگی -

باب دوم — مدرسہ عمل -

باب سوم — ذہنی تربیت -

باب چہارم — تدوین نصاب -

باب پنجم — جسمانی تربیت -

باب اول

"علم اور زندگی"

موجودہ نظریہ تعلیم اور اس کے اہم ترین اصولوں کو بخوبی سمجھنے کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم مدرسہ جدید کے اس تصور پر نظر ڈالیں جو اس زمانے میں پیدا ہوا ہے اور جس نے جدید تعلیمی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے - اگر ہمارا مقصد موجودہ تعلیم کے تاریخی ارتقاء کو دکھانا ہوتا تو ہم اس سے بحث کرتے کہ "جدید" خیالات سے مراد یہ نہیں کہ ان کا قدیم خیالات سے کوئی تعلق نہیں یا تعلیم میں دفعتاً کوئی زبردست انقلاب ہو گیا ہے جس کی وجہ سے تمام پرانے آثار مٹ گئے ہیں اور ان کے بجائے ایک بالکل نئی عمارت کھڑی ہو گئی ہے انسانی معاملات کی ہر تبدیلی علت اور معلول کے ایک اٹل ارتقائی سلسلے میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے جس کا سمجھنا اور سمجھانا فلسفے کے طالب علم کا فرض ہے - یہی صورت تعلیمی تبدیلیوں کی ہے - یہ بھی ایک ایسے ہی ارتقا کا نتیجہ ہیں - ان کی جڑیں ماضی کے واقعات اور حوادث میں پوشیدہ ہیں مگر ان کا فوری سبب وہ حالات ہیں جو اس زمانے میں ہمارے پیش نظر ہیں - لیکن اس کتاب میں ہمارا موضوع بحث تعلیم کا تاریخی مطالعہ نہیں بلکہ اصول تعلیم کا تجزیہ اور تشریح ہے اس لئے ہم اس حصے میں مختلف تعلیمی مسائل سے ان بڑے بڑے اصولوں کی ضمن میں بحث کریں گے جس پر موجودہ زمانے کے بہترین تعلیمی خیالات مبنی ہیں - یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی عملی تجویز یا انسانی ادارہ

اپنے نصب العین سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ نصب العین کوئی مقررہ منزل نہیں جہاں ہم واقعی پہنچ جائیں بلکہ ایک رہنما ستارہ ہے جو ہماری دسترس سے بلند ہوتا ہے اور ہماری کوششوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - حصہ اول میں ہم نے تعلیم کی جو غایت بیان کی ہے اس کی حیثیت ایک آئیڈال (نصب العین) کی ہے جس کو تمام و کمال حاصل کرنا امکان سے باہر ہے لیکن مدرسہ جدید کے تعلیمی اصولوں اور رجحانات پر غور کرنے سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہوسکتا ہے کہ ہماری تعلیمی ارتقا کا کیا رخ ہے اور ہماری تعلیم گاہیں کن مقاصد کو پورا کرنے میں کوشاں ہیں - مثال کے طور پر ہمیں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی طریقوں اور کوششوں کا ذکر کرنا ہوگا اور اس طرح ہمیں ان کے تعلیمی تجربات سے بھی آگاہی ہوجائے گی اور ہم یہ اندازہ کرسکیں گے کہ ہمارے اپنے مدارس جدید تعلیمی خیالات کی رو سے کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں -

مدرسہ جدید کی واقعی اہمیت اور حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کے لئے ہمیں بطور پس منظر کے " مدرسہ " یا " سکول " کے قدیم تاریخی تصور پر ایک سر سری نظر ڈالنی چاہئے تاکہ ہم دونوں کا مقابلہ کر کے سمجھ سکیں کہ تصور میں کون سے عناصر مستقل اہمیت رکھنے کی وجہ سے قدیم زمانے سے اب تک برابر چلے آتے ہیں اور کن امور میں تبدیلی اور ترمیم ہوگئی ہے - ہم تعلیم اور تمدن کی ابتدائی بحث میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ انسانی زندگی کے نظام میں مدرسہ کا آغاز کس طرح ہوا - ابتدا میں لوگوں نے زندگی کی ضروریات سے مجبور ہو کر اپنی اولاد کو بعض وہ چیزیں بتائیں اور سکھائیں جن کے جانے بغیر چارہ نہ تھا یعنی جن پران کی زندگی کا دار و مدار تھا - مثلاً خوراک حاصل کرنے

کے طریقے ، گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کرنا یا بنانا - لباس کی مزاحمی ، کاشت کرنے ، شکار کھیلنے اور دوسرے ضروری کاموں کے لئے ہتھیار اور آلات تیار کرنا - اس ابتدائی دور میں ان کی توجہ لازماً مادی اشیا اور ضروریات تک محدود تھی - لیکن کچھ زمانے کے بعد مختلف قبیلوں میں رسوم و عبادات ، قانون معاشرت کے طریقوں ، گیتوں اور بھجنوں کا مجموعہ تیار ہو گیا - اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بھی والدین یا خاندان کے بزرگوں نے خود ہی براہ راست بچوں کو سکھائی ہوں گی - یہ تعلیم کی وہ منزل ہے جس کو مورخین نے " بے ضابطہ تعلیم ' [۱] کے نام سے موسوم کیا ہے اور ابتدا میں تعلیم کی محض یہی ایک صورت تھی - اس وقت پیشوں اور صنعتوں وغیرہ کی تعلیم نوجوان بلا واسطہ عملی طور پر حاصل کرتے تھے یعنی سوسائٹی کے کار و بار میں براہ راست شریک ہوتے تھے - نظری تعلیم جو ابھی تک اتنی مجرد نہ تھی کہ زندگی کے عملی مشاغل سے اس کا تعلق بالکل نظر سے چھپ گیا ہو ، انہیں خاندان ہی میں دی جاتی تھی - لیکن جب رفتہ رفتہ انسان نے اپنے ذوق تجسس کی وجہہ سے گرد و پیش کے مظاہر اور اشیا پر توجہ کی اور ان کی خاصیتوں اور تعلقات پر غور کرنا شروع کیا تو اس کی معلومات کا ذخیرہ بڑھا اور مختلف " علوم " کی صورت میں مدون ہوا - تب سوسائٹی کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کی کہ یہ علوم با قاعدہ طریقہ پر بچوں اور نوجوانوں تک پہنچائے جائیں کیونکہ اب کام کی وسعت اور ذمہ داری اتنی ہو گئی تھی کہ خاندان کے افراد اپنے اور لازمی مشاغل کے دوران میں ضمناً اس تعلیمی فرض کو انجام نہ دے سکتے تھے - اس ضرورت سے مجبور ہو کر " مدرسے " قائم کئے گئے جہاں بعض لوگ ،

- Informal Education [۱]

جو اسی غرض سے دوسرے معاشی فرائض سے سبکدوش کردئے گئے تھے خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے کہ انھیں نہ صرف تمام مفید ہنر اور عملی کام سکھائیں جو زندگی کے قیام کے لئے ضروری ہیں بلکہ ان نظری علوم سے بھی روشناس کریں جو برابر نشو و نما پا رہے تھے اور انسان کی واقفیت اور قوت میں اضافہ کر رہے تھے - اس طرح تمدنی زندگی کے نظام میں مدرسے نے اپنے لئے جگہ پیدا کی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس صورت حال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :—

"جوں جوں تمدن کو ترقی ہوتی ہے بچوں کی صلاحیتوں اور بڑوں کے کار و بار میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے لئے یہ بہت مشکل ہوتا جاتا ہے کہ وہ بجز ان مشاغل کے جو بہت سادہ اور آسان ہیں بالغوں کے کاموں میں براہ راست شریک ہو کر کچھ سیکھ سکیں بالغوں کے کام اکثر اتنے پیچیدہ اور بچوں کی سمجھ سے اِس قدر بعید ہوتے ہیں کہ وہ کھیل میں ان کی نقل اتار کر ان کے منشا اور مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے - اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بچے بڑے ہوکر سوسائٹی کے کار و بار میں مفید طریقے پر شرکت کریں تو یہ ضروری ہے کہ انھیں پہلے سے اس مقصد کے لئے تعلیم دی جائے — اس غرض کو مدنظر رکھ کر باضابطہ تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں تعلیمی وسائل اور نصاب وغیرہ کی ترتیب عمل میں آتی ہے اور ضروری چیزوں کے پڑھانے کا کام ایک خاص جماعت کے سپرد کردیا جاتا ہے........جوں جوں سوسائٹی کے ذرائع اور وسائل زیادہ

وسیع اور اُسکا نظم و نسق زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے
مروجہ باضابطہ تعلیم کی ضرورت بھی بڑھتی
جاتی ہے " [۱]

جب مروجہ مدارس قائم ہو گئے تو اسکے نصاب اور داخلی تنظیم
میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع
ہوئیں اور اُن میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے – ابتدا میں
اُن کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسم و عقائد کے سکھانے
تک محدود ہوگئی – لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط
تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہوگئی کیونکہ
نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی -
ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea"
(مدرسہ کا تصور) میں اُن عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :-

" جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اسکو فرصت ،
علمی غور و فکر ، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع
نصیب ہوئے تو ادب موسیقی ، آرٹ اور رقص بطور نئے
فنون کے مدرسہ کے نصاب میں داخل کئے گئے – اس کے
بعد اُسنے مروجہ ضابطہ عمل (یعنی قانون) ، صحیح
یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب
یعنی (مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل
کرلیا – جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور اونھیں
انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور انکی قدر

[۱] Democracy and Education ص ۹ -

کرنے کي تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی
تکمیل ھوگئي [۲]

اس بیان سے واضح ھو جاتا ھے کہ مدرسہ کا ابتدائی تصور کیا تھا -
اس سے مراد تھی ایک ایسي درسگاہ جہاں طلبہ وہ مفید علوم حاصل
کرتے تھے جو زندگي کي بقا اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کے لئے
ضروری تھے اور جن سے ان کے ذوق تجسس کی بھي تھوڑی بہت تشفي
ھو جاتي تھی — جب مدرسہ کے تصور کی تکمیل ھو گئي تو اسمیں
طلبہ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے کیونکہ
اس سے اُنکے نفس کي تہزیب اور ذھن کی تربیت ھوتی تھی اور زندگی
کی معنویت میں اضافہ ھوتا تھا — مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ
تین قسم کے علوم کی جانب تھي - ایک وہ جو طلبہ کو حصول معاش
اور مادی زندگی کی ضروریات کے لئے تیار کرتے تھے ' دوسرے وہ جو انکی
عقلی اور ذھنی تربیت میں معین ھوتے تھے ' تیسرے وہ جو انکی اخلاقی
تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے تھے — اس تدریجی ارتقاء
کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادي پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا
کیونکہ اس سے براہ راست زندگی کي مادی ضروریات پوری ھوتی تھیں
جب علوم کو ترقی ھوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کي صورت
اختیار کرلی تو نظری اور ذھنی امور پر زیادہ توجہ ھونے لگی یہانتک کہ
موجودہ زمانہ میں " مدرسہ " کا لفظ " جائے درس " کے معني میں
استعمال ھونے لگا اور درس کے معنی کتابی اور زبانی تعلیم قرار پاگئے -
ھمارے ملک میں ابتک اور گذشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل
تقریباً تمام ملکوں میں مدرسہ کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ھے جہاں
طلبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ھیں جنھیں معلم یا والدین

---

[۲] صفحہ ۱۲ -

اپنے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتے ہیں اور جن میں ان کے خیالات کی نشو و نما اور کسی حد تک زمانے کی رفتار کے مطابق ترمیم اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے -

مدرسے کے اس تصور کا انحصار چند ایسے فرضیوں پر ہے جن کی تنقید کرنا ضروری ہے کیونکہ موجودہ نظریۂ تعلیم کو ان سے اختلاف ہے - اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ علمی ترقیوں اور انسانی زندگی کی موجودہ تنظیم کو مدنظر رکھتے ہوئے قدیم غیر مرتب تعلیم ہماری ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی - وہ تعلیم جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں عملی زندگی میں براہ راست دیجاتی تھی اور اس کا دائرہ بہت ہی محدود تھا - اس کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجودہ تمدنی ذخیرے اور علمی اور عملی خزانے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرنا ممکن نہیں - آج کل کے باضابطہ مدارس میں جو تعلیم کتابوں اور تحریری علوم کے ذریعے دیجاتی ہے اس سے طلبہ کا تجربہ بہت وسیع ہوتا ہے - وہ نہ صرف اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے بلکہ قدیم تصانیف کے مطالعے کے ذریعے تمام عہد کے بہترین تمدنی علمی اور ادبی کارناموں سے واقف ہوجاتے ہیں - لیکن جہاں مدرسہ کی اس نئی تنظیم سے تعلیم میں وسعت اور باقاعدگی پیدا ہوئی ہے وہاں بعض خطرے بھی پیش آئے ہیں - انسان نے اپنی واقفیت اور علم کو محض اپنے حافظے میں یا عمل کی صورت میں محفوظ نہیں رکھا بلکہ اس کو ضبط تحریر میں لے آیا ہے - اس لئے وہ تمام حقائق اور اصول جو بڑے بڑے طویل تجربوں کا نچوڑ ہیں محض چند اصطلاحات یا علامات کے ذریعے بیان کئے جاسکتے ہیں - جو شخص ان تجربوں کو بذات خود حاصل کر چکا ہے اور ان حقائق کا محرم ہے جنھیں یہ علامات ظاہر کرتی ہیں وہ ان سے بخوبی

فائدہ اٹھا سکتا ھے ـ اس کی نظر میں ان کی وھی حیثیت ھے جو ایک ماھر فن کے نزدیک مختصر نویسی کی یاد داشتوں کی ھوتی ھے - وہ ان اشارات پر نظر ڈالتا ھے اور اسکے ذھن میں وہ تمام تجربات اور واقعات تازہ ھوجاتے ھیں جن کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر چند نشانات بنا لئے تھے ـ لیکن ھم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ شخص جو ان تجربوں سے بالکل محروم رھا ھو اور جسے ان واقعات کے مشاھدے کا موقع نہیں ملا ان الفاظ اور علامتوں سے اتنا ھی فائدہ اٹھا سکتا ھے - ممکن ھے کہ وہ اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر قیاس سے کام لیکر لفظوں اور علامتوں کو ایک حد تک معنی پہنا سکے لیکن جب تک وہ خود ان نتائج تک پہنچنے کی کوشش نہیں کریگا جو ان الفاظ و علامات میں ظاھر کئے گئے ھیں اس کے علم میں اصلیت کا رنگ پیدا نہیں ھوگا ـ اگر یہ بات صحیح نہ ھوتی تو قطب شمالی کے ایک تجربہ‌کار سیاح کو وھاں کے حالات کا جتنا حقیقی علم ھے اتنا ھی ایک نوعمر لڑکے کو ھوتا جو پڑھنا سیکھہ کر اس سیاحت کا سفر نامہ غور سے شروع سے آخر تک پڑھلے ـ لیکن واقعہ یہ ھے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ سیاح کی نظر کے سامنے گوناگوں تجربات کی ایک دنیا لاکر کھڑا کردیتا ھے اور اس کا ذھن فوراً الفاظ سے حقائق کی طرف منتقل ھو جاتا ھے - بر خلاف اس کے لڑکا کتاب کو اسی حد تک سمجھتا ھے جس حد تک اس کا محدود تجربہ ان الفاظ میں جان ڈال سکے اور اس کے نفس میں وہ ذھنی اور جذباتی کیفیتیں پیدا کر سکے جو الفاظ کے پردے میں پوشیدہ ھیں - اگر بالفرض اس کو ان حالات کا ذرا سا بھی واقعی علم یا تجربہ نہیں ھے - تو سفر نامے کے الفاظ اس کے لئے محض اتنی ھی اھمیت رکھتے ھیں کہ وہ اس کے بعض حواس کو عارضی طور

پر متاثر کرتے ہیں اور بس - زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اس کا سابق علم وسیع اور تخیل پر زور ہے تو قیاس کے ذریعے سے چند کم و بیش مبہم تصویریں اس کے دماغ کے سامنے آجائیں - اسی طرح کیمیا کی کتاب میں یہ پڑھ لینا کہ کاربونک ایسڈ گیس کاربن اور آکسیجن کے ایک خاص تناسب سے ملنے سے بنتی ہے بغیر عملی تجربے اور مشاہدے کے ایسا ہی ہے جیسا کوئی جادو کے منتر کو دھرائے - ان مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ ذاتی تجربے کی سنت پذاھی کے بغیر لفظی تعلیم بالکل ناکافی ہے - معلومات جب تک برتی نہ جائے اور عمل کی کسوتی پر پوری نہ اترے اسے علم کا درجہ نصیب نہیں ہوتا -

یہ بات بظاہر اتنی صاف اور سیدھی معلوم ہوتی ہے کہ شاید کوئی شخص اس سے انکار نہ کرے گا - لیکن عملاً مدرسے صدیوں سے اس حقیقت کو نظر انداز کرتے رہے ہیں - انھوں نے ذاتی اور بلا واسطہ تجربے کے بجائے الفاظ کی تعلیم کو اپنا منتہائے نظر بنا لیا ہے بلکہ بالواسطہ تجربے کو بھی اپنے نصاب سے بڑی حد تک خارج کردیا ہے - ابتدائی بے ضابطہ تعلیم کا میدان تنگ ضرور تھا لیکن اس میں فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے بچے سوسائٹی کے مشاغل میں براہ راست شریک ہوکر، یا کھیل میں اس کی نقل اتار کر، جو معلومات بہم پہنچاتے تھے وہ مستقل طور پر ان کی ملکیت اور ان کی شخصیت کا جزو بن جاتی تھی وہ اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کیونکہ وہ ذاتی کاوش اور عملی تجربے سے حاصل کی ہوئی چیز ہوتی تھی - جب کتابی تعلیم کا دور شروع ہوا تو علم کا تعلق روز مرہ کے کاروبار اور تجربات سے کم ہونے لگا، مدرسے میں الفاظ اور اصطلاحات پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور اس کا یہ اصل مقصود پس پشت ڈالدیا گیا کہ وہ طلبہ

کے لئے مفید ترین اور اہم ترین تجربات کے مناسب مواقع بہم پہنچائے - زمانہ حال کے بہت سے تعلیمی مفکرین نے اس خرابی کو محسوس کیا ہے اور تعلیم جدید کی کوشش یہ ہے کہ مدرسے اور زندگی کا توٹا ہوا رشتہ نئے سرے سے جوڑا جائے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے فلسفہ تعلیم کا مقصد تمام تر یہی ہے وہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوے لکھتے ہیں —

" ترقی یافتہ تمدن میں جو باتیں بچوں کو سیکھنی ہوتی ہیں وہ زیادہ تر اصطلاحی علامتوں کی شکل میں مرتب اور محفوظ ہوتی ہیں انھیں معمولی جانی بوجھی چیزوں اور کاموں کی صورت میں تحویل نہیں کرتے اس قسم کا تعلیمی مواد زیادہ تر سطحی اور اصطلاحی ہوتا ہے اور حقیقی واقعات اور زندگی کے مقابلے میں اصلیت سے خالی نظر آتا ہے اصلیت کا معیار یہ ہےکہ کسی چیز کو عملی معاملات سے کس حد تک تعلق ہے - اس تعلیمی مواد کی ایک علیحدہ دنیا ہوتی ہے جہاں خیال اور اظہار خیال کے عام طریقے کام نہیں دیتے - اندیشہ یہ ہے کہ مدرسوں کے نصاب پر رسمی تعلیم کا مواد حاوی ہو جائیگا ؛ اس کا ربط زندگی کے تجربات سے قائم نہ ہوگا ؛ مستقل معاشرتی مقاصد نظر انداز کردئے جائیں گے اور ان چیزوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہو گی جن کی تمدنی زندگی کے نظام میں کوئی جگہ نہیں بلکہ ان کا تعلق محض اصطلاحی علوم سے ہے - اس طرح ہمیں تعلیم کا عام مروجہ تصور حاصل ہوتا ہے جس میں اس کی معاشرتی غرض اور نتائج فراموش کر دئیے جاتے ہیں اور اس کا لحاظ نہیں رہتا کہ تعلیم کا موضوع انسانوں کے وہ تمام باہمی تعلقات اور مراسم ہیں جو

ہماری شعوری زندگی پر اثر ڈالتے ہیں بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم دور از کار معاملات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے اور لفظی علامتوں کے ذریعہ علم سکھانے کا نام ہے گویا وہ محض نوشت خواند تک محدود ہے - لہذا فلسفہ تعلیم کا ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ارادی اور غیر ارادی' رسمی اور اصلی تعلیم میں کسی طرح مناسب توازن قائم رکھا جائے - محض معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچانے اور اصطلاحی اور ذهنی مشق حاصل کر لینے سے انسان کے نفس میں معاشری احساس پیدا نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روز مرہ کے تجربات معنویت سے خالی ہوتے ہیں اور مدرسے میں طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اس سے ان میں محض ایک خاص قسم کی تیزی اور ہوشیاری اور ماہرین خصوصی کی سی خود پسندی پیدا ہوجاتی ہے - جوں جوں مدرسہ محض ایک اصطلاحی درس گاہ بنتا جاتا ہے یہ مسئلہ زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم کے ان دونوں پہلؤں میں کس طرح تعلق قائم رکھا جائے یعنی اس چیز میں جو لوگوں نے بالارادہ کوشش کرکے سیکھی ہے اور اس میں جو انہوں نے غیر محسوس طریقہ پر دوسروں کے ساتھہ میل جول کے ذریعہ اپنی طبیعت اور سیرت کی تشکیل کے دوران میں حاصل کی ہے' [۱]

ان الفاظ سے واضح ہوجاتا ہے کہ مدرسہ جدید اور مروجہ مدارس کا پہلا نمایاں فرق کیا ہے - مدرسہ محض ایک جائے درس نہیں جہاں ہم سوسائٹی کی زندگی اور مشاغل سے قطع نظر کرکے طلبہ کے دماغوں میں اصطلاحی معلومات کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں جس کا ان کی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا - مدرسہ در اصل وہ ماحول ہے جہاں بچوں کی زندگی کے گوناگوں اور پیچیدہ تجربات ایک منتخب اور منظم شکل

---

[۱] Democracy and Education صفحہ ۱۰

میں حاصل ہوسکتے ہیں - اگر وہ ان تجربات کو براہ راست حاصل کرتے تو اس میں بہت وقت ضائع ہوتا اور یہ باقاعدگی اور نظم پیدا نہ ہو سکتا - مدرسہ جدید کا ایک اساسی اصول تجربے کی اہمیت کا احساس ہے اور موجودہ تعلیمی طریقوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم کی بنیاد ذاتی اور بلا واسطہ تجربے پر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی مکتبی زندگی اصلی اور عملی زندگی بن جاوے -

اس نقطہ نظر سے مدرسہ ایک ایسا ماحول ہے جس کا مقصد اول یہ ہے کہ طلبہ اس میں عمدہ اور خوشگوار زندگی بسر کریں اور ثانوی مقصد یہ ہے کہ اس زندگی کے دوران میں بعض مفید علوم اور ہنر حاصل کریں - مدرسہ میں بچہ محض پڑھنے لکھنے کے لئے نہیں آتا بلکہ اپنا وقت ایسے خوشگوار ، مفید اور محنت طلب مشاغل میں صرف کرنے کی غرض سے جو اس کے شوقوں کو ابھاریں اور ان کی ابتدائی غیر منظم شکل کو بدل کر ان میں تربیت اور تنظیم پیدا کریں - یہ خیال ایک تعلیمی انقلاب کا پیش خیمہ ہے - اس کو تسلیم کرنے سے مدرسے کے مروجہ طریقہ تعلیم نصاب اور ضبط و نظم میں بہت کافی ترمیم لازم آتی ہے - عام طور پر مدرسوں اور تعلیمی افسروں نے مدرسوں کی تنظیم ایک محدود علمی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے تاکہ طلبہ لکھنا پڑھنا اور چند ضروری مضامین سیکھ لیں - لیکن اگر ہم مدرسے کو زندگی کے تجربات کا مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں بچے آزادی کے ساتھ مختلف قسم کے کام کریں آپس میں ملیں جلیں ، ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے واقفیت حاصل کریں اپنے لئے وہ مشاغل انتخاب کریں جو ان کی طبیعت کے رجحان کے موافق ہوں اور انہیں تنہا یا دوسروں کی مدد سے تکمیل کو پہنچائیں - اس میں ایسے محرکات موجود

ہونے چاہئیں جو خود بخود رفتہ رفتہ طلبہ کو مختلف قسم کے علمی اور عملی مقاصد کی طرف کھینچیں اور وہ وسائل اور ذرائع بھی جو ان مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوں - اگر ہم یورپ یا امریکہ کے کسی "مدرسہ جدید" کا معائنہ کریں (اس قسم کے بہت سے مدارس اس زمانے میں انگلستان ' جرمنی ' سوئٹزر لینڈ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں) تو ہمیں اس کی ظاہری حیثیت ' ساز و سامان اور عمارتوں ہی سے یہ اندازہ ہوجائیگا کہ قدیم نظام تعلیم بالکل بدل گیا ہے - جہاں پہلے سوائے چند دریوں ' یا بنچوں ' میزوں کرسیوں کتابوں اور نقشوں کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی وہاں اب حسب استطاعت سائنس اور دست کاریوں کے لئے بڑے بڑے معمل ' مشینیں ' جانوروں اور پودوں کے نمونے ' باغات ' تیراکی کے لئے حوض ' ورزش کے لئے جمناریم ' عمدہ عمدہ تصویریں ' طلبہ کے آرام کرنے کے لئے کمرے ' جلسہ گاہیں ' بڑے بڑے کتب خانے جہاں علاوہ درسی کتابوں کے مستند تصانیف ' حوالے کی کتابیں ' فرصت میں پڑھنے کے دلچسپ قصے وغیرہ ' غرض وہ تمام چیزیں ملیں گی جو مدرسوں سے باہر متمدن ممالک کے باشندوں کو نصیب ہیں یا ہونی چاہئیں - اس تکلیف اور اہتمام کا مقصد نمود نہیں بلکہ یہ ہے کہ طلبہ مدرسے کی زندگی کے دوران میں اپنا وقت اس طرح صرف کریں کہ ان کی زندگی تجربات سے مالا مال ہو ' جوان کے لئے خوشی کا سرمایہ ہوں' ان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو نشو و نما دیں اور ان کو آگے چل کر تمدنی زندگی میں شرکت کرنے کے قابل بنائیں - ہم ایک گذشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ بچوں سے کسی مستقبل بعید کی خاطر کام کرنے کی توقع رکھنا سراسر نادانی ہے - نفسیات کی تعلیم اور روزمرہ کا تجربہ دونوں اس کی تردید کرتے ہیں - بالغ ' تجربہ کار لوگ بھی جو اپنے برے بھلے کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے گذشتہ تجربے اور تخیل کی وجہ سے مستقبل کا زیادہ

واضح تصور کرسکتے ھیں، بالعموم بعید مقاصد اور اغراض کی خاطر کام
کرنے کو تیار نہیں ھوتے پھر بچوں سے یہ کیسے توقع ھوسکتی ھے کہ وہ اپنے فوری
اور موجودہ شوق اور دل چسپیوں سے منھہ موڑ کر دور و دراز مقاصد اور امیدوں
کی خاطر ' ایسے کاموں میں اپنا دل لگائیں جو ان کو بذات خود اچھے
نہیں معلوم ھوتے " اچھے " سے ھماری مراد یہ نہیں ' کہ وہ بالغوں کے
نقطۂ نظر سے اخلاقی خوبی رکھتے ھوں - بچوں کے لئے ھر وہ کام " اچھا " ھے
جس میں انھیں اپنی بڑھتی ھوئی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے اور اس
سے انھیں خوشی اور احساس قوت حاصل ھو - تعلیم کا یہ کام ضرور ھے
جیسا کہ ھم پہلے کہہ چکے ھیں ' کہ وہ بچوں کو زندگی کے لئے تیار
کرے لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ھمیشہ کسی آنے والے زمانے کی
یاد سے بچوں کو بہلاتی رھے - اس کی بہترین تدبیر یہ ھے کہ بچپن
اور نوجوانی کے زمانے میں ان کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں
کہ وہ اپنی فطرت اور جبلی خواھشات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں
اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مفید عادتیں اور علم و ھنر
سیکھیں - معلم کو چاھئے کہ ھمیشہ بچوں کی زندگی اور موجودہ رجحانات
کو نقطۂ آغاز بنائے کیونکہ فطرتاً ان کی دلچسپی کا مرکز زمانۂ حال
ھوتا ھے - ان کی نظر میں مستقبل کی کوئی فوری اور شدید اھمیت
نہیں ھوتی - اگر ان کے مطالعے اور مشاغل کے لئے ایسی چیزوں کو عمل
کا محرک بنایا جائے جو ان کی نفسی کیفیت اور خصوصیات کے ساتھہ
وابستہ ھیں اور ان کی موجودہ زندگی کو دلچسپ اور معنی خیز بناتی
ھیں تو وہ مدرسے میں اپنی پوری جسمانی اور ذھنی قوت کام میں لائیں گے
ورنہ وہ پڑھنے لکھنے کا کام بیدلی سے بغیر مقصد کو سمجھے ھوئے کریں گے
اور اُن کی ذھنی حالت میں انتشار رھے گا - معلم کو مجبور ھو کر ان

تحریصوں اور ترغیبوں سے کام لینا پڑیگا جو مضرت سے خالی نہیں - کبھی وہ انہیں سزا کی دھمکی دے گا ' کبھی امتحان میں ناکامی کی بھیانک تصویر دکھائے گا ' کبھی والدین اور دوستوں کی ناراضگی اور شرمندگی اور آگے چل کر خود اُن کی پشیمانی اور افسوس کا خیال دلائے گا ' یہ نہیں تو طرح طرح کے لالچ سے انہیں پھسلائے گا - نمبروں کا اور درجہ کا خبط جو ہمارے نظام تعلیم پر اس درجہ حاوی ہے ' انعاموں کی تقسیم اور اس کی حد سے زیادہ اہمیت طلبہ کی باہمی مسابقت اور اس قسم کی تمام چیزیں جو ہمارے مدرسوں کے نظام کا جزو ہو گئی ہیں سب ضرورت اسی وجہ سے پڑتی ہے کہ طلبہ کو اپنے مقررہ کام سے کوئی واقعی نفسی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد ان کے شوق اور جبلت ' ان کی خواہش عمل اور ان کے ذوق تجسس پر نہیں رکھی گئی - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کام کو کام کی خاطر کرنے کی خواہش اور اس سے خوشی حاصل کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہوتا - ان کی خواہش عمل مردہ ہو جاتی ہے اور وہ تمام عمر اس کا خمیازہ بھگتے ہیں - غرض کام کو کسی خارجی مقصد کی خاطر جبراً طلبہ پر عائد کرنا تعلیمی اور نفسی اعتبار سے سراسر قابل اعتراض ہے - اگر طلبہ کا ماحول سازگار ہو ' جو کام ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ ان کے رجحانات سے مناسبت رکھتا ہو اور مقصد کار ان کی سمجھ اور استعداد سے باہر نہ ہو تو ان کی طبیعت میں مطالعہ کا شوق اور علم و ہنر حاصل کرنے کی خواہش خود بخود پیدا ہوگی - مدرسے کے اندر باہر کے حالات ایسے ہوں کہ ان میں بچے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھا سکیں تو مستقبل کے لئے اہتمام اور فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں - معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ اُن کے موجودہ مشاغل اور تجربات کو جس قدر پرمعنی اور سبق آموز بنا سکے بنائے ' یعنی ان کا سلسلہ تمدنی حالات مواقع اور محرکات عمل سے ملا دے - اور ان کے تدریت

اور تنظیم اس طرح کرے کہ وہ نہ صرف بچوں کی موجودہ خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکیں بلکہ آگے چل کر اپنی مکمل شکل میں افراد اور سوسائٹی دونوں کے لئے مفید ثابت ہوں -

مدرسہ کا یہ جدید تصور علم حاصل کرنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتا ہے - علم اور زندگی میں جو فصل پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ سے مدرسوں میں تحصیل علم مقصود بالذات بنا لی گئی ہے اور اس کے لئے بعض اصطلاحی طریقے تجویز کئے گئے ہیں - وہاں بچوں کا کام ہے پڑھنا ' لکھنا تاریخ ' جغرافیہ ' ریاضی وغیرہ درسی مضامین کا مطالعہ کرنا - انہیں اس سے کچھہ غرض نہیں کہ اس تمام محنت اور کاوش کا جو ان مضامین کے یاد کرنے میں اُٹھانی پڑتی ہے ان کی موجودہ یا آئندہ زندگی سے کیا تعلق ہے - حروف تہجی کا پہچاننا بھی ان پر اسی طرح فرض ہے جیسے مثلاً پانی پت کی لڑائیوں کی تاریخ یاد رکھنا یا امریکہ کے دریاؤں کے نام جاننا - ہمیں ان مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں بلکہ کوئی سمجھہ دار انسان بھی اس سے منکر نہیں ہوگا - لیکن خرابی یہ ہے کہ یہ سب مضامین ان کی نموپذیر زندگی اور تجسس پسند طبیعت میں خود بخود جذب ہونے کے بجائے ان پر استادوں کی یا محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک مقررہ نصاب کی شکل میں عائد کر دئیے جاتے ہیں - طلبہ کے لئے ان کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے - اس صورت میں ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان علوم کو حاصل کرنے سے ان کی عملی یا ذہنی زندگی پر کوئی اثر پڑیگا یا وہ ان کی تحصیل میں اپنی خوشی اور شوق سے محنت کریں گے - موجودہ اصول تعلیم اس بارے میں یہ ہے کہ علم صرف اس صورت میں مفید اور پائدار ہو سکتا ہے جب اس کی ضرورت قدرتی طور پر زندگی کے مشاغل اور

کار و بار کے دوران میں پیدا ہو اور طالب علم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسے حاصل کرے - ہماری روز مرہ کی تمدنی زندگی میں یہی اصول کار فرما ہے اور لوگ جو کچھ سیکھتے ہیں وہ انہیں حالات اور شرائط کے ماتحت سیکھتے ہیں - ہم کسی راہ چلتے شخص کو خواہ مخواہ جبر و مقابلہ یا سائنس کے مطالعے پر آمادہ نہیں کر سکتے - برخلاف اس کے اگر اس کے مشاغل زندگی ایسے ہیں کہ اسے اپنے فرائض کی ادائگی کے لئے جبر و مقابلہ یا سائنس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ خوشی کے ساتھ انہیں حاصل کرے گا - اور چاہے جتنی محنت کرنا پڑے اس سے جی نہیں چرائے گا - لیکن بغیر ان علوم کی ضرورت محسوس کئے ' بغیر اپنی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق پہچانے وہ ہرگز ان کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنائے گا - وہ لوگ بھی جو دراصل ' علم کو علم کی خاطر ' حاصل کرتے ہیں اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس منزل تک پہنچتے ہیں جہاں وہ علم کو مقصود بالذات بنا سکیں اور ان کے لئے کسی علم کے میدان میں جدید تحقیقات کرنا واقعاً ایسا ہی " مفید " اور تشفی بخش ہوتا ہے جس طرح مثلاً کسی موچی کے لئے چمڑا رنگنے کا ایک نیا اور بہتر طریقہ معلوم کرنا - ان کے لئے " افادے " کا مفہوم عام لوگوں سے مختلف ہوجاتا ہے - جب سوائے بڑے بڑے عالموں کے کسی شخص کے لئے بھی یہ بات آسان نہیں کہ تحصیل علم کو اپنا مقصود زندگی بنا سکے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچے جن کی توجہ بہت منتشر اور نظر بہت محدود ہوتی ہے سالہا سال محض تحصیل علم کو اپنا منتہائے نظر بنا کر مدرسے کے سب کام انجام دیں - مدرسے کے پہلے چند سال میں جب خاص طور پر اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بچوں کے درسی مشاغل

حصول معاش کی آرزو ان کی محرک عمل بن سکے ؛ ان کے سامنے
بالعموم کوئي ایسا مقصد پیش نہیں کیا جاتا جس کو وہ سمجھہ سکیں
عام طور پر لوگ نئی چیزیں اور نئے ہنر اس طرح سیکھتے ہیں کہ وہ
کسي کام میں مشغول ہوتے ہیں جو بنفسہ ان کو مرغوب ہے اور اس کے
ضمن میں یا اس کے نتیجہ کے طور پر کوئی نئی بات معلوم ہوجاتی ہے -
اس اصول کو واضح کرنے کے لئے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) ایک چھوٹے
بچے کی مثال دیتے ہیں کہ وہ چلنا یا بولنا کس طرح سیکھتا ہے -
بچہ شعوری طور پر یہ ارادہ کرکے بات چیت نہیں کرتا کہ میں گفتگو کا
فن سیکھہ لوں یا یہ قصد کرکے نہیں چلتا کہ مجھے چلنا پھرنا آجائے
بلکہ اسے خود بخود دوسرے لوگوں کے ساتھہ میل جول کرنے ان سے تعلقات
قائم کرنے کي خواہش ہوتی ہے - وہ اس فطری خواہش کو پورا کرنے کی
کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں پہلے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعے
اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے - اس کے بعد آہستہ آہستہ پیہم
کوشش اور مشق کے دوران میں اسے بے تکلف بات چیت کرنی آجاتی ہے -
اس طرح اسے خواہش ہوتی ہے کہ بڑھ کر کھلونے کو یا کسي اور چیز کو
ہاتھہ میں لے ، یا اپنے کسی عزیز کے پاس جائے ، یا ایسي ضرورت آپڑتی
ہے کہ اپني جگہ سے ہٹ کر کسي بہتر اور زیادہ محفوظ جگہ پہنچ جائے -
اس خواہش یا نفسي ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ حرکت شروع کرتا
ہے - پہلے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہے اس کے بعد جب مشق بڑھ
جاتي ہے تو کسی قدر تیزی اور رواني پیدا ہو جاتی ہے - یہاں تک کہ
چلنا پھرنا اس کا روز مرہ کا معمول ہو جاتا ہے ؛ جس سے وہ اپنی ضرورت
کے مطابق کام لیتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض اوقات ایسا ہوتا
ہے کہ اس کے لئے سیر و سیاحت کرنا خود ایک دلچسپ اور پر لطف
مشغلہ بن جاتا ہے - ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ ہم بچوں کی

نفسی کیفیات اور اعمال کا مطالعہ کریں یا بچوں کی حرکات کو دیکھیں دونوں صورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ کسی عمل یا مشغلے کے دوران میں بطور اس کے ضمنی نتیجے کے سیکھتا ہے وہ کسی خاص ہنر کی تحصیل کو مدعا مقصد نہیں بناتا - برخلاف اس کے ہمارے مدرسوں میں عام طور پر اس قدرتی اور معقول طریقے کے بجائے دور ازکار اور خلاف فطرت طریقے استعمال کئے جاتے ہیں - بچہ کی توجہ ہمیشہ براہ راست اُن چیزوں کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے جو انہیں سیکھنی ہیں خواہ وہ بالکل نہ سمجھیں کہ ان کی زندگی اور مشاغل سے ان کا کیا تعلق ہے - نصاب کے مضامین اور معلومات کے ذریعے ان کے ذوق عمل کی تسکین نہیں کی جاتی کہ ان میں مفید عادتیں پیدا ہوں ان کی قوت اور بصیرت میں اضافہ ہو اور وہ اپنی دماغی ترقی اور نشو و نما کے احساس سے خوشی حاصل کریں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معلومات بالکل سطحی اور سرسری رہ جاتی ہیں اور ان کے افعال و اخلاق پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا -

مدرسہ جدید کی جو خصوصیت ہم نے اوپر بیان کی ہے اس کی تشریح چند مثالوں سے ہو جائیگی - بچوں کو فطرتاً کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے اور ہر گھر میں ماں یا بہن چھوٹے بچوں کو کہانیاں سناتی ہیں - جب بچہ کسی ایسے مدرسہ میں داخل ہوتا ہے جو معقول تعلیمی اصولوں پر چلایا جا رہا ہے تو معلم اس شوق کو تعلیم کا محور بنا کر اسے طرح طرح کی دل چسپ کہانیاں سناتا ہے جو اس کی معلومات اور وجدانات میں غیر محسوس طور پر وسعت پیدا کرتی ہیں - پھر ممکن ہے وہ بجائے زبانی کہانیاں سنانے کے کسی کتاب میں سے کہانیاں پڑھ کر سنائے - اگر کہانیوں کا انتخاب صحیح اور موزوں ہے تو بچے کو یقیناً اس سے

دل جسمی پیدا ہوگی ، اور وہ خود انہیں کہانیوں کو یا اپنی سنائی ہوئی کہانیوں کو اپنے ساتھیوں کو سنائے گا اور اس کی بدولت اس کی قوت بیان کی تربیت ہوگی - رفتہ رفتہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوگی کہ وہ خود ان کہانیوں کو کتابوں میں پڑھ سکے تاکہ نئی نئی کہانیاں سننے کے لئے وہ استاد کا محتاج نہ رہے اور اس کا کہانیوں کا ذخیرہ بہت وسیع ہوجائے - لیکن وہ اس خواہش کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک پڑھنا نہ سیکھے - اگر اس کی طلب صادق ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بخود پڑھنے کی طرف مائل ہوگا - اس کو زبردستی حروف تہجی اور ان کی ترکیبوں کی دشوار گزار منزلوں میں سے گھسیٹنا نہیں پڑیگا بلکہ وہ اپنی خوشی سے اور محنت کرکے مشکلات پر قابو پائے گا - کیونکہ ان کو سیکھ لینے سے اسے اپنے ایک ذاتی مقصد کے حصول میں مدد ملے گی - وہ قاعدے کو اور اسمل بے جوڑ جملوں کی کتابوں کو اس خیال سے نہیں پڑھے گا کہ اسے پڑھنے کا فن سیکھنا ہے بلکہ اس مقصد سے کہ اس قابلیت کو حاصل کرتے ہی وہ فوراً ان قصوں کو پڑھ سکیگا جن کی خاطر اس نے یہ تمام محنت اُٹھائی ہے - اس کو معلوم ہوگا کہ میرے مطالعے کا کیا مقصد اور کیا فائدہ ہے اور وہ قدرتاً یہ محسوس کرے گا کہ میں مدرسے میں جو کچھ سیکھ رہا ہوں وہ کسی نامعلوم مصلحت یا مستقبل بعید کی خاطر نہیں ، بلکہ خود اپنی موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہے - یہی حال نصاب کے اور تمام مضامین کا ہے ان کے مطالعے کو چھوٹے بچوں کے لئے ایک مستقل مقصد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بد شوق اور بے توجہ ہو جاتے ہیں اور انہیں نصاب بالکل غیر دل چسپ معلوم ہوتا ہے - مدرسۂ جدید کی کوشش یہ ہے کہ وہ بچوں کو ابتدا سے ایسے مشاغل میں لگائے جن کو انجام دینے میں خود بخود اور قدرتی طور پر ان مضامین کو پڑھنے اور سیکھنے کی ضرورت محسوس ہو یعنی وہ اس کے

ذاتي تجربات کو وسیع تر اور با معنی بنانے میں مفید ہیں - یہی وجہ ہے کہ منصوبی طریقے (Project Method) میں مدرسے کے کام کی بنیاد ہمارے مروجہ مدارس کی طرح "سبقوں" پر نہیں رکھی گئی - ان سبقوں کے بجائے طلبہ مختلف قسم کے باقاعدہ مرتب کئے ہوئے اور خود ان کے پسند کئے ہوئے کاموں (Occupations) پر لگائے جاتے ہیں - ان مشاغل کے دوران میں انہیں اپنے علم اور واقفیت کو بڑھانے اور ہاتھ سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور منصوبے بنانے اور ان کو پورا کرنے کے وسائل سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے - مثلاً مدرسے میں دوکان چلانا ' پوسٹ آفس قائم کرنا ' مکان بنانا ' باغ بانی کرنا - بچوں کو ایسے کاموں سے فطرتاً دل چسپی ہوتي ہے کیونکہ یہ ان کی بعض اہم جبلتوں سے تعلق رکھتے ہیں - اور بالخصوص دو نمایاں نفسي رجحانات ' یعنی جبلت تعمیر اور جبلت تعاون کو اظہار کا موقع دیتے ہیں - ان کاموں میں ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے حواس ' اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو ایک مسلسل کام کی تکمیل میں لگاتے ہیں مثلاً کسی تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا خارجي اشیا اور ذرائع کو مرتب کرکے کوئي مفید اور نئي چیز تیار کرتے ہیں جس سے ان میں مسرت اور کامیابي کا احساس پیدا ہوتا ہے جو شخصیت کي تربیت میں بے حد مدد دیتا ہے - اس میں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں میں ان کو اپنے دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ مل جل کر چیزیں بنانے ' معاملات پر غور کرنے اور منصوبوں کو عمل میں لانے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں جس سے ان کی معاشري تربیت عمل میں آتی ہے - ان تمام مشاغل کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے انہیں مختلف قسم کی معلومات درکار ہوتي ہے جسے حاصل کرنے کے لئے وہ بڑے شوق سے اپنے استادوں اور دوستوں یا کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس طرح ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت کے وقت اخباروں ' کتابوں

اور دوسرے لوگوں سے مشورہ لیتے ھیں - اس صورت میں طالبہ کا ریاضی سیکھنا ، یا کسی ملک کا جغرافیہ پڑھنا یا دوکان کا کاروبار چلانے کے لئے تجارتی معلومات حاصل کرنا بالکل ایسا ھی ھے جیسے کوئی روپے کا لین دین کرنے والا یا تھوک فروش اپنی کاروباری ضرورت سے اخبار میں بازار کے نرخ کا مطالعہ کرتا ھے - اس پر کوئی شخص جبر نہیں کرتا کہ وہ ان خشک اعداد میں سر کھپائے لیکن چونکہ اسے اپنی دوکان کی کامیابی کی فکر ھے اس لئے اس کے نقطۂ نظر سے وہ اعداد و شمار غیر دلچسپ نہیں ھوتے بلکہ نہایت معنی خیز ھوتے ھیں اور وہ گھنٹوں ان کے مطالعے میں دماغ سوزی کر سکتا ھے - یہ مثال ان تمام علوم اور معلومات پر صادق آتی ھے جو لوگ عام طور پر اپنی خوشی سے حاصل کرتے ھیں - یہ چیزیں واقعی اور حقیقی طور پر ان کی ملکیت ھو جاتی ھیں اور چونکہ اکثر اور براہ راست استعمال میں آتی رھتی ھیں اس لئے ان کا اثر ان کی زندگی اور سیرت پر بھی پڑتا ھے - یہی حال نو عمر بچوں اور نوجوانوں کا ھے جو بالطبع ”مصرف پسند“ (pragmatist) اور ”افادیت پسند“ ھوتے ھیں - وہ ھر چیز کے متعلق یہ سوال کرتے ھیں : اس سے میری ذات کو یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچتا ھے ؟ اس کا مصرف کیا ھے ؟ چھوٹے بچے تو ھمیشہ صاف صاف اس قسم کی باتیں پوچھتے ھی رھتے ھیں - یہاں تک کہ شروع میں ان کے ذھن میں ھر چیز کا تصور اس شکل میں قائم ھوتا ھے کہ اس سے کیا کام نکل سکتا ھے - کرسی ان کے لئے کسی خاص مستقل شے کا نام نہیں وہ ”بیٹھنے کے لئے“ ایک چیز ھے - کلک یا قلم سرکنڈے کا ٹکڑا نہیں جو ایک طرف سے ترشا ھوا ھو بلکہ ”لکھنے کے لئے“ ایک آلہ ھے - جب وہ سن شعور کو پہنچتے ھیں تو چاھے صاف طور پر اس قسم کے سوال نہ کریں کہ فلاں چیز یا فلاں مضمون ھمارے کس کام کا ھے لیکن ھر چیز کی طرف ان کا ذھنی

رویہ بھی رہتا ہے - اس لئے عام مشاہدے اور نفسیات دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ ابتدا میں طلبہ کے سامنے تمام مضامین اس طرح پیش کئے جائیں کہ وہ ان کا "فائدہ" محسوس کریں اور جو کچھ معلومات حاصل کریں وہ ان کی اپنی زندگی سے بعید اور بے ربط نہ ہوں بلکہ ان کی دل چسپیوں اور مشاغل کے تار و پود میں گتھہ جائیں - علم اور زندگی کا صحیح باہمی تعلق صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے -

ہم نے جو نقطہ نظر اوپر پیش کیا ہے اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ تعلیم کے سب مدارج میں تمام علوم کو اس طرح پڑھانا ممکن یا مناسب ہے کہ وہ کسی عملی مشغلے کا نتیجہ ہوں اور فوراً کسی دوسرے شغل میں یا اسی شغل کی تکمیل میں استعمال کئے جا سکیں - جب طالب علم کی ذہنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے ' اس کا تجربہ بڑھہ جاتا ہے اور ایک حد تک اس کے شوقوں کی نشو و نما ہو چکتی ہے تو اسے بعض علوم سے بنفسہ دل چسپی ہو جاتی ہے - مثلاً وہ ریاضی کو اس لئے نہیں سیکھتا کہ گھر کا حساب و کتاب لکھہ سکے ' یا مدرسے کی دکان چلا سکے ' یا آگے چل کر کسی محکمہ میں ملازم ہو جائے بلکہ اسے ان ذہنی قوانین اور اعمال سے ذوق پیدا ہو جاتا ہے جن پر علم ریاضی مشتمل ہے - اسی طرح تاریخ میں وہ براہ راست تاریخی تحریکوں اور ان کے ارتقاء کے مطالعے میں منہمک ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے بصیرت اور عبرت حاصل کرتا ہے - ادب کے مطالعے کی بدولت اسے خیالات و جذبات اور جمالی احساسات کی ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے جو اس کو کوئی مادی "نفع" نہیں پہنچاتی لیکن اس کے تجربے میں وسعت اور گہرائی اور اس کی قوت احساس میں نزاکت اور لطافت پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے خیال میں ان سب

چیزوں سے اتنا ھی بلکہ اُس سے زیادہ '' فائدہ '' حاصل کرتا ھے جتنا دوسرے آدمی کسی خاص هنر کو سیکھہ کر روپیہ کمانے سے - سائنس کے ایک عالم کے متعلق ' جس نے علم کو طبیعات میں کوئی نیا اور اھم انکشاف کیا تھا یہ قصہ مشہور ھے کہ اس سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کی اس نئی تحقیق کا کوئی عملی فائدہ بھی ھے یا نہیں - اس نے فوراً جواب دیا '' خدا کا شکر ھے کہ اس سے کسی طرح کے فائدہ کا امکان ھی نہیں '' - یہ علمی محققوں کا مخصوص نقطہ نظر ھے جس کا ھمیں احترام کرنا چاھئے کیونکہ وہ جب تک بالکل بے غرضی کے ساتھہ علم کی خدمت نہ کریں اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتے - مگر یہ ضروری نہیں کہ اس علمی تحقیقات کو دوسرے لوگ عملی مصرف میں نہ لا سکیں - بلکہ اکثر ایسا ھوا ھے کہ محقق اپنی جگہہ پر نظری انکشافات کرتا ھے اور دوسرے لوگ اس کو صنعتی کاموں میں استعمال کرتے ھیں - جہاں تک مدرسے کے طلبہ کا تعلق ھے معلم کو ان کی تعلیم کی ابتدا اس طرح کرنی چاھئے کہ ان کے درسی مشاغل ان کی موجودہ زندگی اور شوقوں میں گھل مل جائیں اور اس کے بعد ان کے شوقوں کی نشو و نما اس طرح ھو کہ وہ ان علوم میں بنفسہ دل چسپی لینے لگیں اور ان میں بعید مقاصد کی خاطر محنت اور کوشش کرنے کی قابلیت پیدا ھو جائے - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لئے شاید کبھی ایسا زمانہ نہ آئے کہ اسے بالکل مجرد اور نظری علوم سے دل چسپی اور انہماک پیدا ھو جائے لیکن پھر بھی عقل مند استاد جو فطرت اطفال سے واقف ھو ' اتنا ضرور کر سکتا ھے کہ طلبہ میں درسی مضامین سے تھوڑا بہت شغف پیدا کر دے - اور اس کا طریقہ یہی ھے کہ وہ ھر منزل پر انھیں یہ محسوس کرا دے کہ ان کے لئے ان مضامین کی تحصیل اس وسیع تر معنی

میں "مفید" ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے - یعنی وہ ان کے دل و دماغ اور شخصیت کی اس طرح تربیت کرے کہ ان کی معلومات زیادہ وسیع اور واضح، ان کا مذاق زیادہ شائستہ اور ان کی قوت عمل زیادہ موثر اور مستحکم ہو جائے اور وہ علم و زندگی کے باہمی تعلق کو محسوس کرنے لگیں - لیکن اس کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ معلم خود اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ علوم تمدنی زندگی کی ضروریات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور ان کا منشائے حقیقی یہی ہے کہ وہ اس زندگی کی طرف رجوع کر کے اس کو بہتر اور زیادہ معنی خیز بنائیں اور وہ طلبہ کی زندگی میں بھی ان کا علوم کو انہیں اصولوں کے مطابق جگہہ دے جس کے ماتحت وہ تمدنی زندگی میں وجود میں آئے ہیں -

---

باب دوم

" مدرسہ عمل "

ہم نے گذشتہ باب میں علم اور زندگی کے باہمی تعلق کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مروجہ درسی تنظیم میں یہ تعلق بالکل منقطع ہوگیا ہے جس کی وجہ سے مدرسے کی تعلیم بےجان اور بےاثر ہوکر رہ گئی ہے - اس صورت حال کی اصلاح کے لئے مختلف ملکوں میں بہت سی تعلیمی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جن میں بعض جزئیات اور عملی تجاریز کے اعتبار سے اختلاف ہے ' لیکن اس اصول پر وہ سب متفق ہیں کہ مدرسوں کی تعلیم کو بلکل مجرد اور نظری بنانے کے بجائے طلبہ کی عملی زندگی کے ساتھہ مربوط کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ابتدائی جماعتوں کی تعلیم میں منطقی اصول پر مرتب کئے ہوئے اسباق کی جگہہ عملی اور فعالی مشاغل پر زور دیا جائے تو مدرسہ بجائے ایک " انفعالی " درسگاہ کے واقعاً ایک " مدرسہ عمل " بن جائیگا جہاں طلبہ محض کتب بینی یا محرری کے کام کے لئے تیار نہیں کئے جائینگے بلکہ انہیں تمدنی زندگی کی گوناگوں ضروریات اور فرائض کے لئے تربیت دی جائیگی - اس تحریک کا آغاز بھی بہت سی دوسری مفید تحریکوں کی طرح روسو (Rousseau) کے انقلاب آفریں خیالات سے ہوا لیکن اس نے اپنی فطرت کے مطابق صرف منفی اور تخریبی پہلو پر زور دیا یعنی مروجہ تعلیم کی خرابیوں کو اپنی بے پناہ تنقید کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کردیا - اس کے بعد فروئبل (Froebal) اور پستالزتسی (Pestalozzi) وغیرہ نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا اور اس کے متعلق عملی تجاویز پیش کیں - گزشتہ پچاس سال میں مغربی ممالک کے

ماہرین تعلیم نے اپنی اپنی ضروریات اور نقطہ نظر کے مطابق اس تحریک کی تنظیم کی ہے - امریکہ میں اس کی رہنمائی اور فلسفیانہ تفسیر کا کام پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے انجام دیا ہے - وہ فطرت اطفال، دماغی ارتقا کے قوانین اور اپنے ملک کے معاشری حالات کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک مدرسوں میں تعلیم کی بنیاد ان عملی مشاغل پر نہ رکھی جائیگی جو ایک مختصر پیمانے پر مفید تمدنی مشاغل کا نمونہ ہوں، اس وقت تک نہ تعلیم فطرت اطفال کے لحاظ سے موزوں ہوگی نہ تمدنی زندگی کے لئے مفید ثابت ہوگی [۱] - امریکہ میں بہت سے معلموں نے ولیم جیمز (William James) کی نفسیات اور ڈیوئی (Dewey) کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوکر اس تحریک پر مختلف شکلوں میں عمل کیا ہے اور تعلیم کے طریقے اور نظم و نسق کو اس کے اصولوں پر قائم کیا ہے- تعلیم جدید کا مطالعہ کرنے والے ان میں سے بہت سے جدت آفرین معلموں کے نام سے واقف ہیں مثلاً پارکر (Parker) کلپٹرک (Kilpatrick) مس پارکھرسٹ (Parkhurst) واشبرن (Washburn) اور بیگ لے (Bagley) وغیرہ - پروفیسر اڈولف فیریر (Adolphe Ferriere) نے جو سوئستان کے چید تعلیمی رہنما ہیں اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے اس تحریک کی اشاعت کی ہے اور بالخصوص اپنی ایک نہایت اہم تصنیف (L'Ecole Active) (مدرسہ عمل) کی پہلی دو جلدوں میں اس کی نظری اور عملی تشریح کی ہے اور تیسری جلد میں اس کی عملی تنظیم سے بحث کی ہے اور مدارس عمل کی مثالیں دے کر اس کے اصولوں کو سمجھایا ہے

---

[۱] ڈیوئی کی تمام تعلیمی تصانیف اسی خیال کی تشریح ہیں بالخصوص ان کی مستند تصنیف Democracy and Education جس میں انہوں نے ہر نقطہ نظر سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور تعلیم کا ایک مکمل اور مدلل نظریہ پیش کیا ہے -

[۱] بلجیم کے مشہور معلم ڈکرولی (Decroly) نے اپنے مدرسے میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے - [۲] جرمنی میں ڈاکٹر کرشن‌سٹائنر (Kerschensteiner) نے جو وہاں تعلیم جدید اور اصلاح مدارس کی تحریک کے بانی اور سر گروہ ہیں اور ان کے شاگردوں نے اس تحریک کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو بہت قابلیت کے ساتھہ سمجھا اور سمجھایا ہے - اور جنگ عظیم کے بعد سے اس پر کامیابی کے ساتھہ عمل کر کے مغربی تعلیم پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے - [۳] انگلستان میں بھی مدارس جدید کے بانیوں اور کار کنوں نے تعلیم جدید کے اس بنیادی اصول پر عمل کیا ہے - مثلاً سینڈرسن (Sanderson) نے اونڈل (Oundle) کے پبلک اسکول میں ' بیڈلے (Badley) نے بیڈیلز (Bedales) کے اسکول میں ' مس میکنڈر (Mackinder) نے مارل‌برو (Marlborough) کے اسکول میں اپنے اپنے ماحول کی مختلف ضروریات کے مطابق کتابی مدرسوں کو عملی مدرسوں میں تبدیل کردیا ہے - ہندوستان میں ابھی تک اس تحریک کا عام رواج نہیں ہوا کیونکہ یہاں نہ حکومت اور محکمۂ تعلیم نے اس کی سر پرستی کی ہے ' نہ ایسے تعلیمی تجربے کرنے والے معلم موجود ہیں جو اپنی ذاتی کوشش اور شغف سے تجربی مدارس قائم کریں - لیکن جہاں کہیں کسی

---

[۱] ان کی تمام تصانیف فرانسیسی اور جرمن زبان میں ہیں - البتہ "L'Ecole Active" کی ایک جلد کا انگریزی ترجمہ (Activity School) کے نام سے شائع ہوا ہے -

[۲] اس مدرسے کے حالات کئی کتابوں میں شائع ہوئے ہیں جن میں سے (Mlle. A. Hamaide) کی کتاب جس کا انگریزی ترجمہ (Decroly Class) کے نام سے شائع ہوا ہے خاص طور پر قابل ذکر ہے -

[۳] جرمنی کی جدید تعلیمی تصانیف میں سے بہت کم کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہوا ہے - کرشن‌سٹائنر کی دو کتابوں کا انگریزی ترجمہ موجود ہے جن میں سے ایک (Education as Citizenship) ہے اور دوسری (School and the Nation) - دونوں میں تعلیم کے عملی مسائل سے بحث کی گئی ہے -

بیدار مغز معلم نے عام راستے سے ہٹ کر بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی بنا ڈالی ہے وہاں اسی کا اثر کار فرما ہے - بعض مدارس تو ایسے ہیں جو براہ راست مغرب کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوئے ہیں اور کسی قدر ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ ان پر عمل کر رہے ہیں مثلاً وہ تعلیم گاہیں جن میں طریق ڈالٹن (Dalton) مروج ہے یا موگا کا ابتدائی مدرسہ اور نارمل اسکول جس میں منصوبی طریقہ (Project Methed) آزمایا جارہا ہے - البتہ چند مدرسے ایسے بھی ہیں جن میں ہندوستانی حالات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک بہتر تعلیمی ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - ان میں سب سے زیادہ معروف ٹیگور کا مدرسہ ' شانتی نکتیاں ' ہے جہاں اس فلسفی شاعر نے بچوں کی مکمل اور ہم آہنگ تربیت کے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں انہیں فطرت کے مناظر اور اس کی پر اسرار زندگی سے ہر وقت تعلق رہتا ہے اور ' محنت ' مزدوری باغ بانی اور دوسرے عملی کاموں کے مواقع نصیب ہیں :—

" جب میں کبھی کسی ایسی تعلیم گاہ کا تصور کرتا ہوں جس میں سب سے پہلا اور اہم سبق انسان اور فطرت کا مکمل اتحاد ہو تو میرے دل میں رابنسن کروسو کے جزیرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے - یہ اتحاد محض محبت کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے عملی ارتباط اور ذہنی تعاون کی ضرورت ہے " [۱]

ان تمام مدرسوں میں جزوی اور اکثر اہم اختلافات کے باوجود یہ اصول مشترک ہے کہ ابتدائی تعلیم کی بنیاد عمل پر رکھنی چاہئے اور

[۱] ملاحظہ ہو ٹیگور کے لکچر جو Religion of Man کے نام سے شائع ہوتے ہیں -

علم کو بچوں کے لئے شعوری مقصد نہیں بنانا چاھئے بلکہ اس کو ان کے مرغوب مشاغل کا نتیجہ ہونا چاھئے -

نفسیات کی جدید تحقیقات بھی ھماری رھنمائی اسی نتیجے کی طرف کرتی ھے - پرانے علم‌النفس میں رسمی طور پر یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ انسانی دماغ بنی بنائی نفسی قوتوں کا مجموعہ ھے جن کی تربیت بعض مخصوص علوم اور درسی مضامین کے ذریعے ہو سکتی ھے اور انہیں کے مطالعے سے یہ قوتیں اس طرح تیز ہو جاتی ھیں جس طرح چاقو پتھر پر رگڑنے سے تیز ہو جاتا ھے - استاد کا محض اتنا کام ھے کہ وہ مشق اور اعادے کے ذریعے ان کی تمام مختلف اور منتشر دماغی قوتوں کو مجتمع اور مستحکم بنائے - برخلاف اس کے نفسیات کا موجودہ نظریہ یہ ھے کہ بچے میں اوائل عمر سے بہت سی مخصوص جبلتیں (Instincts) اور عام فطری رجحانات (General Impulses) ھیں جو ابتدا میں مختلف قسم کی جسمانی حرکتوں اور خواهشوں کی شکل میں ظاھر ہوتے ھیں ، اس کے بعد انکے کھیلوں اور تجربوں کی صورت میں ، اور رفتہ رفتہ نشو و نما پا کر مربوط اور مرتب ہوتے جاتے ھیں یہاں تک کہ اس کی شعوری نفسی زندگی پوری طرح منظم ہوجاتی ھے جس طرح انسان کی سیرت اس کو بنی بنائی نہیں ملتی اسی طرح دماغ بھی کوئی مکمل چیز نہیں - بلکہ اس کی اپنی جد و جہد اور تجربات ، اور اس کے ماحول کے باھمی عمل اور رد عمل سے نشو و نما پاتا ھے - یہ جبلی رجحانات جو طلبہ میں ولولہ عمل ، شوق اور تجسس پیدا کرتے ھیں مجرد اور نظری مضامین کے مطالعے سے تربیت نہیں پاتے بلکہ ان مشاغل اور افعال کے ذریعے جن کو وہ فعالی حیثیت سے اور آزادی کے ساتھہ

انجام دیتے ھیں اور جن میں ان کی جسمانی اور دماغی قوتیں متحد ھوکر کام کرتی ھیں - اسی وجہ سے مدارس جدید میں بچوں کی تعلیم کی ابتدا ان کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات سے ھوتی ھے - ان کو ایسے کھیلوں اور کاموں میں لگانے کی کوشش کی جاتی ھے جن کی جانب وہ مدرسے سے باھر بھی خود بخود غیر ارادی طور پر متوجہ ھوتے ھیں - ان مدارس نے جو تعلیمی مشاھدات اور تجربات شائع کئے ھیں ان سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ جب طلبہ کے قدرتی رجحانات کو آزادی کے ساتھہ اظہار کا موقع ملتا ھے تو وہ رفتہ رفتہ رسمی مضامین اور نصاب کی تحصیل میں بھی زیادہ دل لگا کر محنت کرتے ھیں - ان میں ضبط نظم کا قائم رکھنا آسان ھو جاتا ھے اور مدرسہ ان کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتا ھے بہ قول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے :—

" ذھنی زندگی کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ھے کہ بچوں کی زندگی میں ڈھونڈنے اور دریافت کرنے ' اوزاروں اور آلات کو استعمال کرنے ' چیزوں کو بنانے اور خوشی کے جذبات کو ظاھر کرنے کی جبلی خواھشوں کی اھمیت بہت زیادہ ھے - جب ایسے مشاغل ' جو ان رجحانات کو کام میں لاتے ھیں ' مدرسے کے پروگرام کا جزو بن جائیں تو بچے کی پوری شخصیت ان میں منہمک ھوجاتی ھے اور مدرسے کی اندر اور باھر کی زندگی میں جو مصنوعی فصل پیدا ھوگیا ھے وہ دور ھوجاتا ھے - بچوں کو خود بخود یہ تحریک ھوتی ھے کہ وہ ایسے کاموں اور چیزوں کی طرف توجہ کریں جو تعلیمی لحاظ سے مفید ھیں ' جن میں باھمی اشتراک عمل کے مواقع

ملتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کی تمام معلومات کا
تعلق معاشری زندگی سے قائم ہوجاتا ہے - مختصر یہ کہ
کھیلوں اور عملی کاموں کو مدرسے میں اس لئے جگہ نہیں
دی جاتی کہ بچے ذرا دیر خوش ہوجائیں بلکہ اس لئے
کہ وہ عقلی اور تمدنی لحاظ سے ضروری ہیں " [۱]

امریکہ کے دو ماہرین تعلیم نے حال ہی میں جرمنی کی تعلیم
جدید کی تحریکوں کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے - وہ اس اصول کی
تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

" (تعلیم میں) فعالی اصول اور تجربے کا اصول بالکل ہم پایہ
اور ہم معنی ہے اور نفسیات ترکیبی (Structural
Psychology) کا جزو لازم ہے (اس کے مطابق) فرد کو
تخلیقی افعال (Creative Activity) کا سر چشمہ
سمجھنا چاہئے - انھیں کے ذریعے وہ اپنے تجربات کے مجموعے
کو معنی پہناتا ہے اور اُنھیں ایک خاص شکل میں ترتیب
دیتا ہے - اس طرح وہ اپنے نفس کے اندر اپنی دنیا تعمیر
کرتا ہے اور جو چیزیں باہر سے حاصل کرتا ہے ان کو اپنے
اندر جذب اور منظم کرنے کے لئے اپنی تخلیقی قوتوں سے
کام لیتا ہے تاکہ وہ بعد میں ان چیزوں کو جو اس کی
روح میں جاگزیں ہیں عمل میں ظاہر کرسکے - تعلیم کا
سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اس تخلیقی قوت کو اُبھارے
اور اس کی تربیت کرے " [۲]

---

[۱] Democracy and Education صفحہ ۲۲۹

[۲] The New Education in the German Republic
Alexander and Parker : صفحہ ۲۹۰ -

ان مشاغل کو مدرسوں میں رائج کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ طلبہ ذہنی تربیت اور تحصیل علم کی طرف سے غافل ہوکر اپنا تمام وقت ''دست کاری'' سیکھنے میں صرف کریں تاکہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے کے قابل ہوجائیں اور تمدنی زندگی کے کار و باری معاملات میں حصہ لے سکیں یا '' غیر مفید '' مضامین کی طرف سے بے پروائی برتنے لگیں نہ ہی اس تجویز سے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے کسی نہ کسی طرح طلبہ کو مدرسے سے دلچسپی پیدا ہو اور ان کا وقت خوشی اور تفریح کے ساتھہ بسر ہو - اس میں شک نہیں کہ یہ مقاصد بجائے خود مفید ہیں اور یہ بڑی ضروری چیز ہے کہ طلبہ میں عملی کار کردگی اور سلیقہ پیدا ہو ۔ وہ آئندہ زندگی کے کاموں کے لئے تیار ہوں اور مدرسے کے مشاغل کو دلچسپی اور خوشی کے ساتھہ انجام دیں - لیکن یہ تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں - اس اصول کی علت غائی نہیں ہیں - ہمارا اصل مقصد اس سے کہیں زیادہ اہم ہے - یعنی ہم ان مشاغل کے ذریعے طلبہ کو تمدنی زندگی سے روشناس کرنا چاہتے ہیں - اس لحاظ سے ان کی تنظیم اسطرح کرنی چاہئے کہ ان میں شریک ہوکر طلبہ کی عملی اور ذہنی تربیت ہو اور ان کی طبیعت میں تمدنی فرائض کا احساس ، تمدنی معاملات کی سمجھہ ، اور ان میں شرکت کرنے کی قابلیت پیدا ہو - یہ تنظیم صرف اس حالت میں ہوسکتی ہے جب چند ضروری نفسی اور تمدنی شرائط پوری کی جائیں - وہ شرائط کیا ہیں ؟ ان کی سب سے زیادہ مفصل اور مدلل تشریح پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی تصانیف میں کی ہے اور ہم اس مسئلے پر ان کی رہنمائی میں بحث کرینگے -

مدرسے کے مشاغل کو تعلیمی لحاظ سے مفید بنانے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ان کا انتخاب اس اصول پر کیا جائے کہ وہ تمدنی زندگی کے

بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہوں تاکہ ان کے ذریعے
طلبہ جو علم یا ہنر حاصل کریں وہ انہیں اس زندگی کو سمجھنے اور اس
میں شرکت کرنے میں مدد دے اور جب وہ مدرسہ کی چار دیواری سے
نکل کر بیرونی دنیا میں پہنچیں تو ان کی مدرسے کی عادتیں اور
معلومات دنیاوی کار و بار اور معاملات میں کام آئیں - سوسائٹی کی ابتدائی
حالت میں ' جب انسانی زندگی کا نظام مقابلۃً بہت سادہ تھا ' طلبہ
ان مفید عادتوں اور عملی صلاحیتوں کو روز مرہ کے کار و بار اور اپنے عزیزوں
اور ہمسایوں کی صحبت میں حاصل کرلیتے تھے - طباعت کا فن ابھی
ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے کتابیں کمیاب تھیں اور کتابی علوم بہت مشکل
سے حاصل ہوتے تھے اور ان کی قدر بہت زیادہ تھی کیونکہ لوگوں کے لئے اپنے
تنگ تجربات اور خیالات کے تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنے اور ایک
وسیع تر ماحول سے آشنا ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا - اس لئے مدرسے بجا
طور پر انہیں چیزوں پر زور دیتے تھے جو کتابی اور نظری علوم کے مطالعے
سے حاصل ہوتی تھیں اور طلبہ کی ذہنی اور کسی حد تک اخلاقی تربیت
میں مدد دیتی تھیں - لیکن اب یہ صورت حال بالکل تبدیل ہوچکی ہے -
اب نتیجہ خیز اور پر معنی تجربے کمیاب اور کتابیں بہت عام اور سستی
ہوگئی ہیں - ہر شخص جسے پڑھنے کا شوق ہے وہ کتابوں ' اخباروں ' رسالوں
وغیرہ کے ذریعے عمر بھر اپنی کتابی تعلیم جاری رکھہ سکتا ہے - لیکن موجودہ
زندگی میں ' جو کشمکش اور جد و جہد سے معمور ہے کامیابی کے لئے جس '
فعالیت کی ضرورت ہے وہ محض کتابی مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتی -
لہذا مدرسہ جدید کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ محض کتابوں کو اپنا ذریعہ
تعلیم نہ بنائے بلکہ تعلیم میں ایسے عناصر کو داخل کرے جن کے ذریعے
سے ان صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکے جو صنعت و حرفت ' سائنس اور

خیال کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ لوگ بالعموم جس قسم کے کام کرتے ہیں ان میں ذھنی اور اخلاقی تربیت کے وہ امکانات باقی نہیں رھے جو پہلے زمانے میں پائے جاتے تھے - اس ضمن میں اس تمام بحث کو دھرانے کی ضرورت نہیں جو تعلیم اور پیشے کے متعلق کی گئی ھے - صرف اتنا یاد دلانا کافی ھے کہ صنعت و حرفت کے کاموں میں جو انقلابی تبدیلیاں یورپ اور امریکہ میں ہوئی ہیں ان کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ھے اور آئندہ چل کر اور زیادہ پڑے گا - بہت سی مشہور سودیشی دست کاریاں جو زمانے قدیم سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے وسیلہ معاش تھیں اور جن میں انھیں اکثر ذوق جمال اور جدت طرازی سے کام لینے کا موقع ملتا تھا اب یا تو بالکل مفقود ہوگئی ہیں یا ان میں کام کرنے والوں کی کھپت کم ہوگئی ھے ؛ کیونکہ اب ویسی ھی چیزیں بہت آسانی اور کفایت کے ساتھہ مشین کے ذریعے تیار ہوجاتی ہیں - لیکن جہاں اس طرح قوت پیداوار بڑھ گئی ھے وہاں انسانی اور تعلیمی نقطہ نظر سے کام کی قدر و قیمت بہت گھٹ گئی ھے کیونکہ جیسا ہم حصہ اول باب چہارم میں بتا چکے ہیں کارخانوں میں مزدوروں کی حیثیت مشین کے پرزوں کی سی ہوگئی ھے جو بغیر سوچے سمجھے ایک مقررہ معمول کو پورا کرتے رھتے ہیں جس کے لئے انھیں دماغ سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی - اس مشین گردی سے بچنا مشکل اور اس کو برا کہنا فضول ھے کیونکہ وہ تمدنی زندگی کی مادی اور صنعتی ترقی کی ایک ناگزیر منزل ھے - ہمارا کام شکایت کرنا نہیں بلکہ نئے حالات پر قابو پانا اور ان کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ھے - معلم کا فرض یہ ھے کہ وہ تعلیم کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کرے جو ایک طرف صنعت و حرفت کے نئے امکانات سے پورا فائدہ اٹھائے اور دوسری طرف اپنی امتیازی صفات

ترقی کے شوق میں قربان کر دی گئی ہیں - مدرسہ جدید کی یہ کوشش ہے کہ طلبہ میں کام سے محبت اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے اور اس کے ذریعہ ان کی اخلاقی اور ذہنی قوتوں کی تربیت کرے - لہذا وہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرتا ہے جو ان کو تمدنی زندگی کے کاروبار اور نظم و نسق سے روشناس کریں - اس کی غرض یہ نہیں کہ مدرسے کو صنعت و حرفت کے اغراض یا اقتصادی ضروریات کا تابع بنادیا جائے اور قبل از وقت پیشے کی تعلیم شروع کردی جائے بلکہ اس میں معاشرتی احساس اور ذہنی قوتوں کی نشو و نما پر زور دیا جاتا ہے - مدرسے کے مشاغل میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ان میں عقلی تربیت اور سائنس سے واقفیت حاصل کرنے کے امکانات موجود ہوں - سائنس کی جدید ترقی نے اس بات کو بالکل واضح کردیا ہے کہ مختلف علوم و فنون مثلاً زراعت ، ریاضی ، طبیعات ، کیمیا وغیرہ میں ترقی اور توسیع اس طرح نہیں ہوتی کہ ہم اپنے دماغ سے منطقی دلائل کا استخراج کریں بلکہ اس کے لئے تجربے ، مشاہدے اور علمی تحقیقات کے تمام فنی وسائل اور طریقوں کے استعمال کرنے کی ضرورت ہے - اس صورت حال کا اثر مدرسے کے کام پر بھی ہوا ہے - چونکہ اب تمام مفید اور ضروری فنون کی بنیاد سائنس پر قائم کی گئی ہے اور ان کے استعمال اور ترقی کے لئے سائنس سے واقف ہونا شرط ہے - اس لئے ہمیں بہت سے ایسے پیشے مل سکتے ہیں جن کے ضروری اجزا کو مناسب ترتیب کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کر کے ہم مدرسوں کے لئے موزوں مشاغل تجویز کر سکتے ہیں اس قسم کے مشاغل ہمارے چاروں طرف موجود ہیں اور وہ عقلی اور معاشرتی امکانات سے مالامال ہیں لیکن ہم ایک تنگ درسی نقطہ نظر کی چار دیواری میں اسی طرح محصور ہوگئے ہیں کہ ہماری نظر ان تک پہنچتی ہی نہیں -

" انسان کے جتنے مشترک اور اهم ترین مشاغل هیں اُن کا تعلق خوراک ' مکان ' لباس اور مکان کے ضروری سامان سے ' اشیا کے بنانے ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع اور وسائل سے ھے - چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضروریات اور آسائش سے متعلق هیں اسی لئے وہ انسانی جبلتوں کی گہرائی تک پہنچتی هیں - اور ان میں جو معلومات اور اصول پنہاں هیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اهمیت اور قدر رکھتے هیں - اگر هم یہ فرض کر لیں کہ باغ بانی ' پارچہ بافی ' لکڑی اور دھات کا کام ' کھانا ' پکانا اور اسی قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اهم حیثیت رکھتے هیں اور مدارس جدید میں داخل کئے گئے هیں محض روزی کمانے کا ذریعہ هیں تو هم ان کی واقعی اهمیت سمجھنے سے بالکل قاصر رهیں گے - مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک نا گزیر مصیبت معلوم هوتے هیں جس کو وہ محض حصول معاش کی خاطر گوارہ کرتے هیں لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان کے حالات کا ھے جن میں یہ کام لئے جاتے هیں - دور حاضرہ کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اهمیت روز بروز زیادہ هوتی جاتی ھے - اس لئے تعلیم کا فرض ھے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ھے اور ان کا سائنس پر - مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں

جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواهش
سے آزاد هوجاتے هیں تو ان کے ذریعے سے ایسے تجربات حاصل
هوتے هیں جو بجائے خود مفید هیں - اس وقت وہ واقعاً دماغ
کی آزاد تربیت کا باعث هوتے هیں" [۱]

اگر اس اصول پر مشاغل کا انتخاب کیا جائے تو ان سے یقیناً وہ
تعلیمی فائدے حاصل هوسکتے هیں جو اس تحریک کے حامیوں کے مدنظر
هیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ان مشاغل کی ایک مختصر سی
فہرست بھی دی ھے جو بہت سے مدرسوں میں رائج هو چکے هیں اور جن
میں سے اکثر کو انہوں نے اپنے مشہور ابتدائی مدرسے " شکاگو ایلمنٹری
اسکول " میں جو امریکہ کے بیشتر تجربی مدارس کا پیش رو ھے' آزمایا
تھا - وہ ان مشاغل میں جو بچوں کی عام تعلیم کے لئے اور دست کاری
سکھانے کے واسطے مفید هیں' مندرجہ ذیل چیزوں کو شامل کرتے هیں :—

مدرسوں میں طلبہ کاغذ' کارڈ بورڈ' لکڑی' چمڑے' کپڑے' سوت' مٹی'
ریت اور دھاتوں کا کام کرتے هیں کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے
بغیر - اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انہیں بہت سی چیزیں سیکھنی
اور کرنی پڑتی هیں مثلاً کاغذ کاٹنا' تہ کرنا' سوراخ کرنا' ناپنا' ڈھالنا'
ماڈل بنانا' نمونے کاٹنا' گرم کرنا' ٹھنڈا کرنا' هتھوڑے آری' ریتی سے
کام کرنا - یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ
مشاغل کے دوران میں کرنے پڑتے هیں مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کے
تفریحی سفر کے لئے جانا' باغ بانی' کھانا پکانا' سینا' چھپائی' جلدبندی'
کپڑا بننا' رنگ بھرنا' تصویر کشی' ڈراما کرنا' کہانیاں کہنا' اور لکھنا
پڑھنا نہ اس خیال سے کہ ایک خاص فن سیکھنا ھے جو آئندہ چل کر

---

[۱] Democracy and Education صفحہ ۲۳۵ -

مفید ہو گا بلکہ بحیثیت عملی مشاغل کے جن سے ان کے موجودہ مقاصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے مثلاً آپس میں ایک دوسرے کو خط لکھنے یا کہانیاں سنانے کے لئے ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اگر طلبہ یہ محسوس کریں کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر انہیں اپنے دلچسپ مشاغل میں کامیابی ہوگی تو وہ ان کو بہت شوق اور توجہ سے حاصل کرینگے -

بڑا تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان مشاغل کو یا ان میں سے بعض کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا قابل قدر جزو کس طرح بنا سکتے ہیں - اس کتاب میں ہمیں زیادہ تر عام تعلیمی اصولوں سے بحث ہے اس لئے یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم ان مشاغل پر تفصیلی نظر ڈال کر بتائیں کہ ان سے مدرسے میں کس طرح فائدہ اُٹھایا جائے - البتہ یہ عام اصول یاد رکھنا چاہئے کہ بحیثیت تعلیمی وسائل کے ان کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک طلبہ کے مفید شوقوں کو اُبھارتے ہیں اور ان کو نئی اور پائدار دل چسپیوں سے روشناس کرتے ہیں - تعلیم کا منشا یہ ہے کہ وہ طلبہ کی شخصیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کرے اور مدرسے کے یہ مشاغل اس منشا میں اسی وقت معین ہو سکتے ہیں جب وہ بچوں میں صحیح قسم کی دلچسپیاں پیدا کریں اور مختلف علوم کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے دکھائیں تاکہ وہ اپنے علم سے زندگی کے مسائل پر روشنی ڈال سکیں اور زندگی کے تجربات سے علم میں وضاحت اور صحت پیدا ہو - مدرسے کے معمولی درس پر اس قسم کے مشاغل کو اس وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے کہ ان کے ذریعے سے جو معلومات طلبہ حاصل کرتے ہیں اس میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف مضامین ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہتے بلکہ ایک مسلسل عملی مشغلے کے اجزا بن کر باہم مربوط ہو جاتے ہیں - عام طور پر مدرسوں کی

تعلیم میں یہ خرابی ہے کہ وہاں ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور قائم بالذات سمجھا جاتا ہے جس کا نہ دوسرے مضامین سے کوئی تعلق ہے نہ طلبہ کی زندگی اور تجربات سے - تاریخ جغرافیہ ' ریاضی ' ادب ' سائنس وغیرہ سب گویا دماغ کے علحدہ علحدہ خانوں میں بند رہتے ہیں جو کسی خاص موقعے پر مثلاً آموختہ سنانے یا امتحان دینے کے وقت وہاں سے باہر نکلتے ہیں اور بس ! برخلاف اس کے اگر طلبہ کسی با مقصد کام مثلاً باغ بانی میں ' یا تعلیمی سیر و سفر میں ' یا مدرسے کے میدان میں ہندوستان کا ایک بڑا اور مفصل نقشہ بنانے میں مصروف ہیں تو وہ اپنی تمام معلومات سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں اور اپنی کوشش اور دوسروں کی مدد سے نئی معلومات حاصل کرتے ہیں اس طرح ان نئی اور پرانی معلومات میں برابر لازمی اور قدرتی طور پر ربط قائم ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے ان کے علم میں استحکام پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ضرورت کے وقت استعمال میں آسکتا ہے - جب ہم ان تعلیمی مشاغل کو مدرسوں میں داخل کریں یا معمولی درسی مضامین کے طریقہ تعلیم میں منصوبی اصول پر عمل کریں تو ہمیں ہمیشہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرنا چاہئے جن میں مختلف قسم کی معلومات کو مربوط اور منظم کرنے ' ذہنی کاوش اور اجتہاد سے کام لینے اور تجربہ کو زیادہ وسیع اور با معنی بنانے کے امکانات ہوں - یہی اصول منصوبی طریقے کی بنیاد ہے -

اس اصول کی توضیح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے جن کا تعلق مدرسے کے مضامین اور مشاغل سے ہے - باغبانی اُن مشاغل میں سے ہے جن کی اہمیت تمام ماہرین تعلیم نے تسلیم کی ہے اور جس کو خود تعلیم کے عمل سے ایک خاص مشابہت ہے - مدرسے میں باغبانی اسلئے نہیں کی جاتی کہ طلبہ کو آئندہ چل کر پیشہ ور باغبان بنانا ہے یا ان

کا وقت خوشگوار طریقے پر گذارنا مقصود ھے - بلکہ اس کی غرض یہ ھے
کہ انھیں معلوم ھو کہ انسان کے لئے کاشت کاری اور باغبانی کس قدر
ضروری کام ھیں اور موجودہ نظام معاشرت میں ان کی کیا اھمیت ھے - اگر
وہ سمجھدار معلموں کی نگرانی میں اپنے مدرسوں میں کاشت کاری اور
باغبانی کرینگے تو انھیں اس کے ذریعہ پودوں کی نشو و نما ' مٹی کے
کیمیائی اجزا ' روشنی ' ھوا اور رطوبت کے اثرات ' مفید اور مضر کیڑوں
کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملیگا - علم نباتات کے ابتدائی مسائل میں
سے کوئی بات ایسی نہیں جو طلبہ کو پودوں کی نشو و نما اور انکی غور و
پرداخت کے سلسلے میں نہایت معقول اور موثر طریقے پر نہ سکھائی جاسکے
اسطرح ان باتوں کو سیکھنے کا نتیجہ یہ ھوگا کہ وہ جو کچھہ واقفیت حاصل
کرینگے اس کا تعلق ایک خاص مضمون " علم نباتات " سے نہ ھوگا بلکہ وہ
ان کے روزمرہ کے مشاھدات اور مشاغل کا جزو ھوگی اور اس عام معلومات کے
ساتھہ مربوط ھوجائے گی جو وہ زمین کے مظاھر اور انسانی حیوانی زندگی
کے متعلق رکھتے ھیں - یہ بھی ممکن ھے کہ جب ان کا شوق زیادہ پختہ
اور تجربہ زیادہ وسیع ھوجائے تو بعض طلبہ کو ان میں سے بہت سے
مسائل ایسے دلچسپ معلوم ھوں کہ وہ محض علمی تحقیق یا اپنے
ذوق تجسس کی تسکین کے لئے ان کا مطالعہ کریں - مثلاً بیجوں کی
نشو و نما اور پودوں کی خوراک کا مسئلہ ' پھلوں کی پیداوار وغیرہ -
اس طرح اکثر عملی دلچسپیاں رفتہ رفتہ ایک موزوں ماحول اور فطرت
شناس معلم کی نگرانی میں علمی ذوق میں تبدیل ھوسکتی ھیں -
گو بظاھر علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ طریقہ ایک طول عمل معلوم
ھوتا ھے لیکن فطرت اطفال اور ذھنی ارتقاء کے قوانین کا تقاضا یہی ھے کہ
تعلیم میں یہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے - یہ ان مقامات میں سے ھے
جہاں وقت اور محنت کی بیجا کفایت دراصل انتہائی اسراف ھے !

باغبانی کا تعلق مروجه درسی مضامین سے نہیں ھے - مگر یه اصول که تعلیم عمل کے ذریعے ھونی چاھئے درسی مضامین پر بھی صادق آتا ھے هم مروجه نصاب کے تقریباً هر مضمون کو لیکر یه بات ثابت کرسکتے هیں که عقل اور تجربے دونوں کے لحاظ سے اس کی تحصیل میں بچوں کو عملی اور تخلیقی کام کرنے کا موقع دینا چاھئے اور صرف اسي طرح هم ان کي تعلیم کو موثر اور کامیاب بنا سکتے هیں - لیکن اس مثال کی توضیح کرنے سے پہلے یه بتا دینا ضروری ھے که مدرسه عمل کے نقطه نظر سے طلبه کے عملی فعالی اور فرحت بخش مشاغل مثلاً باغبانی اور مروجه درسي مضامین میں جو فصل قائم هو گیا ھے وہ بالکل غیر ضروری اور نقصان دہ ھے اور موجودہ نظریه تعلیم کی رو سے مطلق جائز نہیں - بهر حال اگر هم مختلف علوم خصوصاً علوم صحیحه کي تاریخ کا مطالعه کریں تو هم پر یه حقیقت واضح هوجائے گی که ان سب کی ابتدا مفید اور عملی پیشوں ' صنعتوں اور دست کاریوں کی شکل میں هوئي ھے - علم طبیعیات (Physics) کے باقاعدہ طور پر مدون هونے سے صدیوں پہلے لوھار اور نجار بہت سے وہ اوزار استعمال کرتے تھے جنہوں نے اس علم کی ترقي میں نمایاں حصه لیا ھے مثلاً هتوڑی ' برما ' پیه ' بھٹی وغیرہ - پہلے انسان نے ان چیزوں کے استعمال سے عملی واقفیت حاصل کی اس کے بعد جوں جوں اس کا تجربه اور مشاهدہ وسیع اور منظم هوتا گیا یه عملی واقفیت علم کی صورت اختیار کرتی گئی - واقعه یه ھے که علم اور عمل دونوں اپنی ترقی اور تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے محتاج هیں اور رهیں گے - اوزار اور آلات کے استعمال سے عملی واقفیت پیدا هوتی ھے جو اصطلاحي معنی میں علم کا پیش خیمه ھے اور علم کی ترقی کی بدولت بہتر اوزار اور آلات ایجاد هوتے هیں اور استعمال میں آتے هیں -

پھر اُن بہتر آلات کے ذریعے انسان کی قوت مشاہدہ بہت بڑھ جاتی ھے تجربات میں وسعت پیدا ہوتی ھے اور علم میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ھے - علت ومعلول کا یہ سلسلہ یوں ھی قائم ھے - اسی طرح علم کیمیا کی ابتدا وہ بہت سے مفید اور ضروری کام ھیں جو لوگ صدیوں سے اپنے عملی تجربے کی بنا پر کرتے چلے آئے ھیں مثلاً رنگ ساری ' دھاتوں کا کام ' دوائیں بنانا وغیرہ -

زراعت کو ایک مدون علم کی شکل اختیار کئے تھوڑا ھی عرصہ ہوا ھے لیکن بحیثیت ایک اھم ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ھے علم زراعت میں انھیں تجربوں ' مشاھدوں اور دریافتوں کو ایک مرتب شکل میں پیش کیا جاتا ھے جو انسان نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کاشتکاری کے دوران میں کی ھیں - یہی حال اور تمام علوم کا ھے جو نصاب میں پائے جاتے ھیں - اگر طلبہ ان کی تحصیل کی ابتدا مناسب عملی مشاغل کے ذریعے کریں تو گویا وہ ایسا راستہ اختیار کرینگے جس پر نسل انسانی چل چکی ھے اور جس پر چل کر اسے کامیابی حاصل ہوئی ھے اس صورت میں مختلف سائنسوں کی حیثیت ان کے لئے مجرد اور نظری علوم یا چند ناقابل فہم اصولوں کے مجموعے کی نہ ہوگی بلکہ وہ واقعی یہ دیکھیں گے اور محسوس کرینگے کہ ان کا زندگی سے کتنا گہرا تعلق ھے البتہ یہ ضرور ھے کہ نسل انسانی کے نقش قدم پر چلنے میں انھیں وہ تمام غلطیاں اور تضیع اوقات نہیں کرنی چاھئے جو گزشتہ زمانے میں ھمارے آباؤ اجداد کو مجبوراً کرنا پڑی تھی - مدرسے کے باضابطہ ماحول کی بدولت وہ بہت سی صریحی غلطیوں سے بچ جائیں گے جن میں پڑکر بعض مرتبہ انسانوں نے چھوٹی چھوٹی دریافتوں میں صدھا برس لگادئے ھیں - اور اُن کی علمی ترقی زیادہ یقینی اور اس کی رفتار تیز تر

هو جائے گی - یہی فطرت کی تعلیم اور انسانوں کی ارادی تعلیم کا فرق ھے - مگر جہاں مدرسہ جدید ان کے لئے ایک حد تک محفوظ ماحول مہیا کرے گا وھاں وہ اس بات پر بھی زور دے گا کہ طلبہ ان علوم کی تحصیل میں پوری پوری کوشش کریں ' ان عملی مشاغل میں حصہ لیں جن کا ان علوم سے تعلق ھے ' روز مرہ کی زندگی سے ان کا رشتہ پہچانیں اور یہ دیکھیں کہ نسل انسانی کس طرح آھستہ آھستہ جہالت اور عطائی واقفیت کی منزل سے گزر کر علم اور عقل کی منزل تک پہنچی ھے اس قسم کے عملی مشاغل کا استعمال صرف علوم صحیحہ تک محدود نہیں بلکہ معاشری علوم کی تحصیل میں بھی ان سے اسی طرح کام لیا جاسکتا ھے - مدارس جدید کا تجربہ اس خیال کی تصدیق کرتا ھے اور حال میں تعلیمی تجربات کے جو حالات شائع ھوئے ھیں ان کے مطالعے سے بھی معلوم ھوتا ھے کہ جا بجا معلموں نے یہ کوشش کی ھے اور اس میں کامیاب ھوئے ھیں کہ تاریخ ' جغرافیہ ' ادب وغیرہ کو بطور " رسمی مضامین " کے نہ پڑھائیں بلکہ ان سے طلبہ کی گردوپیش کی زندگی کی تشریح کا کام لیں اور انھیں عملی مشاغل کی شکل میں پیش کریں -

" مبتدیوں کے لئے معاشیات اور مدنیات کے علوم تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین راستہ یہ ھے کہ انھیں یہ معلوم ھو کہ معاشری زندگی میں صنعتی مشاغل اور کاروبار کا کیا درجہ رھا ھے - بلکہ اونچے درجوں کے طلبہ کے لئے بھی ان علوم کی حیثیت بالکل مجرد اور رسمی علوم کی نہ رھے گی جیسی کہ اب ھے اگر ھم اُن کو بجائے باضابطہ علوم کے طور پر پڑھانے کے ان کا مطالعہ اس نظر سے کریں کہ ان کے اصول اور مسائل ان تمدنی گروھوں کی زندگی میں

کس طرح ظاہر ہوتے ہیں جن میں طلبہ خود شریک ہیں "

اس عبارت سے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی مراد یہ ہے کہ تاریخ ' معاشیات ' مدنیات انسانی جغرافیہ وغیرہ کو بھی اسی طرح نہ پڑھانا چاہئے گویا وہ مخصوص فنون ہیں جو ایک خاص منطقی ترتیب کے مطابق مدون کئے گئے ہیں اور جن کی تحصیل طلبہ پر کسی نا معلوم مصلحت کی وجہ سے فرض کردی گئی ہے - بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے گرد و پیش کے انسانی مشاغل معاملات اور کاروبار کو اپنا نقطہ آغاز بنائیں اور بچوں کو مشاہدے ' عملی تجربے اور تقلیدی مشاغل کے ذریعے ان سے اچھی طرح روشناس کریں - اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے تجربات اور مشاہدوں کی بنیاد پر ان " علوم " کی عمارت قائم کریں - تعلیم کے بنیادی عناصر دو ہیں - انسان اور اس کی زندگی اور طالب علم اور اس کے فطری رجحانات - علوم کی مروجہ ترتیب و تنظیم ایک ثانوی چیز ہے جو محض بالغوں کے دماغ کی مخصوص منطق کا عکس ہے - یہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ خود اپنی کوشش کے ذریعے اپنی معلومات میں یہ ترتیب پیدا کرے - ابتدا ہی سے بچوں پر اس خارجی ترتیب کا عائد کرنا ان کی ذہنی تربیت کو روکنا ہے - مروجہ مدارس کی ایک بہت بڑی غلطی یہی رہی ہے کہ انھوں نے علم کے ایک غلط تصور کو بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا اور بچوں کی زندگی کی ضروریات اور اُن کے شوقوں کو اس پر قربان کر دیا -

اونڈل (Oundle) پبلک سکول کے مشہور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انگلستان کے ایک مدرسہ عمل کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے - اس نے اپنی بلند

نظری - اپنی قوت فکر و عمل کی بدولت اپنے اسکول کو جمود کی حالت سے نکال کر ملک کے بہترین ترقی پذیر اسکولوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا - اس کے حالات اور تعلیمی خیالات کے متعلق دو نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتابیں حال میں شائع ہوئی ہیں جن کا مطالعہ معلموں کے لئے بہت مفید اور ہمت افزا ہے [۱] - ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنے خلوص اور محنت کی بدولت ان رکاوٹوں اور مشکلوں پر قابو پا سکتا ہے جو بالعموم مصلحین تعلیم کو پیش آتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ مالی اعتبار سے اس کو بعض آسانیاں حاصل تھیں جو ہمارے یہاں مدرسوں کو نصیب نہیں ہیں اور محکمہ تعلیم کی طرف سے قیود اور قوانین بھی اس قدر سختی کے ساتھ عائد نہیں کئے گئے تھے لیکن پبلک کی مخالفت اور جمود اور قدامت پسندی کے خلاف اس کو بھی بالکل اسی طرح جنگ کرنی پڑی تھی جس طرح ایک ترقی پسند معلم کو ہمارے ملک میں کرنی پڑتی ہے - اس نے ایک مرتبہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے تصور میں مدرسے کا جو نقشہ ہے اس میں کن چیزوں پر زور دیا جائیگا اور تعلیم اور قومی ضروریات میں کس طرح ربط قائم ہوگا :—

" میں جس تبدیلی کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں اس کے لئے ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت ہوگی - نئی قسم کی عمارتیں بنانی پڑینگی اور درسی مضامین کی اضافی

---

[۱] ان میں سے ایک کتاب ویلز (Wells) نے The story of a great School - master (ایک بڑے معلم کی کہانی) کے نام سے لکھی ہے اور دوسری جو زیادہ ضخیم اور مفصل ہے ' سینڈرسن کے شرکائے کار نے اپنی متفقہ کوشش سے مرتب کی ہے اس کا نام " Sanderson of Oundle " ہے - دونوں میں سینڈرسن کی تحریروں اور تقریروں سے کافی اقتباسات دئے گئے ہیں -

قدر میں بہت بڑا انقلاب ہوجائیگا - سائنس جو ایک نیا مضمون ہے اور جدید صنعت و حرفت جو اس سے پیدا ہوئی ہے دونوں کو مدرسے کے تمام شغل میں ایک نمایاں اہمیت حاصل ہوگی - اب یہ کہنا کافی نہیں کہ مدرسے میں سائنس پڑھانی چاہئے - اس کا وقت گذر چکا ہے ـ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس کو مدرسے کی زندگی کا روح رواں بنا دینا چاہئے - سائنس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں تخلیق اور اشتراک عمل لازم ہے - اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر یعنی ترقی اور تبدیلی کی طرف رہتی ہے - اس کے معنی ہیں تلاش حق جس کے لئے عملی تحقیق اور تجربے کی ضرورت ہے - اس کی بنیاد تقلید پر نہیں ہے - اس نئی تعلیمی روح کے زیر اثر ہمیں تمام مضامین یعنی تاریخ ' ادب ' آرٹ بلکہ زبانوں کو بھی از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے -

" اس تبدیلی کی وجہ سے مدرسوں میں نئے قسم کے سامان و آلات اور عمارتوں کی ضرورت پیش آئے گی جن میں صرف " پڑھائی " کے کمرے شامل نہ ہوں گے بلکہ عملی کام کرنے کے لئے بڑے بڑے فراخ ہال درکار ہونگے ـ موجودہ مدارس کے کمروں میں بچے محض " پڑھائے " جاتے ہیں ـ وہ گویا ذہنی اوزار تیز کرنے کی جگہیں ہیں جو یقیناً ضروری ہیں لیکن ان کی اہمیت ثانوی ہے - علمی تحقیق اور تخلیقی اور اشتراکی کاموں کے لئے بڑے بڑے ہال درکار ہوں گے ' انجینئری اور نجاری کے لئے بہت

وسیع کمرے جن میں ہر قسم کی مشینیں اور اوزار مہیا ہوں - ایک لوہار خانہ ' ایک دھاتیں ڈھالنے کا کمرہ ' ایک بڑھئی کی کارگاہ ایک ڈرائنگ کا کمرہ جن میں صنعت و حرفت کے مختلف کام کئے جائینگے اور ہر عمر کے طلبہ کے لئے مناسب مشاغل مہیا ہونگے -

" اس کے علاوہ ایک بہت وسیع ادبی اور تاریخی کارگاہ بھی ہوگی جس میں ایک بڑا کتب خانہ ہوگا جہاں جدید علوم کی کتابیں اور کتب حوالہ‌جات موجود ہونگی - اس عمارت کے دونوں پہلوؤں میں کمروں کا ایک سلسلہ ہوگا جن میں مختلف قدیم و جدید علوم ' تاریخ ' اقتصادیات ادب اور سائنس وغیرہ پر غیر زبانوں کی کتابیں فراہم کی جائینگی - ایسی کتابیں جتنی زیادہ ممکن ہوں مہیا کرنی چاہئیں تاکہ طلبہ کے دل میں دوسری قوموں سے ہمدردی اور ان کا احترام پیدا ہو، اُنہیں ان کے متعلق واقفیت حاصل ہو اور اس طرح زندگی کے ایک زیادہ وسیع اور گہرے نصب‌العین کی بنیاد پڑے - اسی طرح ایک اور گیلری میں جغرافیہ ' علم موالید اور علم‌الاقوام کی کتابیں ہوں گی -

" ایک اور عمارت سائنس کے لئے مخصوص ہوگی جس میں انجینئری کا معمل ہوگا ' مشینوں کا کمرہ ہوگا ' طبیعات ' کیمیا اور حیاتیات کے معمل ہونگے جن میں ہر قسم کے ضروری آلات اور سامان اور عملی کام کے لئے مشینیں ہوں گی جن کی مدد سے طلبہ جدید تحقیقات میں

حصہ لے سکیں گے مثلاً آلات کو جانچنے کی مشینیں وغیرہ - (علاوہ ان کے علم نباتات کا مطالعہ کرنے کے لئے باغ اور کاشتکاری کے لئے زمین بھی ہوگی -

" ایک اور حصہ میں آرٹ اور موسیقی کے لئے کمرے ہونگے ' تھیٹر کا ہال ہوگا اور ایک ایسا کمرہ ہوگا جس میں طلبہ صنعتی زندگی کے اوسطاء اور صنعت و حرفت کے نمونوں کا مطالعہ کرسکیں گے -

" یہ کوئی خیالی یا ناممکن تجویز نہیں بلکہ ہر شہر اور ہر ملک کے مقدور میں ہے " [۱]

" مدرسہ عمل " کی یہ تصویر ہمارے ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے قریب قریب ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ ان تمام سامان اور آلات کا مہیا کرنا سوائے خاص خاص مدارس کے اور کہیں ممکن نہیں لیکن ایک حد تک ہر مدرسہ اس کے تعلیمی اصول پر یقیناً عمل کرسکتا ہے اور ہم آئندہ چل کر بتائینگے کہ نصاب کی تدرین اور تعلیم کس طرح کی جائے کہ اس سے مذکورہ بالا مقاصد حاصل ہوسکیں - في الحال ہمیں مدرسہ عمل کی اس امتیازی خصوصیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ وہ ' کتاب ' کے بجائے تخلیقی اور اشتراکي ' کام ' کو اپنی تعلیم کی بنیاد بناتا ہے اور طلبہ کو ایسے مشاغل میں لگاتا ہے جن میں اُنہیں اپنی جسمانی اور دماغی قوتوں کی ہم آہنگ تربیت کا موقع ملے - اس مدرسے میں تہذیب (Culture) کی بنیاد بھي کتابی علوم پر نہیں رکھی جاتی بلکہ طلبہ میں اس حقیقی تہذیب کو بیدا کرنے کي کوشش کی جاتي ہے جو خود

---

[۱] The Story of a Great School Master صفحہ ۱۳۶ -

کام کرنے اور اس کے معاشري اور اخلاقی نتائج کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے - یہ وہ تہذیب ہے جو ممکن ہے ایک مستعد ، خوش دل مزدور میں یا اس کاشتکار میں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھہ ملکر مفید کام کرتا ہے پائی جائے اور ایک عالم یا ادیب یا فنون لطیفہ کے ماہر کو اس کي ہوا بھی نہ لگي ہو !

باب سوم

"ذهنی تربیت"

ہم نے گذشتہ باب میں مدرسہ عمل کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کی بنیاد عملی مشاغل پر رکھنی چاہیے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم طلبہ کو محض دستکار بنانا چاہتے ہیں اور ان کی علمی اور دماغی تربیت کو مقابلۃً غیر اہم سمجھتے ہیں - تعلیم کے عملی پہلو پر زیادہ اصرار کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس میں تعلیم دینے اور کتابیں پڑھانے کو بالکل ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صلاحیت عمل مفقود ہوتی جاتی ہے - مگر یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہم ان میں ایسی "عملیت" پیدا کرنی نہیں چاہتے جو محض چند مقررہ افعال پر منحصر ہو جن کو وہ بطور ایک معمول کے انجام دے سکیں - ایک مزدور جو اینٹیں ڈھو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے یقیناً کام کر رہا ہے لیکن اس کام کو سکھانے کے لئے مدرسے کی ضرورت نہیں - وہ ایک مفید خدمت ضرور ہے لیکن اس سے مزدور کو کوئی دماغی تربیت یا فائدہ حاصل نہیں ہوتا - اسی طرح اگر مدرسے میں کوئی بچہ پیشے کے طور پر نجاری کا کام سیکھے یا مشینوں کے چلانے میں یا باغبانی اور کاشتکاری وغیرہ میں ماہر ہو جائے تو گویہ چیزیں بجائے خود مفید اور عمدہ ہیں لیکن ان سے اس کے تعلیمی مقاصد کے حصول میں مدد نہیں ملتی - ہمارے مدارس کو ہر لحاظ سے ایک

تعلیمی ماحول ہونا چاہئے نہ کہ پیشہ آموز درسگاہیں - اور انہیں اپنے تمام مشاغل اور نصاب کی ترتیب و تدریں اس طرح کرنی چاہئے کہ ان کے ذریعے طلبہ کی ذہنی تربیت بخوبی ہو سکے - اس لئے ہمیں انتخاب مشاغل کے بعد اس مسئلے سے بحث کرنی ہے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کن اصولوں کے ماتحت کی جائے -

ذہنی تربیت کے لئے ایک شرط لازم یہ ہے کہ طلبہ جو کچھہ کام کریں اس میں ان کو اپنی قوت فیصلہ کو استعمال کرنے ' وسائل اور ذرائع کو کسی مقصد خاص کے ماتحت ترتیب دینے اور اپنی مشکلات کو ذاتی کوشش سے حل کرنے کا موقع ملے - دماغ پر زور ڈالنے اور تدبیریں سوچنے کی ضرورت ہمیں صرف اُس وقت پڑتی ہے جب ہم کسی مشکل مسئلہ سے دو چار ہوں اور اس کا حل ہمیں معلوم نہ ہو - ایسی حالت میں ہم پہلے ایک تدبیر سوچتے ہیں اور اسے آزماتے ہیں ' اگر وہ تدبیر نہیں چلتی تو کسی اور تدبیر سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنی ناکامیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ کامیابی حاصل کرتے ہیں - یہ اصول چھوٹے بچوں کی معمولی کوششوں اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق سب پر برابر عائد ہوتا ہے - جب چھوٹے بچے کوئی نئی بات سیکھتے ہیں خواہ وہ کوئی علم ہو یا ہنر تو وہ اس میں یہی طریقہ عمل اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہی ان کی فطرت کے قوانین کے ساتھہ ہم آہنگ ہے - یہ سچ ہے کہ مدرسوں کا طریقۂ تعلیم اکثر اس سے مختلف ہوتا ہے - استاد بالعموم ہر بات کو بالکل صاف اور واضح کر دیتے ہیں اور سبق کو ان کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور بچے انفعالی طریقے پر اس کو سمجھہ لیتے ہیں اور یاد کر لیتے ہیں - یہ بھی "سیکھنے" کا ایک طریقہ ہے لیکن

اس طرح سیکھنے میں ذہنی جدّت اور تیزی پیدا نہیں ہوتی - اگر ہمارا مقصد طلبہ کی تعلیم سے یہ ہے کہ ان میں مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے اور مشکلات سے عہدہ بر آ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو تو ہم اس قسم کی تعلیم کو کسی طرح مناسب اور تشفی بخش قرار نہیں دے سکتے - اس معاملے میں ہمیں فطرت اطفال اور ان کی نشو و نما کے قوانین سے سبق لینا چاہئے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہئے کہ بچے مدرسے آنے سے پہلے اپنی عمر کے ابتدائی چند سال میں کس طرح بہت سی اہم تریں باتیں سیکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - بچہ کسی کھلونے کو لینا چاہتا ہے جو ایک میز پر رکھا ہوا ہے - وہ اس کی طرف بڑھتا ہے راستے میں پلنگ یا کوئی اور رکاوٹ حائل ہے - وہ اس سے ٹکراتا ہے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوکر یا تو اس چیز کو ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر یہ اس سے ممکن نہیں تو اس کے گرد چکر کاٹ کر میز تک پہنچتا ہے - وہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھلونے تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کا قد چھوٹا ہے اور میز اونچی ہے اب اسے یہ مسئلہ در پیش ہے کہ کھلونے تک کیسے پہنچے - ممکن ہے وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوکر یا اچھل کر کھلونا حاصل کر لے - اگر یہ ترکیب بھی نہ چلے تو شاید کوئی کرسی یا مونڈھا کھینچ کر لائے اور اس پر چڑھ کر کھلونا میز پر سے اتارے اور اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے - یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس طرح بھی کھلونا نہ پا سکے تو کسی دوسرے شخص سے مدد مانگے یا اپنی پہنچ اور قابلیت کی کوتاہی کا احساس کرکے اس مقصد سے بالکل ہی دست بردار ہوجائے - اب ذرا اس سلسلہ حرکات کا تجزیہ کیجئے - ان کی محرک بچے کی ایک فطری خواہش (یعنی کھیل) ہے جس کو وہ تشفی

کرنا چاھتا ھے اس لئے اس کی تمام کوششیں اور ان کی ترمیم اور تبدیلی ایک خاص مقصد ، ایک مستقل ارادے کی تابع ھیں - اس کو کسی نے پہلے سے یہ نہیں بتایا کہ اگر کھلونا لینا چاھتے ھو تو فلاں طریقہ عمل اختیار کرو - وہ اپنے معمولی مشاغل کے دوران میں ایک مشکل کا سامنا کرتا ھے اور اس کو حل کرنے کے لئے اپنے دماغ پر زور ڈال کر ایک تدبیر سوچتا ھے اور اس پر عمل کرتا ھے - اگر اس سے کامیابی نہیں ھوتی تو دوبارہ اُسی تدبیر کو استعمال نہیں کرتا - یا ممکن ھے دو تین بار آزمانے کے بعد اسے یہ اندازہ ھو کہ یہ تدبیر نہیں چلے گی اور پھر وہ اسے ترک کرے - بہر حال اب وہ کوئی اور تدبیر سوچتا ھے اور یہ سلسلہ برابر جاری رھتا ھے یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ھو جاتا ھے یا اسے یہ یقین ھو جاتا ھے کہ کامیابی ناممکن ھے - اس صورت حال میں شروع ھی سے ایسے امکانات موجود ھیں جو اس کي جسمانی اور ذھنی قوتوں کو دعوت عمل دیتے ھیں اور اس میں کوشش اور جد و جہد کی خواھش کو ابھارتے ھیں - اس کو جو کچھہ تجربہ اس کوشش کے دوران میں حاصل ھوتا ھے وہ ھمیشہ کے لئے اس کی قوت عمل اور معلومات کا جزو ھو جاتا ھے - اگر اس طول عمل کے بجائے ھم شروع ھی میں اِسے یہ بتا دیتے کہ کرسی پر چڑھہ کر میز پر سے کھلونا اتار لو یا خود کھلونا میز پر سے لے کر اسے دے دیتے تو اس کو ھر گز وہ ذھنی تربیت حاصل نہ ھوتی جو اس صورت میں ھوئی - یہی حال علمی تحقیق و تفتیش اور پختہ کار ماھرین کی جد و جہد کا ھے - یہ صحیح ھے کہ ان کو اپنے ماحول کا زیادہ علم اور اس پر زیادہ قابو ھوتا ھے - وہ علم حاصل کرنے کے ذرائع سے واقف ھوتے ھیں اور اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ انہیں حسن اتفاق سے کوئی نیا مشاھدہ یا تجربہ حاصل ھوجائے بلکہ وہ خود ایسے حالات

پیدا کرتے ھیں اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ھیں کہ نئے مشاھدے اور تجربے کرسکیں - لیکن باوجود اس تمام فرق کے ان کا تحصیل علم کا طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بچوں کے طریقے سے کچھہ زیادہ مختلف نہیں - ان کے لئے بھی یہ ضروری ھے کہ وہ اپنے علمي اور عملي مشاغل کے دوران میں کسی ایسے مسئلے یا مشکل سے دو چار ھوں جس کو حل کئے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ھو - اس حل کو دریافت کرنے کے لئے وہ اپنے سابق تجربے اور تخیل کی مدد سے کوئي فرضیہ یا نظریہ قائم کرتے ھیں اور اس کے مطابق حالات کو مرتب کرکے دیکھتے ھیں کہ ان کا متوقع نتیجہ پیدا ھوتا ھے یا نہیں - اگر وہ فرضیہ جو گویا پہلی مثال کی "تدبیر" کا قائم مقام ھے کامیاب نہیں ھوتا تو وہ کوئی دوسرا فرضیہ قائم کرتے ھیں اور اس کے ماتحت مختلف قسم کے آلات اور وسائل کی مدد سے تجربے کرتے ھیں اور اپنی غلطیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ اس حقیقت تک پہنچ جاتے ھیں جس کي ان کو تلاش تھی - سوائے ان چند بڑی علمی دریافتوں کے جن کی ابتدا کسی اتفاقي تجربے یا مشاھدے سے ھوئي ھے علم کو بالارادہ حاصل کرنے کا یہي طریقہ ھے اور اسي کو موجودہ زمانے میں "علمی طریقے" کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے جو شاید دور حاضرہ کی سب سے اھم اور قابل قدر دریافت ھے اور جس نے انسان کی ترقی کے امکانات کا دائرہ بے حد وسیع کر دیا ھے - تعلیم کا مقصد یہ ھونا چاھئے کہ وہ طلبہ میں ایسي قابلیت پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی رائے اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے تحصیل علم میں فعالي طور پر حصہ لیں اور خود سوچ سمجھہ کر اپنے افعال کی ذمہ داری قبول کریں اور اپنی رھنمائی کا فرض انجام دیں - عموماً ھر ملک میں جمہور ان صفات سے محروم ھیں - خصوصاً ھندوستان میں تو بدقسمتی سے یہ عالم

ہے کہ لوگ ہر قسم کے معاملات میں بالخصوص معاشرتی اور اخلاقی مسائل میں ، رسمی عقائد کی پناہ ڈھونڈتے ہیں اور مروجہ طرز خیال کے سہارے اندھوں کی طرح ایک راستے پر چلتے رہتے ہیں - ان میں نئے خیالات سے متاثر ہونے اور فکر و عمل کی دنیا میں آزادی اور جرأت کے ساتھ نئی راہیں تلاش کرنے کی صلاحیت ہی نہیں - نہ انہیں ابھی تک تلاش حق کا شوق پیدا ہوا ہے اور نہ تجربی طریقے کی ہوا لگی ہے - اس کی جہاں اور بہت سی وجوہ ہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مدرسوں کی تعلیم بالعموم طلبہ کے ذہن کو معطل رکھتی ہے اس میں ہر بات کے متعلق تحکمی اور قطعی واقفیت ٹھونس دی جاتی ہے جسے حاصل کرنے میں انہیں ذہنی کاوش سے مطلق کام نہیں لینا پڑتا - یہ طریقہ نہ صرف ان مضامین کی تعلیم میں رائج ہے جن کا مقصد ایک حد تک مفید معلومات کا مہیا کرنا ہے بلکہ ان مضامین میں بھی جن کا مخصوص تعلیمی مقصد ہی یہ ہے کہ وہ طلبہ میں ذہنی اجتہاد اور قوت فکر پیدا کریں -

اس بحث سے معلم کے لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب وہ اپنے مدرسے میں تعلیمی مشاغل کو رائج کرے تو اسے یہ نہیں چاہئے کہ وقت محنت اور سامان کی کفایت کے خیال سے بچوں کو پہلے ہی سے کام کرنے کا مفصل طریقہ بتا دے بلکہ مسائل اور مشکلات کو ان کے سامنے پیش کرنے کے بعد ان کا حل کرنا انہیں پر چھوڑدے اور خود صرف ان کی نگرانی اور ہدایت کرتا رہے اور ان کی دلچسپی کو قائم رکھے - اگر وہ ان کے سامنے ایک بنا بنایا نمونہ پیش کردے جس سے کام کے تمام مدارج ان کی سمجھ میں آجائیں یا وہ خود انہیں کام کرکے دکھا دے تو بچوں کے لئے بس یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی دماغی جدوجہد کے انفعالی طریقے پر

اس کي نقل اُتار ليں - ممکن هے که باربار مشق کرنے سے اس خاص کام میں انهیں مهارت پیدا هوجائے اور وہ اس کو آسانی اور تیزي کے ساته کرنا سیکه لیں لیکن اس میں انهیں یه موقع کهاں ملے گا که اپنی قوت انتخاب سے کام لے کر فیصله کریں که انهیں مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقه اختیار کرنا چاهئے جو سب سے زیادہ مناسب ثابت هو ؟ - اس میں شک نهیں که اگر اُستاد اور شاگرد دونوں اس سهل اور محفوظ طریقے کو اختیار کرینگے تو وہ بهت سی غلطیوں سے بچ جائینگے ' سامان اور آلات کا جو صرف بچوں کے عملی کام میں هوتا هے اس میں بهت کفایت هوگی اور اگر محض نمائشی تعلیم مقصود هو تو " نتائج " بهی بهت جلد حاصل هو جائینگے یعنی بچے بغیر سوچے سمجهے چند مقررہ حرکات کو انجام دے سکینگے - لیکن زندگي کی کشمکش اور جدوجهد میں ایسے " نتائج " سے کام نهیں چلتا - کیونکه وهاں هر ذی شعور انسان کو جس کی زندگی محض نقالی اور احکام کی بجا آوری تک محدود نهیں ' آئے دن ایسے مسائل اور واقعات پیش آتے رهتے هیں جن میں قوت فیصله کی اور اپني آزادانه رائے قائم کر کے اس پر عمل کرنے کي ضرورت هوتی هے - زندگی میں کامیابی کے لئے فعالیت کی ضرورت هے - اس کی تربیت دینے کے لئے مدرسے کو ایسا طریقه عمل اختیار کرنا چاهئے که طلبه نئے مواقع اور نئے حالات سے دو چار هوکر ان سے عهدابرآ هونے کی تدبیریں سوچ سکیں -

موجودہ علم نفسیات اس نظریه کو تسلیم نهیں کرتا که جو دماغی قوت انسان کسی خاص کام کو سیکهنے یا کسی خاص مضمون کے مطالعے سے حاصل کرتا هے وہ هر کام اور هر مضمون میں استعمال هو سکتی هے - انسان کا دماغ کوئی چاقو نهیں که اگر اسے پتهر پر رگڑلیا جائے تو وہ هر چیز کو کاٹ دیگا خواہ وہ لکڑی هو یا کپڑا یا کاغذ - پرانا نظریه جس کو جدید

نفسیاتی تحقیقات اور مشاهدے نے مسترد کردیا هے یه تها که اکتسابی قوت ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع میں جوں کی توں منتقل هو سکتی هے یه نظریه جس کو انگریزی میں Transfer of Training (انتقال قوت اکتسابی) کے نام سے موسوم کیا جاتا هے عرصه سے ماهرین نفسیات کے درمیان مابه‌النزاع هے - اس مسئلے کے متعلق موجوده نقطه نظر بحیثیت مجموعی اس طرح بیان کیا جا سکتا هے که وه مخصوص قابلیتیں جو کسی علم یا فن سیکھنے کے دوران میں حاصل هوتی هیں منتقل نهیں هو سکتیں - مثلاً اگر کوئی شخص ریاضی کی تعلیم اور مطالعے کی وجه سے ریاضی کے مسائل کو اچھی طرح حل کر سکتا هے تو اس سے یه لازم نهیں آتا که وه اس سے بالکل مختلف قسم کے معاملات مثلاً سیاسی یا اخلاقی مسائل پر بھی ذهانت اور قابلیت سے بحث کریگا - البته اگر مناسب طریقه تعلیم اختیار کیا جائے تو بعض عام ذهنی رجحانات اور صلاحیتیں ، تحصیل علم کے گر ، نئے مسائل پر غور کرنے کے طریقے ایسے هوتے هیں که ان کو سیکھه کر انسان نه صرف ایک خاص کام کو اچھی طرح کر سکتا هے جس کو اس نے سیکھا هے بلکه جس کام کو بھی کرنا چاهتا هے اس میں ذهنی عادتیں مفید اور معاون هوتی هیں - فرض کیجئے ایک شخص کو مختلف قسم کے کار و بار اور مشاغل میں یه عادت پڑ گئی هے که وه جب کوئی نیا کام کرتا هے تو اپنے مقصد اور ذرائع کا جائزه لیتا هے ، اس مقصد کو پیش نظر رکھه کر کوئی طریقه عمل تجویز کرتا هے اور اس کے مطابق اپنے وسائل اور ذرائع کی ترتیب و تنظیم کرتا هے اور پھر اپنے عمل کے نتائج سے سبق اور تجربه حاصل کرکے آگے قدم بڑھاتا هے یهاں تک که وه کامیاب هو جاتا هے یه تمام طریقه کار اور اس کے ساتھه جو ذهنی عادتیں وابسته هیں وه مختلف قسم کے

بے شمار کاموں اور مواقع میں استعمال ہو سکتی ہیں - اگر کوئی شخص جنگل میں اپنا راستہ بھول گیا ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح راستے پر پڑ جائے تو یہ طریقہ اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا - اگر وہ سائنس یا صنعت و حرفت کے کسی مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے تو اس کو یہی سلسلہ عمل اختیار کرنا پڑیگا - اگر وہ کسی بڑے تجارتی کار و بار میں مصروف ہے تو اُسے اپنی تجارتی پالیسی اسی طرح معین کرنی ہوگی - اگر وہ کسی کمیٹی یا کونسل میں انتخاب کے لئے امیدوار ہے تو بھی اس کو لازم ہوگا کہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع کا جائزہ لے اور ایک معین مقصد کی خاطر ان کی تنظیم کرے - غرض بہت سی صورتوں میں انسان ان میں طریق عمل سے فائدہ اٹھا سکتا ہے - لہذا مدرسہ جدید کے معلم کو اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہئے کہ کسی خاص درسی مضمون کے مطالعے سے طلبہ کی مختلف ذہنی قوتوں کی تربیت ہو جائے گی اور وہ اسی کی بدولت ہر قسم کی مشکلات سے جو زندگی میں پیش آتی ہیں عہدہ برآ ہوسکیں گے - مثلاً اگر ان کا دماغ منطق اور ریاضی کے پیچیدہ مسائل میں منجھ گیا ہے تو یہ مخصوص قابلیت زندگی کی عملی گتھیوں کو سلجھانے اور تمدن و معاشرت کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے گی - بلکہ اسے یہ کرنا چاہئے کہ ان کے تمام مسائل اور اسباق کو اس اصول پر ترتیب دے کہ انہیں مختلف مضامین میں اور مختلف مواقع پر ذہنی اجتہاد اور قوت فیصلہ کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے ' نئے طریقوں کو آزمانے کے لئے آمادگی پیدا ہو اور وہ ہر کام کے لئے کسی بنے بنائے راستے ' کسی سیکھے سکھائے قاعدے کے محتاج نہ رہیں - اس کا ایک بہت اہم فرض یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ طلبہ کو اپنی مدد اور اپنے سہارے سے بے نیاز کردے اور ان کو خود اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھائے - اچھے ڈاکٹر کی طرح ' اچھے استاد کی

پہچان بھی یہی ھے کہ اس کی طرف رجوع کرنے والے کچھہ عرصے کے بعد اس کی امداد اور رھنمائی سے آزاد ھوکر خود اپنی نگہداشت کر سکیں - یہ بات اسی وقت حاصل ھو سکتی ھے جب استاد شروع ھی سے طلبہ کو اس طرح تعلیم دے کہ وہ آزادی کے ساتھہ کام کر سکیں اور اپنی رائے اور فیصلے پر بھروسا کرنا سیکھیں - البتہ اس کے ساتھہ ساتھہ یہ بھی ضروری ھے کہ وہ خود سری سے کام نہ لیں اپنی رائے پر بیجا اصرار نہ کریں اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے اور ان سے سبق سیکھنے کے لئے ھمیشہ تیار رھیں - ممکن ھے کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے ان کو نئے مضامین پر بہت جلد قدرت حاصل نہ ھو یعنی وہ ان کو "جلد" یاد نہ کر سکیں یا ان کے ھاتھہ میں بہت تھوڑے وقت میں صفائی اور سلیقہ پیدا نہ ھو اور جیسا کہ ھم نے اوپر ذکر کیا ھے وہ نمائشی نتائج نہ دکھا سکیں - لیکن اس کمی کی پوری پوری تلافی اس طرح ھوجاتی ھے کہ طلبہ میں ایک عام ذھنی بیداری پیدا ھوتی ھے اور ان میں تعمیر و تخلیق کا شوق اور جدت و اجتہاد کی صلاحیت تربیت پاتی ھے جو اعلیٰ فوری اور عارضی نتائج سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر ھے - مروجہ نصاب کے درسی مضامین کی تعلیم پر اس اصول کا بہت گہرا اثر پڑتا ھے بعض مضامین تو ایسے ھیں جو صریحاً اس اصول کے تحت میں آتے ھیں مثلاً وہ تمام علوم جن کو شعبۂ سائنس سے تعلق ھے - سائنس علوم انسانی کی وہ شاخ ھے جو تمام تر ھماری کوشش اور تخلیق کا نتیجہ ھے - جب انسان کا دماغ اپنے طبیعی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ھے اور مظاھر فطرت کے پوشیدہ قوانین کو دریافت کرنے کے لئے مشاھدات اور تجربات سے کام لیتا ھے تو وہ گویا سائنس کی تشکیل کر رھا ھے - اس کی امتیازی خصوصیت یہی ھے کہ وہ اپنی تدوین اور ترقی کے لئے انسان کی دریافت اور

جستجو کی مرہون منت ہے - اگر مدرسے میں ہم اس خصوصیت کو نظر انداز کر دیں اور استاد طلبہ کو ہر بات بتا دیا کرے یا زیادہ سے زیادہ انہیں چند مقررہ تجربات کرکے دکھا دیا کرے تو سائنس کا تعلیمی مقصد بالکل فوت ہو جائے گا - ان تمام طبیعی ' کیمیاوی ' حیاتیاتی علوم کے بڑھانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مادی ماحول کی قوتوں اور مظاہر کو سمجھیں اور ان سے کام لینا سیکھیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کام لینے کے ذریعے سے ان کو سمجھیں - کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی طالب علم بغیر ذاتی تجربے اور عمل کے سائنس کے کسی اصول یا حقیقت کو محض لفظی بیان اور تشریح سے پوری طرح سمجھ جائے - اس کے لئے ہمیشہ یہ ضرورت ہے کہ انہیں براہ راست سائنس کے آلات اور خواص اشیا کا تجربہ ہو ' وہ ان کو مختلف حالات میں دیکھیں اور ان حالات کو بدل کر اس تبدیلی کے اثرات پر غور کریں اور اس طرح رفتہ رفتہ ان نتائج تک پہنچیں جو ممکن ہے ان کے استادوں اور ماہرین سائنس کے لئے بالکل پیش پا افتادہ ہوں لیکن خود ان کے لئے بڑی حد تک ایک نئی دریافت کی شان رکھتے ہیں - اسی اصول سے متاثر ہوکر زمانہ حال میں سائنس کی تعلیم میں بہت انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تمام مدارس جدید میں پرانی کتابی تعلیم کو ترک کرکے جو سوائے حافظے کے اور کسی دماغی قوت کی تربیت نہیں کرتی تھی' سائنس ایک عملی اور تجربی مضمون بنادی گئی ہے اور مدرسوں میں باقاعدہ معمل اور کارخانے قائم کئے گئے ہیں جہاں طلبہ اپنے ہاتھ سے کام کر سکتے ہیں - وہ سائنس کی معلومات حاصل کرنے اور اس کو مرتب کرنے میں فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور ایک حدتک انہیں حالات میں اور انہیں شرائط کے ماتحت کام کرتے ہیں جو سائنس کے محققین کے لئے درکار ہیں - اس کے عملی پہلو پر زور دینے کے لئے نہ

صرف مدرسوں کے نصاب میں عملی کام کا عناصر بڑھا دیا گیا ھے بلکہ طلبہ کو صنعت و حرفت کے کار خانوں میں اور گرد و پیش کی زندگی میں سائنس کی ایجادات اور ان کے استعمال کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی دیا جاتا ھے تاکہ وہ سمجھہ سکیں کہ سائنس اور متمدن زندگی میں کس قدر قریبی تعلق ھے اور انسان نے کس طرح اپنی قوت تسخیر سے کام لے کر فطرت کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ھے - معلموں کی کوشش یہ ھوتی ھے کہ طلبہ سائنس کو محض چند اصولوں اور قاعدوں کا مجموعہ نہ سمجھیں بلکہ اس کی بدولت ان کے دل میں تسخیر فطرت کا جذبہ اور ولولہ پیدا ھوجائے - اس کوشش کا اظہار کہیں کہیں مخصوص اور مکمل تعلیمی طریقوں کی شکل میں ھوا ھے - مثلاً پروفیسر آرمسٹرونگ (Armstrong) کا " طریقہ دریافت " (Heuristic Method) - اور کہیں اس کا اثر عام ذھنی تربیت کی اصلاح میں نمایاں ھوا ھے جس نے سائنس کے طریقہ تعلیم اور اس کی داخلی روح میں انقلاب پیدا کر دیا ھے -

یہی اصول کسی قدر مختلف صورتوں میں دوسرے مضامین پر بھی عائد ھوتا ھے مدرسے کے نقطہ نظر سے جغرافیہ کی دو قسمیں کی جاسکتی ھیں ایک وہ جو زیادہ تر مظاھر فطرت کے اسباب و نتائج سے بحث کرتی ھے مثلاً یہ کہ بادل کیسے بنتے ھیں ' زمین کی سطح میں تبدیلیاں کیسے ھوتی ھیں - اجرام فلکی کی گردش سے زمین اور پانی پر کیا اثر پڑتا ھے ' آب ھوا اور پیداوار کا باھمی تعلق کیا ھے وغیرہ جغرافیہ کی اس شاخ کو " سائنس " کے مضامین میں شمار کرنا چاھئے - لیکن اس کی ایک دوسری قسم بھی ھے جس کا اصل موضوع انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا تعلق ھے یعنی اس طرح کے مسائل کہ پہاڑ ' دریا '

بارش ' زمین کی پیداوار ' صنعت و حرفت وغیرہ انسان کی زندگی پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور انسان کس طرح ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کو اپنے قابو میں لاتا ہے - جغرافیہ کے جتنے مسائل اس ضمن میں شامل ہیں وہ مدرسوں میں بالعموم اس طرح پڑھائے جاتے ہیں کہ ہر چیز کے متعلق جتنی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے وہ بغیر کسی ترتیب کے بہت خشک ' بے مزہ طریقے سے طلبہ کے سامنے بیان کردی جاتی ہے - مثلاً یہ کہ فلاں ملک میں کون سے پہاڑ ہیں ' کتنے دریا ہیں ' کس قدر بارش ہوتی ہے ' کیا کیا پیداوار ہے ' لوگ کس کس قسم کے کام کرتے ہیں اور ملک کی سیاسی تقسیم کس طرح کی گئی ہے - طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان تمام غیر مربوط اور بظاہر بے مقصد معلومات کو کسی نہ کسی طرح حفظ کر لیں یہ بجائے خود مستقل اہمیت رکھتے ہیں - بھلا بتائیے تو کہ حافظے پر اس طرح کا بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ؟ فرض کیجئے طالب علم کو اپنی آئندہ زندگی میں کسی موقع پر کوئی جغرافی امر معلوم کرنے کی ضرورت آپڑے مثلاً وہ کسی غیر ملک میں سفرکرنا یا کسی پہاڑ کی سیاحت کرنا چاہتا ہے اور اس کے متعلق اِسے واقفیت درکار ہے- ایسے موقع پر وہ اس سرسری واقفیت سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو اس نے جغرافیہ کے سبقوں یا کتابوں سے حاصل کی تھی ضرورت کے وقت وہ ہر قسم کی معلومات کتابوں اور نقشوں سے حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ مفید مطلب واقفیت کو کتابوں سے نکال سکے - پھر ایسے واقعات اور معلومات کو حافظے میں ٹھونس لینے سے کیا فائدہ جن سے نہ کوئی ذہنی تربیت ہو ' نہ ان کی بذات خود کوئی خاص اہمیت ہو ؟ لہذا جغرافیہ کی تعلیم میں بھی ہمیں وہی اصول اختیار کرنا چاہئے جو ہم نے اور تعلیمی مشاغل کے لئے ضروری قرار دیا ہے یعنی مدرسے میں بچوں کے سامنے

مختلف قسم کے جغرافی مسائل پیش کئے جائیں جو ان کے اپنے مشاهدے میں آئے هوں اور ان کے ماحول سے تعلق رکھتے هوں ' جن کے حل کرنے سے انهیں فطرتی طور پر دلچسپی هو - اس کی وجه سے بچوں کو اپنے ماحول کا زیادہ غور کے ساتھه مشاهده کرنا پڑے گا انهیں مختلف قسم کی معلومات فراهم کرنی اور اس کی تربیت و تنظیم کرنی هوگی جو ذهنی تربیت کا بهترین وسیله هے - ان کو اس مضمون میں آسانی کے ساته دلچسپی پیدا هو سکتی هے کیونکه انسانی جغرافیے کی تمام معلومات ایک ایسے موضوع کے تحت میں لائی جا سکتی هے جو بچوں کے لئے فطرتاً دلچسپ هے یعنی " انسان اور اس کی زندگی اور مشاغل " - یه مربوط اور دل چسپ موضوع بچوں کے تمام جغرافی مطالعے کا مرکز بن جائگا تو ان کی متفرق معلومات میں ربط اور نظم پیدا هو گا اور وہ اس کے منشا اور مفهوم کو سمجه سکیں گے - هر سمجهدار اُستاد کو یه چاهئے که بجائے اپنے طلبه کو متفرق اور بے ترتیب باتیں بتانے اور یاد کرانے کے ان کے سامنے ایسے دل چسپ مسائل پیش کرے که مثلاً بتاؤ صحرائے افریقه کے لوگ یا سوئستان کے باشندے کس قسم کی زندگی بسر کرتے هیں اور اس کے کیا اسباب هیں - اب اس مسئله کو حل کرنے کے لئے ان کے پاس اٹلس موجود هے جس کو مطالعه کرکے اور اپنی قوت مشاهده سے کام لےکر وہ بهت سے طبیعی حالات دریافت کر سکتے هیں مثلاً زمین کی ساخت ' پهاڑوں اور دریاؤں کی موجودگی یا غیر موجودگی ' آب و هوا وغیرہ - گزشته واقفیت کی بناپر یا کسی جغرافئے کی کتاب کی مدد سے انهیں یه معلوم هو سکتا هے که اس آب و هوا اور ایسے طبیعی حالات میں وهاں کس قسم کی پیداوار هو گی اور کیا حیوانات پائے جائنگے - اس معلومات کی بنا پر وہ وهاں کے باشندوں کے مشاغل اور طرز زندگی سے بحث کرسکتے هیں اور اُستاد کے رهنمائی کرنے والے سوالوں کی مدد سے

ان کي توجه ایسے امور کی طرف رجوع هو سکتی هے جو اس معاملے مین خاص اهمیت رکھتے هین - اس قسم کي تعلیم سے جس مین ذاتی مشاهدے اور تجربے ' باهمی مشورے اور کتابوں سے استفادے کا موقع حاصل هوگا ان کو مختلف انسانی مسائل اور مظاهر فطرت کا باهمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے گی ' ان کی غور فکر کی قوت اور نتائج اخذ کرنے کی قابلیت نشو و نما پائے گی اور وہ جغرافیے کے مطالعے سے عام ذهنی تربیت حاصل کریں گے جو ان کی زندگی میں بہت سے موقعوں پر مفید ثابت هوگی یہ تعلیمی اصول جس کی توضیح هم نے ایک معمولی سی مثال کے ذریعے سے کی هے - جغرافیے کے بہت سے مباحث پر عائد هو سکتا هے -

اسی طرح اگر هم تاریخ پر بحیثیت ایک درسی مضمون کے نظر ڈالیں تو اس میں بھی اصلاح اور تبدیلي کی بہت گنجائش نظر آتی هے - اس کے مطالعے کی ایک صورت تو وہ هے جو همارے اکثر مدارس میں پائی جاتي هے جس میں طلبہ کو چند ضروری اور غیر ضروری ناموں اور سنوں اور تاریخی واقعات یاد هو جانے کے سوا اور کچھہ بھی حاصل نہیں هوتا - اس طرح کے مطالعے کی حیثیت اگر اس کے لئے "مطالعے" کا وسیع لفظ استعمال کرنا جائز هو بالکل وهی هے جو اور بہت سے ارتسامات (Impressions) کی جن سے انسان کے بعض حواس متاثر هوتے هیں لیکن اس کے دماغ یا اس کی زندگی پر کوئي خاص اثر نہیں پڑتا - فرض کیجئے ایک ناواقف اور ناتجربہ کار شخص کسی غیر ملک کے ایک بہت بڑے تجارتی مرکز میں جاتا هے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتا اور وهاں بہت سي غیر مانوس آوازیں سنتا هے اور اجنبي لوگوں ' غیر مانوس چیزوں اور کاروبار کو دیکھتا هے - اس پر ان تجربات کا کیا اثر هوگا ؟ یہ سب آوازیں اور نظارے محض اس کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ کو متاثر کرتے هیں اور بس -

اگر وہ ان کے باھمی تعلق اور مفہوم سے واقف نہیں ' اگر وہ اس مقصد کو جو ان میں ربط پیدا کرتا ھے نہیں سمجھتا تو یہ تمام متفرق تاثرات نہ اس کے علم میں اضافہ کر سکتے ھیں نہ اس کے عمل میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتے ھیں - اس کا ذھن انفعالی طریقے سے ان تاثرات کو قبول کر لیتا ھے لیکن ان کا ادراک نہیں کر سکتا - یہی حال اس ناواقف طالب علم کا ھے جس کو بغیر کسی ذھنی تیاری ' بغیر ذاتی تجربے اور مشاھدے کے تاریخ کے ناپیدا کنار سمندر میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کی لہریں گنا کرے جن کا نہ وہ باھمی تعلق سمجھ سکتا ھے نہ اپنی زندگی کے ساتھ ان کی وابستگی کو محسوس کرتا ھے - جب تاریخ کے واقعات بے ربط اور بے جان معلومات کی حیثیت سے طالب علم کے سامنے پیش کئے جاتے ھیں جن کو کسی بیرونی دباؤ یا اثر کی وجہ سے اپنے حافظے میں محفوظ رکھنا ھے تو تاریخ کا مطالعہ نہ اس کے تجربے کو وسیع بنا سکتا ھے نہ معنی خیز - وہ ماضی کے ارتقائی سلسلے کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ یہ محسوس کر سکتا ھے کہ آج جو کچھ ھے وہ گذشتہ زمانے کے لوگوں کی متعدد کوششوں کا نتیجہ ھے - اس میں حال کی قوتوں اور تحریکوں سے مستقبل کے لئے کام لینے کی صلاحیت نہیں پیدا ھوتی اس کی روز مرہ کی زندگی اور مشاغل کا سلسلہ ایک سطح پر جاری رھتا ھے اور ایک دوسری سطح پر وہ بہت سی ایسی باتوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتا ھے جو اس کے ذاتی تجربات کی دنیا سے بالکل بعید اور غیر متعلق ھیں - مثلاً یہ کہ اب سے کئی ھزار سال قبل اشوک اعظم ھندوستان کا ایک شہنشاہ تھا جس نے ایک خوں ریز جنگ کے بعد امن پسندی اختیار کر لی تھی - یا علاءالدین نے دکن کے بہت بڑے حصے کو فتح کیا - ظاھر ھے کہ ایسی حالت میں زندگی کی ان دونوں سطحوں کے

درمیان کوئی نتیجہ خیز رابطہ قائم نہیں ہوسکتا یعنی تاریخ کے مطالعے سے طلبہ کے ذاتی تجربات کی معنویت اور اہمیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا - کیونکہ اول تو مباحث کا انتخاب بہت مہمل اور قابل اعتراض ہوتا ہے جس میں سطحی نمائشی اور غیر ضروری چیزوں کو اہم تمدنی مسائل اور معاشری معاملات پر ترجیح دی جاتی ہے - دوسرے طریقہ تعلیم ایسا اختیار کیا جاتا ہے کہ طلبہ جو کچھ سیکھتے بھی ہیں اس پر پوری ذہنی قدرت حاصل نہیں کر سکتے - اس سے نہ ان کی دماغی تربیت ہوتی ہے نہ وہ اس واقفیت سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں -

تاریخ کے مطالعے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسے ہم تمدنی معاشری اور سیاسی مسائل کے سمجھنے اور حل کرنے کا ذریعہ بنائیں اور اس کی مدد سے انسان کی ادراک معانی کی قابلیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کریں - اگر اس کے مطالعے کی بدولت ہم اپنے ذاتی اور وقتی کار و بار کی حقیقی اور مستقل اہمیت اور ان کے ارتقاء کے سلسلے کو سمجھہ سکیں تو تاریخ ذہنی تربیت کا موثر ترین وسیلہ بن جاتی ہے - تاریخ کی تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ طالب علم کو معلوم ہو جائے کہ اس کے روزمرہ کے کاموں کا تعلق وسیع تر انسانی مشاغل سے کیا ہے اور جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے اس میں یہ استعداد بڑھتی جائے کہ تمدنی امور اور مسائل پر ارتقائی نظر ڈال سکے اور ماضی حال اور مستقبل کی باہمی وابستگی اور ان کی تشکیل میں انسان کی کار فرمائی کو محسوس کرے - اگر تاریخ کے منشا کی یہ تشریح صحیح ہے تو اس سے تاریخ کے نصاب اور طریقہ تعلیم دونوں میں ترمیم لازم آتی ہے - اس کی عملی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لیکن بعض باتیں بالکل بدیہی اور واضح

ھیں - مدرسوں کے نصاب میں بجائے تاریخ کے سیاسی اور حربی
پہلو پر زور دینے کے اس کے انسانی اور تمدنی رخ کو نمایاں کرنے کی
ضرورت ھے - ان لڑائیوں کے واقعات اور تفصیلات ھمارے لئے کوئی
اھمیت نہیں رکھتے جو اب سے سینکڑوں سال پہلے لڑی گئی تھیں -
ھمیں اس وقت صرف ان نتائج سے بحث اور سروکار ھے جنھوں نے
انسانوں کی زندگی اور جماعتوں کے باھمی تعلقات پر اس طرح اثر
ڈالا کہ ھماری اپنی زندگی بھی اس سے بلا واسطہ یا بالواسطہ متاثر
ھوئی - ھمیں کم از کم مدرسے کی تعلیم میں ان سیاسی پیچیدگیوں
اور ملکی تقسیموں سے بھی زیادہ تعلق نہیں جو مختلف زمانوں
میں ھوتی رھی ھیں سوائے ایسی حالت کے جب ان کی وجہ سے
ملکی معاشرت اور تمدن میں اھم تبدیلیاں رو نما ھوئی ھوں -
تاریخ کے انسانی رخ کو نمایاں کرنے سے ھمارا مطلب یہ ھے کہ نصاب
میں بعض خاص چیزوں کو زیادہ اھمیت دی جائے مثلاً بڑے بڑے
مشاھیر کی سوانح زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے نہ بحیثیت افراد کے
کیونکہ اس لحاظ سے ان کا تعلق تاریخ سے زیادہ نفسیات کے علم سے ھے
بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ تمدنی تحریکوں کے نمائندے ھیں اور
ان کی زندگی اور کارناموں سے ان تحریکوں پر بہت کچھ روشنی
پڑتی ھے - یعنی ھمیں ان کی انفرادی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ
ان کے عہد کے معاشرتی اور تمدنی حالات کا مطالعہ کرنا بھی ضروری
ھے جو ان کے خیال اور عمل کے متحرک ھوئے اور جنھوں نے ایک طرف
ان کی ذات پر اپنا اثر ڈالا اور دوسری طرف خود ان کی ذات سے متاثر
ھوئے - دوسرے چھوٹے بچوں کے نصاب تاریخ میں ھمیں ابتدائی زمانے
کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل کرنا چاھئے کیونکہ اس میں انسانی
زندگی کے سب سے زیادہ اھم اور مستقل مشاغل اور اداروں کا آغاز

بہت وضاحت کے ساتھہ نظر آتا ہے اور بچے سمجھہ سکتے ہیں کہ موجودہ تمدن کے پیچیدہ نظام کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اس کی بنیادیں کن چیزوں پر قائم ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جب نہتا انسان فطرت کی زبردست ، بے رحم اور بے پناہ قوتوں کے ساتھہ بر سر پیکار ہے - یہ صورت حال اُس کی فعالیت ، اس کی قوت عمل ، اس کی قوت اختراع کو ابھارتی ہے اور وہ طرح طرح کے آلات اور ہتیار ایجاد کرکے اُن قوتوں کو رفتہ رفتہ اپنے قابو میں لاکر اپنا دوست اور خادم بناتا ہے - اس کی ایک مثال ہم کسی گذشتہ باب میں رابنسن کروسو کے قصے سے دے چکے ہیں - اس حالت میں انسان کو روزی حاصل کرنے کے لئے شکار اور زراعت کی ، گرمی ، سردی اور جانوروں وغیرہ کے خطروں سے بچنے کے لئے مکان ، اور بدن کی حفاظت کے لئے کپڑا جوتا وغیرہ بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس طرح ان تمام پیشوں اور مشاغل کی ابتدا ہوتی ہے جن کو ہم آج زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ شکل میں موجودہ تمدن کا جزو پاتے ہیں - ان تمام کاموں کے ذریعے انسان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سراسر اپنے ماحول کا محتاج ہے اور اس کی وساطت کے بغیر کچھہ نہیں کر سکتا - غرض اس قدیم اور ابتدائی انسانی تمدن کا مطالعہ بچوں کے لئے بہت مفید اور دل چسپ ہے - بشرطیکہ اس میں عملی طریقوں سے کام لیا جائے جن کی مختصر سی تشریح ہم ذیل میں کریں گے - تیسری چیز جس کو نصاب میں نمایاں حیثیت دینی چاہئے صنعت و حرفت اور اقتصادی تاریخ ہے - اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ اقتصادی تاریخ بطور ایک علم کے مدرسے کے طلبہ سامنے پیش کی جائے کیونکہ ان میں ابھی اتنی دماغی پختگی نہیں آئی کہ وہ تاریخ کے مجرد تصورات کو ذہن نشین کر سکیں بلکہ انہیں

یہ بتانا چاہئے کہ ان کے آباؤ اجداد نے کس طرح اس مقام سے ابتدا کرکے ' جس کا حال وہ ابتدائی زمانے کی تاریخ میں پڑھ چکے ہیں ' رفتہ رفتہ صنعت و حرفت اور معاشرت کے موجودہ نظام کو اپنی متعددہ کوششوں کے ذریعہ تعمیر کیا ہے اور کس طرح اس زمانے میں وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہتے ہیں تقسیم عمل اور اشتراک عمل کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں اور دنیا کا کام چلاتے ہیں ' اور انسان کی مجموعی ترقی میں صنعت و حرفت کا کیا حصہ ہے - چوتھی چیز جس کی جانب پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ہمیں توجہ دلائی ہے اور جس کو ان کے خیال میں معلموں نے عام طور پر نظر انداز کیا ہے وہ علمی اور عقلی ترقی کی تاریخ ہے - تاریخ کے مطالعے سے طلبہ میں اس بات کا صحیح احساس پیدا ہونا چاہئے کہ انسان کی ترقی میں اس کی دماغی جد و جہد اور کاوش کو کس حد تک دخل ہے اور سائنس اور دوسرے علوم نے تجارتی ارتقاء میں کیا نمایاں خدمت انجام دی ہے - وہ لکھتے ہیں :—

" ہم میں یہ احساس ابھی حال ہی میں پیدا ہوا ہے کہ وہ بڑے بڑے سورما جنھوں نے انسانوں کی قسمت کو بنایا ہے ماہرین سیاست فوجی جرنیل اور ملکی لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ علمی محققین اور موجد ہیں جن کی بدولت انسان کے قبضہ قدرت میں ایسے ذرائع آ گئے ہیں جو اس کے تجربے کی توسیع اور تنظیم کرتے ہیں اور وہ صناع اور شاعر ہیں جنھوں نے اس کی جد و جہد ' اس کی کامرانیوں اور ناکامیوں کے افسانے کو مصوری کے ذریعے یا مجسموں کی شکل میں یا الفاظ کے پیکر میں ایسے دلکش انداز سے بیان کیا ہے

کہ اس کا مطلب اور مفہوم تمام لوگوں کی سمجھہ
میں آجاتا ہے......انسانی دماغ نے زندگی کے ارتقاء میں
جو حصہ لیا ہے اس کا صحیح احساس پیدا کرنے کا
اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے
مطالعے سے طلبہ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ بدویت
کے زمانے سے موجودہ دور تمدن تک جس قدر ترقی
انسان نے کی ہے اس کا انحصار علمی دریافتوں اور
ایجادوں پر ہے اور وہ یہ سمجھہ لیں کہ بہت سے ایسے
واقعات جن کو عام طور پر تاریخی تصانیف میں
اہمیت دی گئی ہے محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں
بلکہ انہوں نے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں
جن کو عقل نے ذریعے زیر کرنا پڑا ہے" [۱]

لیکن صحیح نصاب کا تعین بجائے خود کافی نہیں جب تک
استادوں کا طریقہ تعلیم اور طلبہ کا طریقہ تحصیل دونوں درست نہ
ہوں - کیونکہ ہمارے تعلیمی نظریے کی رو سے نصاب اور طریقہ تعلیم
دو بالکل جداگانہ چیزیں نہیں ہیں یعنی ہم یہ نہیں سمجھتے
کہ نصاب بجائے خود ایک مکمل اور مرتب چیز ہے جس پر بعض
خارجی طریقوں سے طلبہ کو عبور حاصل کرنا ہے - نصاب کی ترتیب
و تنظیم در اصل اس طریقے پر منحصر ہے جس کے ذریعے طلبہ اس کا
مطالعہ کرتے ہیں یعنی ایک معنی میں وہ اپنا نصاب خود بناتے
ہیں - مثال کے طور پر تاریخ کو لیجئے - ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخی
واقعات طلبہ کے سامنے بطور زندہ مسائل اور معاملات کے پیش

---

[۱] Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۵۴ -

کئے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو وہ اس کی تحریکوں
کو اسی نظر سے دیکھیں جس سے وہ لوگ دیکھتے تھے جن کو
ان سے براہ راست سابقہ پڑا تھا - جس حد تک ہم تاریخ کے
بظاہر مردہ جسم میں روح پھونک سکیں گے یعنی ماضی کے واقعات
کا ربط اور تسلسل حال کے مسائل کے ساتھہ قائم کر سکیں گے اسی حد
تک تاریخ کی تعلیم میں شگفتگی اور دل چسپی پیدا ہوگی - جہاں
کہیں صاحب نظر اور باتخیل معلموں نے تاریخ کی تعلیم میں
جان ڈالی ہے انھوں نے ہمیشہ اس کو ماضی کے بھولے بسرے افسانوں
کے بجائے حال کی تفسیر بنا دیا ہے اور طلبہ کو یہ محسوس کرایا
ہے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کے تمام واقعات ایک دوسرے سے
وابستہ ہیں اور علت و معلول کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں -
پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنے شکاگو کے تجربی مدرسے کے کچھہ
حالات Elementary School Record کے نام سے شائع کئے تھے - ان میں
سے چند ضروری اقتباسات اور مضامین کو پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے
مرتب کرکے اپنے دیباچہ کے ساتھہ "School and the Child" کے نام سے
شائع کیا ہے - اس کے ایک باب میں مصنف نے تاریخ کے طریقۂ تعلیم سے
بحث کی ہے اور اس کے اصولوں کو مختصر طور پر بیان کرکے بتایا
ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنے اسکول میں ان پر عمل کیا - اس مدرسے
کے طلبہ تاریخ کے مطالعے کی ابتدا سیاسی تاریخ کی درسی کتابوں
سے نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے اپنے گرد و پیش کی معاشری اور
اقتصادی زندگی کے مشاغل اور انسان کی ابتدائی زندگی یعنی عہد
حجری اور عہد فلزی کے اور وحشیوں کے طریقہ بود و باش وغیرہ کا
مطالعہ کرتے ہیں - اپنے قریبی ماحول کو سمجھنے کے لئے وہ ذاتی
مشاہدوں تعلیمی سیر و سفر اور عملی تجربوں سے کام لیتے ہیں -

بازاروں ، دوکانوں ، کارخانوں ، صنعتی کار گاھوں وغیرہ کو غور سے دیکھتے
ھیں اور جہاں تک ان سے ممکن ھے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے
ھیں کہ لوگ کس طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے ھیں اور اپنی
ضروریات فراھم کرتے ھیں قدیم زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک
طرف تو وہ خود اسی قسم کی زندگی بسر کرتے ھیں اور اس زمانے کے
مشاغل مثلاً گھر بنانے ، آگ جلانے کپڑا بننے ، کاشتکاری وغیرہ کی
تقلید کرکے اس جگ بیتی کو آپ بیتی بنا دیتے ھیں اور دوسری طرف
تصویروں ، عجائب خانوں کے نمونوں اور کتابوں وغیرہ کے ذریعے اپنی
معلومات اور تخیل میں وسعت اور وضاحت پیدا کرتے ھیں - اس
طرح وہ اپنی موجودہ زندگی کے سادہ اور عام فہم مظاهر کو سمجھنے
میں اور ابتدائی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں عملی اور فعالی
طور پر شریک ھوتے ھیں اور تاریخ کے اس اھم تریں مسئلے کو ذاتی
تجربے اور مشاھدے سے حل کرتے ھیں کہ انسان کی صنعت و حرفت
اور معاشری زندگی کی تنظیم کس طرح ھوئی اور اس نے اپنی تمام
ضروریات کیونکر پوری کیں - ان باتوں کو سیکھنے کی ذمہ داری زیادہ
تر خود طلبہ پر ھے - معلم کا کام اس میں صرف اتنا ھے کہ وہ ان کے
ذوق تحقیق و تجسس کو ابھارتا رھے اور مدرسے میں کتابوں ، نقشوں ،
تصاویر وغیرہ کی مدد سے اور اپنی شخصیت کی اثر آفرینی اور نصاب
کی معقول تنظیم کے ذریعے ان کے لئے ایک ایسا ماحول مہیا کردے
کہ ان میں تاریخی ارتقا کا احساس بیدار ھو اور وہ تاریخ کے اس
مرکزی مسئلے میں دل چسپی لیں کہ انسانی سوسائٹی کس طرح
اپنی ابتدائی حالت سے موجودہ حالت کو پہنچی -

ابتدائی تاریخ کی تعلیم کا یہ نظریہ صرف ایک ھی تعلیمی
مفکر تک محدود نہیں بلکہ دوسرے ماھرین تعلیم نے بھی اپنی

مقامی اور ذاتی ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی کرکے اس طریقہ کو استعمال کیا ھے - مثلاً ڈاکٹر فیریر نے " مدرسہ عمل " کے متعلق اپنی ضخیم تصنیف کی تیسری جلد [۱] (مدرسہ عمل کی عملی تنظیم) میں تاریخ کی ابتدائی تعلیم کے لئے جو طریقہ تجویز کیا ھے اس میں بھی بچوں کے ذاتی مشاھدے اور عملی کام پر زور دیا ھے - ان کی تجویز یہ ھے کہ بچوں کو سب سے پہلے اس موضوع کا مطالعہ کرنا چاھئے جو ان کی دل چسپی کا قدرتی مرکز ھے یعنی " انسان کی ضروریات زندگی اور ان کا پورا ھونا ' - بچے فطرتاً یہ بات معلوم کرنا چاھتے ھیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں نے اپنی اھم ترین ضروریات یعنی لباس ' خوراک حفاظت ذات وغیرہ کے لئے کیا انتظام کیا ھے - اس مبحث کے متعلق طلبہ مختلف ذرائع سے معلومات بہم پہنچاتے ھیں اور ان کو ایک خاص طریقہ سے کارڈوں پر درج کرتے ھیں جن کا نام مصنف موصوف نے " اسباق حیات ' رکھا ھے - استادوں کی نگرانی میں وہ ان تمام معلومات کو عنوانات بالا کے ماتحت مرتب کرتے ھیں اور اس طرح اپنی ذاتی کوشش اور دوسروں کی مدد سے حاصل کی ھوئی واقفیت میں نظم و ترتیب قائم کرنا سیکھتے ھیں اور یہی واقفیت آگے چل کر تاریخ اور انسانیات کے دوسرے شعبوں کی سنگ بنیاد بن جاتی ھے - پروفیسر فاریادی واسکونسلو (Faria de Vasconcellos) نے بھی اپنے بلجیم کے مدرسے کے حالات میں لکھا ھے [۲] کہ تمام مضامین کی تعلیم میں عملی مشاغل اور طلبہ کی ذاتی کوشش کو نمایاں اھمیت دینی چاھئے - اس مدرسے میں طلبہ جب

---

[۱] La Pratique de l'ecole active یہ کتاب فرانسیسی زبان میں ھے - اس کا ابھی تک ترجمہ نہیں ھوا -

[۲] ان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ A New School in Belgium کے نام سے شائع ھوا -

تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ خود اس کی تحصیل میں جسمانی جد و جہد اور ذہنی کاوش سے کام لیتے ہیں اور حتی‌الامکان کسی بات کو استاد سے سن کر یا کتاب میں پڑھ کر بغیر غور اور تنقید کئے قبول نہیں کرتے - اونچی جماعتوں میں خاص کرکے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ طلبہ کے لئے ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ خود اپنی قوت فکر و عمل اور اجتہاد سے کام لے سکیں اور استاد ان کو ہر کام کے لئے ایک بنے بنائے راستے پر نہ ڈال دے جس پر وہ بغیر سوچے سمجھے ' بغیر اپنے دماغ پر زور ڈالے چلتے رہیں - اسی خیال سے متاثر ہوکر اور طلبہ کو تاریخ کے مطالعے میں فعالی حیثیت سے شریک کرنے کے لئے پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے ' جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے پروفیسر ہیں ' اپنا Source Method مرتب کیا ہے [۱] جس کی بنیاد یہ اصول ہے کہ مدرسے میں طلبہ کو ایک حد تک مورخ بننے کا موقع دیا جائے یعنی ان کے لئے کم و بیش ایسے حالات مہیا کئے جائیں جن میں مورخ تاریخ کو ترتیب دیتا ہے - عام طور پر مدرسوں میں یہ ہوتا ہے کہ طلبہ معمولی درجے کے کم علم مولفوں کی درسی کتابوں کو پڑھ کر نہ صرف تاریخی معلومات حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کی رائے اور خیالات اور نزاعی مسائل میں ان کے فیصلوں کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں - ظاہر ہے کہ اس طریقہ پر تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ان میں نہ کوئی بصیرت پیدا ہوسکتی ہے نہ آزادی رائے نہ ذہنی تربیت - چنانچہ کیٹنگ Keatinge کی تجویز جس پر انہوں نے عمل کرکے دیکھا ہے یہ ہے کہ انہیں چشم دید حالات کے لکھنے والوں اور مستند مصنفوں کے بیانات مطالعے کے لئے دئے جائیں اور بالعموم ایک ہی واقعہ کے متعلق مختلف ہم عصر مورخوں کی رائے بتائی

[۱] اس طریقہ پر انہوں نے تفصیلی بحث اپنی کتاب Teaching of History میں کی ہے -

جائے - اس تمام تاریخی مواد پر جو طلبہ کے سامنے رکھدیا جاتا ہے چند سوالات قائم کئے جاتے ہیں جن کا جواب دینا ان کا کام ہوتا ہے - اگر یہ سوالات سوچ سمجھہ کر بنائے جائیں تو ان کا صحیح جواب دینے کے لئے انہیں اپنی سمجھہ اور قوت فیصلہ سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے - مختلف مورخوں کی ذاتی خصوصیات اور کمزوریوں اور ان کے تعلقات اور حالات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے - ان کے تعصب یا جانبداری کی وجوہ کو سمجھنا ' خلاف قیاس باتوں کو مسترد کرنا ' جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو گذشتہ زمانے کے لوگوں کا ہم خیال بناکر ان کے نقطہ نظر سے معاملات کو جانچنا ' یہ تمام مطالبات طالب علم کو ذہنی جد و جہد اور غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں - متضاد اور مختلف بیانوں میں سے حقیقت امر معلوم کرنے کے لئے اسے ایک حد تک وہی کد و کاوش اور رد و قدح کرنی پڑتی ہے جس سے ایک انصاف پسند مورخ کام لیتا ہے جب وہ مختلف قسم کا مواد بہم پہنچا کر کسی زمانے کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے - لیکن یہ مشابہت بہت محدود ہوتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک نو عمر ' خام کار طالب علم ایک مستند مورخ کی طرح کام نہیں کرسکتا - وہ گذشتہ زمانوں کی زندگی اور لوگوں کے خیالات اور جذبات اور ان کے محرکات عمل کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کے لئے نفسیات کا نظری علم اور عملی تجربہ درکار ہے جو اسے حاصل نہیں - وہ معلومات حاصل کرنے کے ان غیر مرتب ذرائع سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو مورخ کے لئے کارآمد ہوتے ہیں - مثلاً پرانی عمارتیں ' سکے ' کتبے وغیرہ لیکن باوجود ان تمام نقائص اور کوتاہیوں کے اس طریقہ تحصیل کی بدولت طالب علم کو تاریخ کی تدوین کے مشکل عمل کا جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بہت قابل

قدر ہے - ایک طرف تو اسے شہادتوں اور روایتوں کے جانچنے اور پرکھنے کی عادت پڑتی ہے اور اس کی طبیعت میں احتیاط کا مادہ اور معاملات کو تولنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف (بشرطیکہ معلم صحیح طور پر رہنمائی کرے) اپنی روز مرہ کی زندگی میں مبالغے، تعصب، بےجا طرف داری اور غلط بیانی کو ترک کرکے صداقت کا احترام کرنا سیکھتا ہے جو اخلاقی سیرت کا ایک نہایت قابل قدر عنصر ہے - اس میں شک نہیں کہ مدرسے میں تاریخ کی تعلیم تمام تر اسی اصول پر نہیں ہو سکتی کیونکہ علاوہ وقت اور وسائل کے محدود ہونے کے تاریخ کے بہت سے مباحث ایسے بھی ہیں جن میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہو سکتا - لیکن مدرسہ جدید کو اپنے اصل اصول کی بنا پر اس طریقے سے اور اس قسم کے تمام فعالی طریقوں سے جو تعلیم میں جان ڈالتے ہیں حسب امکان ضرور استفادہ کرنا چاہئے - اس طرح کسی حد تک تاریخ کے مطالعے میں بھی ایک علمی اور عملی "مشغلے" کی شان پیدا ہوجائے گی اور طلبہ خود اپنی ذاتی جد و جہد اور ذہنی کاوش کے ذریعہ علم حاصل کریں گے -

اس اصول کی توضیح کے لئے ہم ایک اور درسی مضمون کو لیتے ہیں جس کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک مفید ہنر سیکھنا ہے جس کے ذریعے بچوں کو اظہار خودی کا موقع ملتا ہے اور خوشی نصیب ہوتی ہے یعنی ڈرائنگ - مدرسے میں جتنے مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں خواہ ان کا تعلق فنون لطیفہ سے ہو یا دست کاری سے، سب پر کسی قدر ترمیم کے ساتھ وہی اصول عائد ہوتے ہیں جو ہم ڈرائنگ کے ضمن میں بیان کریں گے - ڈرائنگ کی تعلیم کا مروجہ طریقہ مدارس میں یہ رہا ہے کہ پہلے بچوں کو خطوط اور خطوط کو جوڑ کر آسان شکلیں کھینچنے کی مشق

کرائی جاتی ھے ' پھر رفتہ رفتہ وہ زیادہ مشکل شکلیں بناتے ھیں - ھر قدم پر استاد کی خواھش یہ ھوتی ھے کہ وہ ایک خاص مشق کا اس قدر اعادہ کرائے کہ بچہ اس میں ماھر ھوجائے اور اس کو بغیر کسی دقت کے نہایت صفائی کے ساتھ بنا سکے - بظاھر یہ طریقہ بہت معقول معلوم ھوتا ھے اور اس مروجہ اصول کے مطابق ھے کہ تعلیم میں تدریجی ترقی اور منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاھئے - لیکن نفسیات اطفال کے اعتبار سے اس پر غور کیا جائے تو یہ سراسر غلط ھے کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ان کو ڈرائنگ سے وہ ذوق پیدا نہیں ھوتا جو ھونا چاھئے - بچوں کی تعلیم میں ڈرائنگ (اور اس قسم کے دوسرے مضامین) کی اھمیت یہ ھے کہ اس میں ان جذبات و خیالات کو اظہار کا موقع ملتا ھے اور یہ اظہار ایک مرئی اور خوش نما شکل میں ھوتا ھے - ھر بچے میں فطرت کی طرف سے تعبیر اور اظہار خودی کا جذبہ ودیعت ھوتا ھے اور مدرسے کا فرض یہ ھے کہ وہ اس جذبے کی نشو و نما اور تربیت کرے - یہ اسی صورت میں ھوسکتا ھے کہ بچے کو شروع ھی سے آزادی کے ساتھ اپنے رجحانات کے اظہار کا موقع دیا جائے - ھم دیکھتے ھیں کہ اگر بچے کو موقع ملے تو وہ کاغذ پر رنگوں یا پنسل کی مدد سے اپنے تاثرات کو ظاھر کرتا ھے - شروع میں یہ اظہار بہت غیر منتظم اور بے ڈھنگا ھوتا ھے لیکن رفتہ رفتہ اس آزاد شغل میں اس کو اپنی انگلیوں کی حرکت اور ڈرائنگ کے آلات پر زیادہ قابو حاصل ھوجاتا ھے - بر خلاف اس کے اگر ڈرائنگ کو بجائے ایک آزاد اور مسرت بخش مشغلے کے ' جس میں بچے کو اپنی اندرونی کیفیتوں کو خارجی شکل میں ظاھر کرنے کا موقع ملتا ھے ' محض بے روح تقلید اور مشق تک محدود رکھا جائے تو وہ ڈرائنگ کو ھرگز اظہار خودی کا موثر وسیلہ نہ بنا سکیں گے خواہ انھیں بعض اشیا

کی صحیح شکلیں بنانے میں پوری مہارت کیوں نہ حاصل ہوجائے - وہ اُن شکلوں کو جن کی انہیں مشق ہے بنا سکیں گے لیکن اُن میں جدت اور انفرادی ذوق کی کوئی جھلک نہیں ہوگی - وہ چیزوں کو دیکھ کر ان کی اچھی نقل اتار لیں گے لیکن ان کو اس فن سے اتنی دل چسپی اور شوق نہ ہوگا کہ وہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی اس کو اپنی فرصت کا مرغوب مشغلہ بنائیں - لہذا مدرسہ جدید ڈرائنگ کی تعلیم میں بھی انفرادی کوشش اور آزادانہ اظہار کی قدر کرتا ہے اور سب بچوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے سے احتراز کرتا ہے - بچوں کی تعلیم میں سب سے پہلے ضرورت ہے اُن کی ہمت افزائی کی ' ان کے شوق اور تجسس کے ابھارنے کی ' انہیں آزادانہ اظہار خودی کا موقع دینے کی اُن کے رجحان طبع کو ان کا رہنما بنانے کی تا کہ ان میں جو تخلیقی جذبات اور قوتیں ہیں وہ زور شور سے کام کرنے لگیں - بقول ڈاکٹر بیلارڈ (Ballard) کے چھوٹے بچوں کی تعلیم میں " کاٹ چھانٹ سے زیادہ سینچنے " کی ضرورت ہے [۱] بچوں کے طریقہ اظہار میں ضبط و نظم پیدا کرنے اور صحت عمل پر اصرار کرنے کا مناسب وقت وہ ہے جب اُن کے شوق کے پر لگ چکے ہوں اور وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنی خوشی سے رنگوں اور شکلوں کے ساتھ کھیلنا شروع کردیں اور خود ہی یہ محسوس کریں کہ اس کھیل کو زیادہ با معنی اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے معلم کی ہدایت اور اپنی قوتوں کو تربیت کرنے کی ضرورت ہے - اگر ابتدا ہی سے ہم صحت عمل کی خاطر یا وقت کی کفایت کا خیال کرکے یا نمائشی نتائج کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لئے رسمی مشق اور اعادے پر زور دینگے تو بچوں کا وہ جذبہ تخلیق افسردہ ہو کر رہ جائے گا جو ہر قسم

---

[۱] Teaching the Mother Tongue -

کے آرٹ کے لئے قوت محرکہ کا کام دیتا ہے اور انسانی شخصیت کا ایک نہایت قیمتی عنصر ہے -

ذہنی تربیت کا جو نظریہ ہم نے اس باب میں پیش کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت چند مخصوص علمی مشقوں کے ذریعے نہیں ہوسکتی - بچے کے دماغ میں ایسی متفرق اور بے ربط قوتیں نہیں ہوتیں جن کی تربیت خاص خاص مضامین کے ذریعے کی جائے - اس کی جبلتوں کو نشو و نما دینے اور ان کو مرتب کرکے ذہانت کو بیدار اور آمادہ عمل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کو مختلف علمی اور عملی مشاغل میں لگایا جائے جن کی تکمیل کے دوران میں انہیں پیچیدہ مسائل اور مشکلات سے سابقہ پڑے اور کسی مقصد کو پیش نظر رکھکر اپنی قوتوں اور وسائل و ذرائع کو منظم کرنے کی ضرورت پیش آئے -

ذہنی تربیت کے لئے ذاتی کاوش اور جد و جہد ناگزیر ہے - اگر نصاب محض منطق کے لحاظ سے مرتب کئے ہوئے سبقوں کا مجموعہ ہوگا اور طریقہ تعلیم میں تجربہ ، فعالیت اور عمل کو اہمیت نہیں دی جائے گی تو طلبہ کی دماغی تربیت ہرگز نہ ہوسکے گی - یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض غیر معمولی حافظے کی مدد سے بہت سی معلومات فراہم کرلیں اور ان میں ایک قسم کی " علمیت " کی شان نظر آنے لگے لیکن وہ ذہنی بیداری جو ان کو معاملات کے سمجھنے ، ماحول سے فائدہ اٹھانے اور اس پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے جو علم کو عمل میں تبدیل کرتی ہے اور حاصل کردہ واقفیت کا استعمال سکھاتی ہے اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک ہم مدرسے کے تمام تعلیمی کاروبار کو ان اصولوں پر از سر نو مرتب نہ کریں گے جن کی تشریح ہم نے اس باب میں کی ہے - علم کا خزانہ

جب تک عمل کے سر چشمے سے ابل کر دریائے مواج نہ بن جائے
کشت حیات کو سیراب نہیں کر سکتا - دماغ کو ربط ویابس معلومات
کا ذخیرہ بنا لینے کا نام تعلیم نہیں - بقول غالب ٭

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھہ ھی سے نہ ٹپکا ٭ تو پھر لہو کیا ھے ؟

باب چہارم

تدوین نصاب

ہم نے سابقہ ابواب میں ضمناً مسئلہ نصاب کا ذکر کیا ہے اور گذشتہ باب میں یہ بتایا ہے کہ اگر ہم درسی مضامین اور مدرسے کے دوسرے مشاغل سے طلبہ کی ذہنی تربیت کا کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں ان کے سامنے کس حیثیت سے پیش کرنا چاہئیے - اب ہم زیادہ تفصیل اور تسلسل کے ساتھہ اس امر سے بحث کریں گے کہ نصاب کے مضامین کا انتخاب اور ان کی ترتیب و تدوین کس طرح کرنی چاہئیے کہ ان سے فوائد حاصل ہو سکیں جن کی توقع ہے - یہ مسئلہ عملی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر مدرسے کے مشاغل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نصاب کی تعلیم ہی اس کا سب سے بڑا کام ہے - تعلیم کے دوسرے وسائل مثلاً استادوں کی شخصیت اور مدرسے کی عام فضا کا اثر اپنی جگہہ پر مسلم ہے لیکن سب سے زیادہ جو چیز طلبہ کے ذہن اور اخلاق کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا روزمرہ کا کام ہے جس کو وہ دن میں پانچ چھہ گھنٹہ انجام دیتے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کی تحصیل میں بھی استاد زیادہ تر نصاب کی ترتیب و تنظیم سے مدد لیتا ہے اور مدرسے کی عام فضا بھی اسی وقت تک تربیت کا وسیلہ بنتی ہے جب طلبہ شوق اور محنت سے اپنے مقررہ نصاب کو پورا کریں اور اسی کے سلسلے میں دوسرے علمی ، تفریحی اور تخلیقی مشاغل کی بنا ڈالیں - علاوہ بریں طلبہ کو اپنے کام میں اس وقت تک انہماک اور دل چسپی پیدا نہیں ہوگی جب تک

نصاب کو نفسیات اطفال کے ساتھہ هم آهنگ نه کیا جائے اور انھیں اس کے ذریعے نظام تمدن کی معرفت نه حاصل هو - اس لئے بعض لحاظ سے نصاب کا مسئلہ تعلیم کا مرکزی مسئلہ ھے - اور گذشتہ پچاس سال میں ماھرین تعلیم نے اس پر بہت توجہ صرف کی ھے - اور اس کے متعلق بہت کچھہ تحقیقات کی ھے - لیکن همارے ملک میں اب تک نصاب کی باقاعدہ تنقید اور اصلاح نہیں کی گئی اور اس میں طلبہ کی نفسی ضروریات اور تمدنی مطالبات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی نہیں هوئی - بلکہ هندوستان میں انگریزی تعلیم کے اجرا کے وقت جو نصاب تجویز هوا تھا اس میں بعض نئے مضامین کے جوڑ اور پیوند لگا دئے گئے هیں - لیکن نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلیاں هوئی هیں نه اس کی تنظیم نو کی کوشش کی گئی - لہذا هم اس باب میں ان اصولوں سے بحث کریں گے - جن کے مطابق همیں نصاب کی ترتیب و انتخاب کرنا لازم ھے -

تعلیم کے تمام مباحث ' بالخصوص مسئلہ نصاب پر مدتوں تک " نفسیات انشعابی " [۱] کا تسلط رها ھے اور جیسا هم نے گذشتہ باب میں بیان کیا ھے نفسیات کے عالم اور مدرسوں کے معلم دونوں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا دماغ مختلف ذهنی قوتوں کا مجموعہ ھے جو گویا اس کے دماغ کے مختلف گوشوں میں جاگزیں هیں اور اپنی ترتیب و تنظیم میں ایک دوسرے سے بے تعلق اور آزاد هیں - اس نظریہ کے مطابق مختلف درسی مضامین نصاب میں اس لئے داخل کئے جاتے تھے کہ وہ خاص خاص ذهنی قوتوں کی تربیت اور تکمیل کریں گویا وہ قوتیں فطرت کی طرف سے بنی بنائی موجود هیں صرف ان کو تیز کرنے ' مشق اور

---

[۱] Faculty Psychology -

استعمال کے ذریعے ان میں زیادہ مضبوطی پیدا کرنے کی ضرورت ھے - برخلاف اس کے ہم نے جو نظریہ پیش کیا ھے اس کے مطابق انسان کا نفس ایک بسیط وحدت ھے جس کی تمام قوتیں انسانی جبلتوں کی بنیاد پر تجربے یعنی فرد اور ماحول کے باھمی عمل کے ذریعے سے نشو و نما پاتی ھیں اور ایک دوسرے کے ساتھہ اس طرح مربوط ھیں کہ ھر تجربہ کا اثر دماغ کی تمام قوتوں پر پڑتا ھے اور وہ ان سب کی تشکیل میں حصہ لیتا ھے - لہذا نصاب کے مشاغل اور مضامین علحدہ علحدہ دماغی قوتوں مثلاً ادراک یا حافظے یا تخیل کو تیز نہیں کرتے بلکہ بحیثیت مجموعی ذھنی تربیت کے مسلسل عمل میں حصہ لیتے ھیں بشرطیکہ ان کی ترتیب و تنظیم مناسب اصولوں پر کی جائے اور طریقہ تعلیم ارتقائے ذھنی کے قوانین کے ساتھہ ھم آھنگ ھو - ھم یہ بھی بتا چکے ھیں کہ تمام مضامین کی تحصیل اور مشاغل کی انجام دھی میں طلبہ کو فعالی حیثیت سے شریک ھونا چاھئے کیونکہ صرف اسی صورت میں ان کی ذھانت بیدار ھوکر مصروف عمل ھوسکتی ھے - محض انفعالی طریقے پر بہت سی معلومات حاصل کر لینا اور اس کو کسی نہ کسی طرح حافظے میں محفوظ رکھنا تعلیم نہیں کہلا سکتا - یہ ممکن ھے کہ ایک شخص کو تاریخ ' جغرافیہ ' سائنس ادب وغیرہ کے متعلق بہت سی واقفیت ھو لیکن اس کا دماغ ذھنی تربیت سے عاری ھو یعنی اس نے یہ ساری معلومات ایسے بے ربط طریقے سے بغیر ذاتی جد و جہد کے حاصل کر لی ھو کہ اس سے اس کے ادراک اور احساس پر کوئی اثر نہ پڑا ھو اور وہ ان سے زندگی میں کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے -

علاوہ ذھنی تربیت کے نصاب کا دوسرا مقصد ' جس کی طرف ھم نے اوپر اشارہ کیا ھے ' یہ ھے کہ وہ طلبہ کو ان کے گرد و پیش کی

زندگی اور اس کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دے - اصل میں نصاب کا موضوع ہمارا طبیعی اور ماشرتی ماحول ھے - ہم نصاب کے مختلف عناصر اسی سے اخذ کرتے ھیں اور اِن اجزا کا گہرا مطالعہ نو عمر بچوں کو کل کائنات کے سمجھنے میں مدد دیتا ھے - اگر مدرسے کا نصاب کسی وجہ سے سمدنی زندگی سے بےتعلق ہو جائے یا ان دونوں کا باھمی رشتہ بہت کمزور ہو جائے تو مدرسے کی تعلیم بے مغز و بے روح ہو جاتی ھے - اور بجائے زندہ مسائل سے بحث کرنے کے الفاظ و علامات کے چکر میں پڑ جاتی ھے -

ہم تعلیم اور تمدن کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے اس خرابی کی طرف اشارہ کرچکے ھیں - اس کے پیدا ہونے کا سب سے زیادہ امکان نصاب کی ترتیب و تنظیم میں ھے جہاں معلموں اور مدرسوں کے لئے ہمیشہ یہ خطرہ ھے کہ اپنے اپنے خاص مضامین میں ایسے محو ہو جائیں کہ انہیں اس تعلق کا جو یہ مضامین بچوں کی فطرت اور معاشرے کی زندگی سے رکھتے ھیں، احساس ھی نہ رھے - لہذا نصاب کی بحث میں یہ یاد رکھنا ضروری ھے کہ اس کے مضامین کے انتخاب اور ان کی ترتیب دو چیزوں کی پابند ھے نفسیات اطفال کی خصوصیات اور تمدنی زندگی کی ضروریات - اس کے بعد ہم یہ سمجھہ سکیں گے کہ مدرسوں کا مروجہ نصاب کس حد تک ان معیاروں پر پورا اترتا ھے جو ہم نے ان کے لئے مقرر کئے ھیں -

ہم بتا چکے ھیں کہ مدرسہ جدید کا تعلق جماعتی زندگی سے بہت قریب کا ھے - وہ کوئی قائم بالذات ادارہ نہیں ھے جس کو گرد و پیش کی اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو - موجودہ نقطہ نظر یہ ھے کہ مدرسے کو اپنی اندرونی زندگی کی تشکیل معاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرنی چاھئے اور

ایسے مواقع بہم پہنچانے چاهئیں جن سے فائدہ اتھاکر طلبہ عمرانی مشاغل اور مقاصد کو سمجھہ سکیں اور ایک حد تک ان میں شریک هو سکیں - اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے رابطہ قائم نہیں رکھے گا تو وہ عمرانی ترقی کے لئے بیکار ثابت هوگا اور جو کچھہ علم و هنر اور استعداد طلبہ وهاں حاصل کریں گے وہ اس کی چار دیواری تک محدود رهے گی اور جب وہ اس چار دیواری سے باهر قدم رکھیں گے تو اس سے کچھہ فائدہ نہ اتھا سکیں گے - اس ضمن میں "مدرسے" کے اس جدید مفہوم کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت هے جس کو هم نے باب اول میں بیان کیا هے - کیونکہ اس کے بغیر تدوین نصاب کی موجودہ تحریکوں کو سمجھنا مشکل هوگا -

هم نے بتایا تھا کہ مدرسہ ، بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے ایک "مخصوص ماحول" هے جہاں تمام تعلیمی اثرات اور نصاب اور مشاغل کی بالارادہ تنظیم کی جاتی هے تاکہ طلبہ کی نشو و نما آزادی کے ساتھہ هو اور ان کی اخلاقی اور ذهنی تربیت کے لئے بہترین حالات اور عناصر مہیا هو سکیں - طلبہ کو "آزادی" دینے کے یہ معنی نہیں کہ معلم نگرانی اور هدایت سے بالکل دست بردار هو جائیں اور انہیں ان کی جبلتوں کے هاتھہ میں چھوڑ دیں اس امید پر کہ وہ خود بخود تمام اعلیٰ صفات اور قوتیں حاصل کرلیں گے - همارا مشاهدہ اور علم نفسیات دونوں روسو (Rousseau) کے اس خیال کی تردید کرتے هیں کہ اگر هم مدرسوں کو بچوں کی خواهشات اور ضروریات کا تابع بنا دیں تو ان کی عقل و دانش اور سیرت خود بخود صحیح طریقے پر نشو و نما پاکر پختہ هو جائے گی - روسو کا یہ عقیدہ در اصل اپنے زمانے کے معلموں کی تنگ خیالی اور سخت گیری کے

خلاف ایک رد عمل تھا - ایک طرف یہ شدت تھی کہ لوگ گناہ آدم کے عقیدے کی بدولت بچوں کو بھی فطرتاً گناہ میں آلودہ سمجھتے تھے اور ان کی نجات کے لئے ہر قسم کی تعزیر و تادیب کو ضروری جانتے تھے - دوسری طرف یہ غلو کہ ہر بچے کے اندر گویا ایک ولی اور حکیم پنہاں ہے جو پردے کو ہٹاتے ہی خود بخود ظاہر ہو جائے گا ! بہر حال تعلیم جدید ان دونوں نظریوں میں سے ایک کو تسلیم نہیں کرتی - کیونکہ اس کے نزدیک فطرت انسانی کی بنیاد ان جبلتوں پر ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں "محض امکانات عمل کی حامل ہیں خود کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں - البتہ آگے چل کر مختلف اثرات کی بدولت اچھی یا بری صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اس لئے بچوں کی صحیح تربیت اور ان جبلتوں کی مناسب نشو و نما کے لئے تعلیمی ہدایت اور نگرانی ضروری سمجھی جاتی ہے - لیکن یہ ذمہ داری جس سے ہم اخلاقی تربیت کے ذیل میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کرینگے کہ بچوں کی جبلتیں مناسب تادیب و تشویق کے ذریعے صحیح راہ پر لگائی جائیں صرف معلموں ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ مدرسے کے تمام ماحول پر جس میں نصاب طلبہ کی اجتماعی زندگی ان کا کھیل کود ، ان کے فرصت کے مشاغل ، استاد کی شخصیت وغیرہ سب شامل ہیں - اس لئے تعلیم کا سب سے بڑا عملی مسئلہ یہ ہے کہ اس " مخصوص ماحول " کی تنظیم کس طرح کی جائے کہ بچوں کی جبلتیں ان کے انفرادی نشو و نما میں بھی مدد دیں اور عمرانی مقاصد کے حصول میں بھی کام آئیں - اس ماحول کی تین خصوصیات جو پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے بیان کی ہیں نصاب کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں اس لئے اس کا مختصر سا اعادہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے - مدرسے کے ماحول میں موجودہ تہذیب و تمدن کے مشکل اور پیچیدہ عناصر زیادہ

آسان اور سادہ شکل میں طلبہ کے سامنے پیش کئے جاتے ھیں کیونکہ وہ ان کو اس تحلیل کے بغیر اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے - اس نقطہ نظر سے تدوین نصاب کا مسئلہ یہ صورت اختیار کرتا ھے کہ تمدنی زندگی کو نصاب کا موضوع مان کر اس میں سے اھم ترین مضامین مشاغل اور دل چسپ اور سبق آموز تجربات کا انتخاب کیا جائے اور انھیں نفسیات اطفال کی مناسبت سے ترتیب دی جائے تاکہ ان کے ذریعے سے طلبہ رفتہ رفتہ ان عناصر سے واقف ھو جائیں جن پر تمدن کی بنیاد رکھی گئی ھے - اگر ایسا نہ کیا جائے تو کاروبار سیاست ، آرٹ ، سائنس ، مذھب سب بیک وقت طالب علم کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں گے اور اس کا نتیجہ ایک عام انتشار کی صورت میں رو نما ھوگا - لہذا اس معاشرتی ادارے کا جسے ھم مدرسہ کہتے ھیں پہلا فرض یہ ھے کہ وہ طلبہ کے لئے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اھمیت رکھتے ھیں اور جن کو نو عمر طالب علم سمجھ سکتے ھیں - اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرتا ھے - ابتدا میں آسان چیزیں سکھاتا ھے اور ان کے مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل اور پیچیدہ امور کی تشریح کرتا ھے ' [۱]

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ھے کہ اس میں تہذیب و تمدن کے وھی عناصر منتخب کئے جاتے ھیں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ھیں - تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ سوسائٹی نسلاً بعد نسل تمام رسوم و قوانین منتقل کرتی چلی جائے بلکہ اصلاح اور ترقی کا تقاضا یہ ھے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً مفید ھیں اور مستقل اھمیت رکھتی ھیں - اور انھیں پر مدرسے میں پوری توجہ صرف کی

---

[۱] Democracy and Education صفحہ ۵۲

جائے - اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلیٰ تر معیار تمدن سے روشناس کر دیتا ھے تاکہ وہ بڑے ھو کر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں - اس خصوصیت کی تشریح ایک مثال سے ھو جائیگی- موجودہ زمانے کا نسام اقتصادی اور معاشرتی نظام مقابلے اور سابقت باھمی کی بنیاد پر قائم ھے - لوگوں میں باھمی وابستگی کے احساس سے کہیں زیادہ یہ احساس پایا جاتا ھے کہ ھر شخص کو اپنے ذاتی فائدے کی کوشش کرنی چاھئے خواہ اس کے لئے کیسے ھی قابل اعتراض ذرائع اختیار کرنے پڑیں اور اس کے نتائج دوسروں کے حق میں کتنے ھی خوفناک ھوں - بالخصوص بین الاقوامی سیاست اور تجارت میں اس اصول کی کارفرمائی اس قدر زیادہ ھے کہ اس کے خطروں کا عام لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کر سکتے - اگرچہ ھندوستان میں تجارت اور صنعت و حرفت میں اس حد تک ترقی نہیں ھوئی کہ مغرب کے ممالک کا سا مہلک مقابلہ رواج پائے لیکن معاشری زندگی میں ایک فرد دوسرے فرد سے ' ایک جماعت دوسری جماعت سے بر سر پیکار رھتی ھے اور کسی کو یہ احساس نہیں کہ ھماری اغراض میں جو اختلاف نظر آتا ھے وہ محض سطحی اور عارضی ھے ورنہ ھم سب کا حقیقی مفاد مشترک ھے - کیا مدرسے کے لئے بھی یہ لازم ھے کہ وہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو انھیں خطرناک اصولوں پر چلائے ؟ افسوس ھے کہ ملک کے حالات سے متاثر ھو کر مدرسے میں بھی طلبہ کے باھمی مقابلے کو بہت اھمیت دی گئی ھے اور استاد بجائے اسکے کہ ان کو تعاون کا شوق دلائیں ان میں رقابت اور سابقت کے جذبات کو ابھارتے ھیں - اس کے ثبوت میں مروجہ تعلیم کے بہت سے طریقے اور رجحانات پیش کئے جاسکتے ھیں مثلاً امتحانوں کو تعلیم کا منتہائے نظر بنا کر نمبروں کی پرستش کرنا ' مقابلہ میں " اول " آنے والے طلبہ کی حد سے زیادہ قدر و منزلت ' ایسے مضامین پر زور دینا جن میں علحدہ علحدہ

کام کرنا پڑتا ھے ' اُن مشاغل کی طرف سے بے پروائی جن میں مل جل کر کام کیا جا سکتا ھے - اگر تعلیم کا مقصد یہ ھے کہ وہ تمدنی خرابیوں کی اصلاح کرے اور لوگوں کے اصول عمل اور معیار نظر کو بہتر بنائے تو اس کا یہی طریقہ ھے کہ طلبہ نہ صرف ان بہتر اصولوں اور معیاروں سے نظری طور پر رو شناس کئے جائیں بلکہ انھیں ان پر عمل کرنے کا بھی موقع ملے - مندرجہ بالا مثال میں اس اصول کے معنی یہ ھوں گے کہ مدرسہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں تعاون عمل پر زور دے - نصاب میں ایسے مضامین اور طریقہ تعلیم کو داخل کرے کہ بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھہ مل جل کر کام کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا موقع ملے اور وہ تقسیم کار کے ذریعے مشکل امور کو انجام دینا سیکھیں - ان میں باھمی اتحاد اور وابستگی کا احساس مستحکم ھو اور وہ اس حقیقت کو پہچانیں کہ وہ ایک جماعت کے رکن ھیں اور اس حیثیت سے ان پر بعض اخلاقی اور معاشری فرائض عائد ھوتے ھیں - اگر وہ ان فرائض کو پورا نہ کرینگے تو عمرانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائیگا اور اس سے وہ فوائد حاصل نہ ھو سکینگے جن کی توقع ھے - اس خیال کا اثر نہ صرف طریقہ تعلیم اور مضامین کے انتخاب پر پڑیگا بلکہ ھر مضمون کی داخلی تنظیم میں اور مباحث کی ترتیب میں اسکی وجہ سے تبدیلی لازم آئیگی - کیونکہ ھمیں سائنس ' ادب ' تاریخ ' جغرافیہ علوم کے ان پہلوؤں پر زور دینا ھوگا جو انسانی زندگی کے معاشرتی رخ کی تشریح کرتے ھیں اور اپنے اپنے رنگ میں بنی نوع انسان کی متحدہ جد و جہد کا نقشہ دکھاتے ھیں - اگر نصاب کی مناسب ترتیب و انتخاب اور مدرسے کے عام مشاغل کے ذریعے بچوں میں یہ عقیدہ عملی طور پر راسخ ھو گیا کہ انسانی زندگی کا نظام امداد باھمی کے اصول پر قائم ھونا چاھئے تو ھم یہ

توقع کر سکتے ہیں کہ کچھہ عرصے کے بعد افراد اور جماعتوں کی خود غرضانہ کشمکش ایک حد تک دور ہو جائیگی -

تیسری خصوصیت مدرسے کے ماحول کی یہ ھے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب شدہ عناصر ایک خاص توازن اور ہم آھنگی کے ساتھہ مرتب کئے جاتے ھیں تاکہ تمدنی زندگی کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نو عمر بچے اور نو جوان راہ سے بھٹک نہ جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھہ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بے خبر نہ ہو جائیں - لہذا مدرسے میں فرقہ پرستی کی تنگ فضا کی جگہہ قومی روایات کا فراخ تر ماحول مہیا کرنا چاھئے اور اسے اتنی وسعت دینا چاھئے کہ اس کی حدود عالمگیر انسانی تمدن سے مل جائیں - اسطرح قوم کے افراد میں ایک ہم آھنگ اور یکساں ذھنیت پیدا ہوتی ھے - وہ ایک ھی قسم کے نصاب کا مطالعہ کرتے ھیں اور اسکی بدولت ان کے خیالات میں یک جہتی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ھے - اس فرض کا دوسرا نفسی رخ یہہ ھے کہ طلبہ کی سیرت اور طبیعت پر جو اثرات تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے کی وجہ سے پڑتے ھیں ان میں ہم آھنگی اور تنظیم پیدا کی جائے تاکہ ان کے نفس میں وحدت اور اجتماع قائم رھے - اسکی تشریح ہم پہلے کر چکے ھیں - یہاں اس کا ذکر کرنے سے ھمارا مقصد یہ ھے کہ اس سے تدوین نصاب کے ایک اھم اصول پر روشنی پڑتی ھے - ہم نصاب کو محدود اور یک طرفہ نہیں بنا سکتے - اگر اسکی وساطت سے ہم طالب علم کا تعارف تہذیب و تمدن کے مکمل نظام سے کرنا چاھتے ھیں تو نصاب میں ان تمام اقدار اور مقاصد کی نمائندگی ہونی چاھئے جو اس نظام میں مستقل اھمیت رکھتے ھیں - اگر اس میں سائنس پر حد سے زیادہ زور دیا جائے اور ادب کو نظر انداز کیا جائے یا نظری

علوم کو جگہہ دیجائے اور عملی مشاغل اور دست کاریوں کا خیال نہ رکھا جائے تو طلبہ کی تربیت ناقص اور یک طرفہ رہے گی اور وہ زندگی کے بعض اہم مسائل اور معاملات کا صحیح احساس نہ کر سکینگے - اس خصوصیت سے دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نصاب کے مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہ ہونا چاہئے ورنہ ان کے اثرات طالب علم کی طبیعت پر جدا جدا پڑکر منتشر ہو جائینگے اور اس کی مجموعی نشو و نما پر کوئی نمایاں اثر نہ ڈال سکینگے - ان کی تربیت اس خوش اسلوبی سے کرنا چاہئے کہ گو ان میں سے ہر ایک طالب علم کو تمدنی زندگی کے کسی خاص شعبے سے روشناس کرے لیکن وہ سب مل کر اسے ایک مجموعی فلسفہ زندگی کی تشکیل میں مدد دیں - اگر تعلیم انسان کو حقیقت کے مختلف پہلو دکھانے تک محدود رہے اور اسکی مکمل تصویر پیش نہ کر سکے تو گویا اس نے اپنے اعلیٰ ترین مقصد کو فراموش کر دیا -

تدوین نصاب کی تحریک نے گذشتہ تیس سال میں مغربی ممالک میں بہت اہمیت حاصل کرلی ہے اس کے متعلق مختلف ماہرین تعلیم نے اپنے اپنے نظریے پیش کئے - حال میں مدرسے کے معلموں اور ماہرین تعلیم دونوں نے نصاب کے مسئلے میں بہت تحقیق و تفتیش کی ہے جس کی وجہ سے مدارس جدید کے نصاب میں بہت کچھہ تغیر و تبدل ہوا ہے اور ہوتا جاتا ہے - امریکہ میں ہیرلڈرگ (Harold Rugg) تھارن ڈائک (Thorndike) بوبٹ (Bobbit) اور سنیڈن (Sneddon) وغیرہ کی سرکردگی میں اس کے متعلق بہت سا کام ہوا ہے - بعض مدارس نے بھی اپنے تجربات شائع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ درسی مضامین کی تقسیم و ترتیب اور ان کے موضوع میں کس قدر انقلاب ہو گیا ہے - حال ہی میں امریکہ کی ایک مقتدر تعلیمی انجمن[۱] نے تدوین نصاب کی تاریخ

[۱] National Society for the Study of Education -

اور اسکی موجودہ تحریکوں اور بنیادی اصولوں کے متعلق دو ضخیم جلدیں بطور اپنے چھبیسویں سالنامے کے شائع کی ہیں اس کتاب میں اس تمام علمی تحقیقات کا خلاصہ اور تنقید موجود ہے جو گذشتہ چالیس سال میں نصاب کے متعلق کی گئی ہے اور اس پر بحث کر کے بعض اہم نتائج اخذ کئے گئے ہیں - ان تمام نتائج کا لب لباب یہ ہے کہ معقول اور مکمل نصاب تعلیم بنانے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اسکی بنیاد طلبہ کی زندگی اور تمدنی ضروریات پر رکھی جائے تاکہ وہ انکی جبلی رجحانات کی تربیت کر سکے اور ان کو موجودہ تمدن کے سب سے اہم اور بہتر عناصر سے روشناس کرے - پروفیسر تھارن ڈائک نے (Thorndike) نے تدوین نصاب کے نو اصول بیان کئے ہیں جن میں سے زیادہ ضروری اصولوں کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں [۱] ان سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے یہاں پیش کیا ہے -

۱ — نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاہئے کہ جنکے ذریعے طلبہ میں وہ معلومات اور عادات وہ مہارت ' رجحان اور مذاق پیدا ہو جو انہیں ان کے طبیعی ماحول اور ان کی خاندانی شہری اورمعاشرتی زندگی کے مطالبات پورا کرنے میں مدد دے اور انکے جسم و دماغ میں صحت اور توازن قائم رکھے اور ان کے تفریحی ' اخلاقی ' مذہبی اور علمی وسائل کو ترقی دے - یہ وہ مرکزی معیار ہے جس پر اور تمام معیاروں کا انحصار ہے -

۲ — عام طور پر وہ معلومات اور عادات وغیرہ زیادہ قابل قدر ہوتی ہیں جو براہ راست زندگی کی کسی واقعی ضرورت کو پورا کرتی ہیں -

---

[۱] Thorndike and Gates : Elementary Principles of Education. صفحہ ۱۸۳

ان کے ضمن میں طلبہ جو کچھہ سیکھتے ھیں اس کو وہ زیادہ اچھی طرح استعمال کرسکتے ھیں -

۳—اگر اور سب باتیں یکساں ھوں تو مقابلتاً وہ علوم و فنون زیادہ قابل قدر اور تعلیمی لحاظ سے زیادہ مفید ھیں جن کے استعمال کے موقعے انسان کی زندگی میں کثرت سے پیش آئیں -

۴—نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاھئے - جو مفید اور فعالانہ عادتوں کو نشو و نما دیں - مثلاً غور و فکر کی قوت ' جدت ابپچ ' میل جول کی صلاحیت ' اعتبار وغیرہ -

۵—وہ مضامین اور مشاغل نصاب کے لئے مقابلتاً زیادہ موزوں ھیں جو نہ صرف موجودہ ضروریات کو پورا کرتے ھیں بلکہ آئندہ پیش آنے والے مسائل اور غیر متوقع حالات کے لئے بھی تیار کرتے ھیں - برخلاف اس کے جو مضامین محض ماضی کے حالات پر مشتمل ھوتے ھیں یا عارضی اور فوری مفاد اور دلچسپیوں سے تعلق رکھتے ھیں یا محض ان علمی شوقوں کو قائم رکھتے ھیں جو مدرسے کے روایتی تعلیم کا نتیجہ ھیں ۰ ان کی اھمیت بہت کم ھے -

ان اصولوں اور نصاب کے متعلق دوسری تحریکوں کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ نصاب کی ترتیب و انتخاب میں ھمیں طالب‌علم اور اُس کے ماحول کے تعلق پر غور کرنے کی ضرورت ھے اور یہ دیکھنا ھے کہ تمدنی زندگی کے مواقع سے ' جو اس تعلق کی بدولت پیدا ھوتے ھیں پوری طرح فائدہ اُٹھانے کے لئے اسے کس قسم کی معلومات اور تجربے کی ضرورت ھے - نصاب کے مسئلے کو معاشرتی زندگی سے جدا کرنا اور اسمیں محض دماغی قوتوں کی تربیت کا لحاظ رکھنا کسی طرح جائز نہیں -

صدیوں تک نصاب کی تنظیم جس غلط نفسی عقیدہ کی بنا پر ہوتی رہی ہے اس کی تردید ہم اوپر کرچکے ہیں - نصاب کے لئے مضامین کا انتخاب اس اصول پر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دماغ کی مختلف ' مستقل اور غیر مربوط قوتوں کی تربیت کرتے ہیں - مثلاً یہ کہ ریاضی کے ذریعہ قوت استدلال کی تربیت ' سائنس کے ذریعے قوت مشاہدہ کی ' ادب قدیم کے ذریعے قوت تنقید ' تخیل اور ذوق حسن کی - موجودہ علم نفسیات سرے سے اسی کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کے ذہن میں اس طرح کی مستقل اور قائم بالذات قوتیں موجود ہیں جن کی نشو و نما خاص مضامین کے ذریعے کی جاتی ہے - اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ طلبا کی فطری اور ابتدائی صلاحیتوں کی نشو و نما کرکے ان کو دماغی قوتوں میں تبدیل کرنے کے لئے انہیں ایسے مشاغل میں شریک کرنا چاہئے جن کو انجام دینے میں استدلال ' مشاہدہ تخیل وغیرہ سبھی چیزوں کی ضرورت پڑے اور وہ اپنی خواہش اور جبلت کے تقاضے سے مجبور ہو کر ان سے کام لیں - لہذا مدرسہ جدید میں درسی مضامین اور مشاغل دونوں کو اس اصول پر منتخب کرنا چاہئے کہ ان کے واسطے سے طلبا کو انسانی زندگی اور کار و بار کے مختلف شعبوں کو غور سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے - وہ اپنی قوت مشاہدہ سے کام لیں ' چیزیں بنائیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تدبیریں سوچیں اور ان کو آزما کر دیکھیں کہ وہ کامیاب ہوتی ہیں یا نہیں - اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق بہت کچھ طریقہ تعلیم سے ہے لیکن جب تک نصاب ایسا نہ ہو جسمیں ان تجربوں اور کاموں کا موقع مل سکے طریقہ تعلیم بجائے خود کافی ہیں - موجودہ زمانے میں دست کاری کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی مختلف شکلوں میں ان تمام تجربات کو حاصل کرنے کا امکان ہے اور اس کے

ذریعے بچوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی تربیت ہوسکتی ہے - بسرطیکہ اسے صحیح اصولوں پر مدرسے میں رائج کیا جائے اور اس کا مقصد تنگ اور محدود نہ ہو بلکہ وہ طلبہ کی پوری شخصیت کو دعوت عمل دیتی ہو -

کچھہ عرصہ سے نصاب میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ زیادہ تر زمانۂ حال کی تمدنی ترقی اور انقلابات کا نتیجہ ہیں - مدرسوں کا شمار بالعموم قدامت پسند اداروں میں ہوتا ہے یعنی وہ حتی الامکان اُن طریقوں میں جو پہلے سے چلے آتے ہیں کسی قسم کا تغیر پسند نہیں کرتے - اس لئے وہ بالعموم معاشرتی زندگی کے ساتھہ ساتھہ نہیں چل سکتے بلکہ پیچھے رہ جاتے ہیں - لیکن جب ضروریات زمانہ انہیں بالکل مجبور کردیتی ہیں تو وہ بے دلی سے رفتہ رفتہ ، اپنے نصاب اور نظم و نسق میں تبدیلیاں کرتے ہیں - اس کی تشریح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے - گذشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک کی صنعت و حرفت میں ایک زبردست انقلاب ہوا ہے جس نے انسانی معیشت کے قدیم نظام کو درہم برہم کرکے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے - جیسا ہم ایک گذشتہ باب میں تفصیل کے ساتھہ بیان کرچکے ہیں اس نظام کا دار و مدار زیادہ تر سائنس کی تحقیقات اور ایجادات پر ہے - یہاں تک کہ اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے میں سائنس کو دخل ہو گیا ہے - کوئی شخص جو سائنس کی کم از کم ابتدائی اور ضروری باتوں سے واقف نہیں اپنے موجودہ ماحول کو نہ پوری طرح سمجھہ سکتا ہے نہ کامیابی کے ساتھہ اسمیں حصہ لے سکتا ہے - لہذا مدرسوں کے لئے یہ لازم ہوگیا کہ وہ اپنے نصاب میں سائنس کو نمایاں اہمیت دیں تاکہ طلبہ شہریت کے نئے فرائض کو اچھی طرح ادا کرسکیں - لیکن اس وقت تقریباً تمام ملکوں میں ، بالخصوص انگلستان میں ، روم

اور یونان کا علم و ادب مدرسوں کی تعلیم پر حاوی تھا - علوم قدیمہ کے حامیوں کا دعویٰ تھا کہ ذہنی تہذیب و تربیت کا کوئی ذریعہ ان کے سوا ہو ہی نہیں سکتا - برخلاف اس کے وہ لوگ جو جدید اقتصادی اور صنعتی تحریکوں سے متاثر ہو چکے تھے سائنس کی اہمیت پر زور دیتے تھے - ان کا دعویٰ تھا کہ نہ صرف افادی نقطہ نظر سے اس کو نصاب میں داخل کرنا ناگزیر ہے بلکہ اس کے بغیر اہم ترین دماغی قوتوں کی نشوونما ناممکن ہے - چنانچہ اُنیسویں صدی کا بیشتر حصہ اِنگلستان کی تعلیمی تاریخ میں جدید سائنس اور قدیم (یونانی اور رومی) علم و ادب کے درمیان جنگ کا زمانہ تھا جس میں سائنس کا سب سے بڑا اور سب سے ممتاز مددگار ہربرٹ سپنسر تھا - جب رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو وہ حصہ مل گیا جس کی مستحق تھی اور اس کے طریقہ تعلیم میں اصلاح ہو گئی تو معلموں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ سائنس کی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں کہ تمام صنعت و حرفت اور اکثر پیشوں کا دارومدار اس پر ہے بلکہ وہ دماغی تربیت اور تہذیب نفس کا بھی ایک نہایت موثر اور قابل قدر وسیلہ ہے - لہذا اب نصاب میں سائنس محض اس بنا پر داخل نہیں کی جاتی کہ اس سے مثلاً قوت مشاہدہ کی تربیت ہوتی ہے بلکہ اس کا خاص وصف یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ہم زندگی کے نظم اور ربط کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور اس میں عمدگی اور قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں - اسی طرح نصاب تعلیم پر ان سیاسی تغیرات اور انقلابات کا اثر بھی پڑا جن کی بدولت قومی ریاستیں اور جمہوری حکومتیں وجود میں آئیں ' سیاسی اختیارات ایک محدود طبقے کے ہاتھ سے نکل کر رفتہ رفتہ قوم کے تمام افراد کو

حاصل ہوئے اور معاشرتی فرقہ بندیوں کے ٹوٹنے سے لوگوں میں باہمی یک جہتی کا احساس پیدا ہوا - اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جو پہلے چند خاص طبقوں تک محدود تھی باقی طبقوں میں پھیلنی شروع ہوئی اور حکومت نے یہ تسلیم کرلیا کہ کم از کم ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ہر آزاد شہری کا حق ہے - جب تک تعلیم خوش حال اشراف کے لئے مخصوص رہی جن کے فرائض میں حصول معاش ' محنت اور مزدوری ' کاشتکاری ' صنعت و حرفت کے مشاغل شامل نہ تھے اور جو زیادہ تر علمی اور ادبی تفریح اور ایک قسم کی سطحی تہذیب کی خاطر تعلیم حاصل کرتے تھے نصاب تعلیم کا قدیم علوم و ادب تک محدود ہونا سمجھ میں آسکتا تھا - اول تو اس وقت تک واقعی یونانی اور رومی زبانوں ھی علم و تہذیب کے بہترین عناصر کی حامل تھیں اور دوسری زبانوں میں علوم کا اتنا سرمایا نہ تھا - جدید علوم یعنی سائنس ' اقتصادیات ' معاشیات وغیرہ ابتدائی حالت میں تھے اور ان کی تعلیمی قدروقیمت قدیم علوم کے مقابلے میں بہت کم تھی - دوسرے یہ محدود نصاب جس میں گہرائی زیادہ اور وسعت کم تھی اس جماعت کی ضروریات کو بڑی حد تک پورا کرتا تھا جس کے لئے وہ مرتب کیا گیا تھا - لیکن اب جب کہ تعلیم نے امیر اور غریب بیکار اور مشغول ' علمی اور عملی ہر قسم کے لوگوں کو اپنے وسیع دامن میں لے لیا ھے ہم کسی طرح اس محدود نصاب کو کافی نہیں سمجھ سکتے - لوگوں کی ضروریات مختلف اور متنوع ھیں - ان کے طبائع میں فرق ھے موجودہ زمانے کی ضروریات بدل گئی ھیں - قدیم علوم کی اھمیت اپنی جگہ مسلم ھے لیکن جدید علوم زندگی کے مسائل حاضرہ سے بہت زیادہ قریبی تعلق رکھتے ھیں - آج کل حصول معاش کا مسئلہ اور مختلف تمدنی اور معاشری روایات رکھنے والے

فرقوں کو ایک قومی شیرازے میں منسلک کرنے کا سوال یہ دونوں چیزیں غیر معمولی اهمیت رکھتی هیں - ان حالات میں نوخیز نسلوں کی تعلیم کے لئے نہ علوم قدیم کافی هیں نہ ریاضی ' تاریخ ' جغرافیہ وغیرہ کا سطحی اور رسمی مطالعہ - ضرورت اس بات کی ھے کہ ایک همہ گیر نصاب کی وساطت سے طلبہ زمانہ حال کی تمدنی زندگی سمجھیں اور ان میں تمدنی احساس پیدا هو - وہ فرد اور جماعت کے صحیح تعلق کو نہ صرف نظری طور پر سمجھیں بلکہ عملاً بحیثیت ایک جماعت کے رکن کے وہ اپنے حقوق و فرائض سے واقف هوں اور ان کو ادا کرنا سیکھیں - اسی وجہ سے تاریخ اور جغرافیہ کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں وہ تبدیلیاں هو رهی هیں جن کا هم نے اوپر ذکر کیا هے اور خود معلم کا نقطہ نظران کے متعلق بدل گیا هے - اس کی کوشش هے کہ طلبہ کو معلوم هو کہ نوع انسان نے کس طرح متحدہ طور پر جدوجہد کر کے دنیا کے تمام ذرائع اور وسائل سے کام لیا هے اور کس طرح هر نئی نسل پرانی نسلوں کے کار ناموں اور علمی اور عملی ذخیروں سے فائدہ اتھاتی ھے - اس طرح طلبہ دنیا کے تمام لوگوں کی باهمی وابستگی کو محسوس کرتے هیں اور ماضی حال اور مستقبل کے ربط و تسلسل کا اندازہ کرسکتے هیں - تاریخ کے ذریعے یہ احساس بالواسطہ پیدا هوتا هے - اس کو مستحکم کرنے کے لئے بعض ثانوی مدارس میں درسی اور عملی طور پر مدنیات کی تعلیم دی جاتی هے - یعنی ایک طرف تو مدنی اور سیاسی زندگی کے نظام اور اس کے حقوق و فرائض کی تشریح کی جاتی هے اور دوسری طرف طلبہ کو عام تقریبوں ' جلسوں ' تہواروں اور مدنی کاروبار مثلاً حفظان صحت ' صفائی ' تعلیمی پروپگنڈا وغیرہ میں شرکت کا موقعہ دیا جاتا هے - مدرسے کی داخلی تنظیم حکومت خود اختیاری کے نمونے پر کی جاتی هے اور طلبہ میں

فرائض اور ذمہ داریاں تقسیم کردی جاتی ہیں - اس طرح طلبہ کو اپنے روز مرہ کے کام میں انہیں اصولوں پر عمل کرنا سکھایا جاتا ہے جو معاشرتی زندگی میں کار فرما ہیں - ان مخصوص انتظامات کے علاوہ مدارس جدید میں تمام درسی مضامین کی تعلیم میں یہ خیال پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ طلبہ معاشرے کے نظام اور انسانوں کے باہمی تعلقات کو سمجھیں ' انہیں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کا موقع ملے اور وہ اس جمہوری اور تمدنی زندگی میں بطور مفید اور مستعد اراکین کے شریک ہو سکیں جس کی تشکیل جدید سیاسی اور صنعتی اثرات کے ماتحت ہو رہی ہے -

اب ہم بحیثیت مجموعی نصاب کی تنظیم کے مسئلے پر نظر ڈال سکتے ہیں - نصاب کے مضامین کا انتخاب تمدنی زندگی کی ضروریات اور مطالبات کو مدنظر رکھ کر کرنا چاہئے ان کی ترتیب اور تعلیم میں بچوں کی نفسیاتی نشوونما اور قوانین کو اپنا راہبر بنانا اور ان سے اس طرح کام لینا چاہئے کہ طلبہ نہ صرف مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کرکے بیٹھ رہیں بلکہ ان میں نئے مسائل اور معاملات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ مستعدی کے ساتھ زندگی کے کار و بار میں حصہ لیں - مدرسوں کا قدیم نصاب جن حالات میں مرتب ہوا تھا وہ اب تبدیل ہوچکے ہیں - یورپ میں یونانی اور لاطینی علم و ادب کا دور دورا تھا - ہندوستان میں سنسکرت ' فارسی اور عربی زبانیں تہذیب اور تعلیم کا سرچشمہ تھیں - تہذیب کا مفہوم بجائے خود محدود اور یکطرفہ تھا - اسی میں ان تمام مشاغل کو کوئی جگہ نہ دی جاتی تھی جن کا تعلق انسان کی مادی ضروریات کے پورا کرنے سے ہے - لیکن اب نئے علوم ' نئی زبانیں ' نئے سیاسی اور معاشرتی حالات پیدا

ہوگئے ہیں - تہذیب کا مفہوم وسیع ہو گیا ہے اور اس کو اور زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کے لئے موزوں ہو - لہذا ضرورت یہ محسوس ہوئی ہے کہ نصاب میں نئے مضامین کو داخل کیا جائے ' اس کے نیم مردہ قالب میں نئی روح پھونکی جائے تاکہ وہ جدید تمدن کے راستوں میں طلبہ کی رہبری کر سکے - اس تحریک نے جس کو توسیع نصاب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے دو شکلیں اختیار کیں اول تو بعض قدیم مضامین کو ترک کر کے یا ان کے نصاب کو کم کر کے جدید علوم و فنون کو مدرسوں میں جگہ دی گئی - اس کی مثالیں ہم نے اوپر دی ہیں مغرب میں یونانی اور لاطینی زبانوں اور ہندوستان میں عربی فارسی ' سنسکرت کا بوجھ ہلکا کیا گیا اور نصاب میں دیسی زبانیں سائینس ' تاریخ ' جغرافیہ ' دست کاری ' امور خانہ داری وغیرہ شامل کرلئے گئے - ان مضامین کی وجہ سے نصاب نہ صرف زیادہ 'مفید' بن گیا بلکہ اس میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوگئی اور اس کے دائرے میں تمدنی زندگی کے جدید شعبے بھی آگئے جن کو قدیم نصاب نظر انداز کرتا تھا - لیکن نصاب میں محض چند مضامین کے اضافے سے کوئی دائمدار تعلیمی اصلاح نہیں ہوسکتی تھی - اصلاح نصاب کی تحریک کا دوسرا رخ قدیم اور جدید دونوں طرح کے مضامین کی داخلی ترتیب اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہے - یعنی ماہرین تعلیم کی توجہ اس طرف راجع ہوئی کہ ان تمام مضامین کا از سرنو جائزہ لیا جائے اور اس میں جس قدر غیر ضروری اور غیر مفید مباحث شامل ہو گئے ہیں ان کو خارج کر کے ایسے مباحث داخل کئے جائیں جو مستقل اور دائمی اہمیت رکھتے ہیں یا جن کا موجودہ تمدن سے لازمی تعلق ہے - نصاب تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ یہی مشکل پیش آتی ہے کہ جب وہ بہت عرصے تک رائج رہتا ہے اور اس

پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تو اس میں بہت سی فضول چیزیں شامل ہوجاتی ہیں - چنانچہ یہی صورت مغربی تعلیم کے نصاب کو پیش آئی - اس میں تاریخ ، جغرافیہ ، ریاضی وغیرہ داخل تو ہوگئے لیکن تاریخ خشک اور بے ربط واقعات اور ناموں اور سنوں کے مجموعے کا نام تھا جن کو یاد کرنے سے نہ ذہنی تربیت ہو سکتی تھی نہ ماضی کی تعبیر ، نہ حال کی تفسیر ، نہ مستقبل کے لئے تیاری - جغرافیہ بھی علیٰ ہذاالقیاس دریاؤں اور پہاڑوں اور شہروں اور آبادیوں وغیرہ کے متعلق بے شمار غیر ضروری معلومات سے بھرا پڑا تھا - اس کے مطالعے سے نہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا تعلق سمجھ میں آتا تھا نہ علت اور معلول کے اس سلسلے پر روشنی پڑتی تھی جس میں کائنات کے تمام مظاہر جکڑے ہوئے ہیں - ریاضی کے تمام مضامین یعنی ہندسہ ، جبر و مقابلہ حساب وغیرہ بالعموم اس غرض سے پڑھائے جاتے تھے کہ ان سے قوت استدلال کو ترقی ہو اور مجرد نظریات اور مسائل کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو - اس لئے اس کے مباحث زندگی کے واقعی امور اور معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ اکثر طلبہ کے سامنے ایسے سوالات پیش کئے جاتے تھے جن کے مفروضات کسی طرح عقل میں نہیں آتے تھے - اسی طرح سائینس بھی ابتدا میں ایک نظری علم بنا دی گئی تھی جس میں طلبہ کو اصطلاحوں کی تعریفیں ، اشیا کے خواص اور قوانین فطرت کے ضابطے یاد کرائے جاتے تھے - ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور زندگی کا تعلق جو تعلیم کی جان ہے قطع ہو گیا - لہذا مصلحین تعلیم نے کوشش کی کہ تمام درسی علوم کے متعلق یہ دریافت کریں کہ تمدنی زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے کیا چیزیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور کیا چیزیں ایسی ہیں جو محض رسماً اور روایتاً چلی

آتی هیں - اس کے لئے مختلف طریقے اختیار دئے گئے - بعض لوگوں نے تمدنی ضروریات کا تجزیہ کیا اور ہر مضمون کے بس اتنے مسائل جتنے ان ضروریات کے لحاظ سے ناگریر تھے منتخب کرلئے - بعض نے زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھا ' بالخصوص امریکہ والوں نے - یعنی نصاب کے متعلق بہت سے سوالات تیار کر کے معلموں ' بچوں کے والدین ' کارخانوں کے مالکوں ' سرکاری حکام وغیرہ کے پاس بھیجے گئے اور ان کے جوابوں کا مطالعہ کرکے نتائج نکالے گئے - بعض نے اپنے اپنے مدرسوں میں طلبہ کے شوق اور ان کی پسند کو اپنا راهبر بنایا اور یہ دیکھا کہ کون سے مباحث اور موضوع ایسے هیں جو ان کی زندگی کے ساتھہ ربط رکھتے هیں - اور جن میں ان کا دل خود بخود لگتا ھے - اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات کوششیں مناسب حدود سے آگے نکل جاتی تھیں اور ایک آزمائشی طریقے کو لوگ حکمی اور قطعی سمجھنے لگتے هیں - لیکن ان کا مجموعی نتیجہ یہ هوا کہ تمام درسی مضامین میں بہت مفید ترمیم و تنسیخ هوئی اور هوتی جارهی ھے - بعض مدارس جدید نے کئی سال تک تجربے کرنے کے بعد اپنے نصاب شائع کئے هیں - ان کے مطالعے سے معلوم هوتا ھے کہ اس میدان میں بہت کچھہ کام هوچکا ھے اور وہ نظری بحث کرنے والوں نے نہیں بلکہ زیادہ تر اُن لوگوں نے کیا ھے جو خود معلمی کرتے هیں انہوں نے سب مضامین میں اس قدر تبدیلیاں کی هیں کہ گویا ان کی قلب ماهیت کردی ھے - اس کے لئے خاص طور پر ونتکا (Winnetka) کے نصاب کا مطالعہ کرنا چاهئے جو پروفیسر رگ (Rugg) کی نگرانی میں تیار هوا ھے کیونکہ وہ دوسرے نصابوں کی طرح محض ایک اسکول میں جہاں کے حالات غیر معمولی طور پر ساز گار هوں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ ایک پوری ریاست کے تمام مدارس میں جاری ھے -

نصاب جدید میں تاریخ ' جغرافیہ ' سائنس ' ادب وغیرہ غرض
ہر مضمون میں زندہ مباحث شامل کئے گئے ہیں یعنی وہ چیزیں جو
ایک طرف بچوں کی دل جسپی اور شوق کو ابھارتی ہیں اور دوسری طرف
تمدنی زندگی کے مسائل حاضرہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہیں - تاریخ
ارتقائے انسانی کی تعبیر ہے جو بچوں کے تجسس پسند دماغ کو وہ
زبردست ڈراما دکھاتی ہے جس کا ہیرو انسان ہے اور سٹیج عالم فطرت
اور جس کا ہر ایکٹ اس کی تہذیب و ترقی کے کسی دور کا نقشہ دکھاتا
ہے - جغرافیہ بے ربط واقعات اور معلومات کا مجموعہ نہیں رہا - اس
کا کام اب یہ ہے کہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا عمل اور رد عمل
دکھائے اور بچوں کو ایک طرف تو یہ احساس دلائے کہ انسان اور فطرت
قوانین طبیعی کے ذریعے سے ایک دوسرے کے ساتھہ وابستہ ہیں اور
دوسری طرف یہ دکھلائے کہ انسان نے انفرادی اور اجتماعی کوشش کے
ذریعے کس طرح رفتہ رفتہ ان قوانین کو سمجھہ کر اور ان سے کام لیکر عالم
فطرت کو مسخر کر لیا ہے اور صنعت و حرفت اور کاشتکاری کا یہ زبردست
نظام قائم کیا ہے - جغرافیہ بحیثیت ایک انسانی علم کے اور بحیثیت ایک
سائنس کے یہ فرائض انجام دیتا ہے - عمرانی علوم اور سائنس دونوں اپنی
جگہہ پر اس مقصد کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں طلبہ
کی نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور انہیں یہ دکھاتے ہیں کہ لوگ
کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں کن حالات اور قوانین کے ماتحت
اپنے کار و بار چلاتے ہیں اور ہر شخص کی بھلائی برائی ' کامیابی اور ناکامی
کس طرح اور کس حد تک دوسروں پر منحصر ہے - طریقہ تعلیم اور
مواد تعلیم دونوں کی نفسیاتی تنظیم کرنے اور انہیں موجودہ جمہوری
معاشرے کے لئے موزوں بنانے کی غرض سے اسی اصول پر عمل کرنے کی

ضرورت ہے - سائنس کا نصاب اس لحاظ سے بھی معین کیا جاسکتا ہے اور اکثر اسی خیال سے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے طلبہ کو کچھ واقعات اور حقائق معلوم ہو جائیں اور وہ سائنس کے مخصوص طریقۂ عمل سے روشناس ہوجائیں - لیکن اس کا ایک دوسرا اور اہم تر مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں میں معاشری احساس اور نظر پیدا کرے جس کے ذریعے سے ان میں تمدنی زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو - اس لئے کہ موجودہ معاشرت اور تمدن کے اصول سائنس سے ماخوذ ہیں اور ن کو سمجھانے کے لئے ہمیں مدرسے میں سائنس ہی سے کام لینا پڑے گا اور اس کی تعلیم کو اس طرح مرتب کرنا ہوگا کہ ہمارے طلبہ ان نئے معاشرتی مسائل سے جو سائنس کی ترقی کا نتیجہ ہیں عہدہ برآ ہو سکیں - پروفیسر بوڈ (Bode) سائنس کے امکانات اور اس کے تعلیمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سائنس نے ہمارے روز مرہ کے ماحول کو بالکل بدل دیا ہے - اگر ہم غور کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس تبدیلی کی وسعت کا صحیح اندازہ ہوگا.........سائنس کی ایجادات مثلاً آلات حرب مبادلہ خیالات کے ذرائع ' وسائل نقل و حمل ' مشینوں کی صنعت و حرفت وغیرہ کی بدولت معاشری نظام کے جدید نمونے قائم ہوگئے ہیں - مختلف طرح سے لوگوں میں باہمی وابستگی کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں جن کی وجہ سے باہمی مفاہمت اور اتحاد عمل کا دائرہ وسیع تر ہوگیا - اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سائنس ہی نے ہمیں یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ کائنات پر قوانین قدرت کا

تسلط ہے اس لئے ہمیں اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی تنظیم نئے سرے سے کرنا چاہئے - معاشری نظر سے ہماری یہی مراد ہے کہ اگر ایک ہوشیار اور عقل مند معلم سائنس پڑھائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ کے دل میں انسانوں کا احترام بحیثیت انسان ہونے کے راسخ ہو جائیگا اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں - اس مقصد کے لئے معلم اس اصول کو اپنا رہبر بنائے گا کہ انسان اپنے ماحول کا مالک ہے اور وہ ایک ایسی دنیا تعمیر کر سکتا ہے جس میں نہ افلاس ہوگا ' نہ جہالت ' نہ مرض ' نہ بے انصافی - مختصر یہ کہ ہر مضمون کے ذریعے سے جس کو نصاب میں جگہہ دی جائے وہ طرز خیال پیدا کرنا چاہئے جو انسانوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ماحول کی تعمیر جاری رکھیں اور اپنے لئے ایسے معیار عمل بناتے رہیں جو احترام انسانیت یعنی جمہوریت کے ساتھہ ہم آہنگ ہوں " [۱]

ہمارے ہندوستانی مدارس میں سائنس کی تعلیم اس قدر ابتدائی اور ناقص حالت میں ہے کہ اس سے نہ وہ محدود علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں جو عام طور پر استادوں کو مرغوب ہیں ' نہ وہ وسیع تر معاشری اغراض جن کی تشریح بوڈ (Bode) نے اپنی کتاب میں جا بجا کی ہے - یوں تو ہمارے تمام درسی مضامین میں اصلاح اور ترتیب جدید کی ضرورت ہے لیکن تاریخ اور سائنس کا نصاب تو ایک سرے سے بدلنا ہے کیونکہ انہیں دونوں مضامین کے ذریعے ہم ہندوستانیوں میں اجتماعی

---

[۱] Bode ; Modern Educational Theories صفحہ ۲۰

احساس کو مستحکم کرسکتے ھیں اور فرقہ دارانہ تعصبات کو مٹا کر ان کی جگہہ قومیت کا جذبہ پیدا کر سکتے ھیں - بعض خاص سیاسی حالات میں مثلاً جب ایک ملک کے لوگ کسی غیر قوم کے محکوم ھوں اور اس کے جبر و تشدد سے عاجز آجائیں تو قومی اتحاد اور وطنیت کا جوش جذبہ منافرت یا جذبۂ انتقام کي وجہ سے بھي پیدا ھو جاتا ھے لیکن وہ عارضی ھوتا ھے - ان وقتی اثرات کے دور ھوتے ھي باھمي اختلافات پھر عود کر آتے ھیں اور اتحاد مفقود ھو جاتا ھے کیونکہ اس کی بنیاد کسی مضبوط عقیدے پر نہیں ھوتی - اگر ھم کسی ملک کے افراد میں اغراض و مقاصد کا مستقل اتحاد اور باھمي ھمدردی کا پائدار جذبہ پیدا کرنا چاھتے ھیں تو اس کی تدبیر یہ ھے کہ ھم مدرسے کی چار دیواري میں نو عمر بچوں اور نوجوانوں پر اثر ڈالیں تاکہ وہ وھاں سے قومی اتحاد کے پکے رنگ میں رنگے ھوئے نکلیں - اس میں تاریخ کا کام یہ ھے کہ وہ انھیں رفتہ رفتہ لیکن نہایت موثر طریقے سے یہ محسوس کرا دے کہ ھر قسم کی ترقی کے لئے ' تمام بڑے بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے ' ھر زمانے میں اشتراک عمل کی ضرورت رھی ھے اور وہ تمام جنگ و جدل کے واقعات ' بادشاھوں کي لڑائیاں ' جماعتوں کے اختلافات ' جن کي داستانوں سے مروجہ درسی کتب بھری پڑی ھیں سطحی چیزیں ھیں - ان کی مثال طوفانوں کی سی ھے یہ آتے ھیں اور چلے جاتے ھیں مگر اصل چیز جو دریا یا سمندر کي ھستی کو قائم رکھتی ھے وہ اتصال یا کشش ھے جو ناچیز قطروں کے مجموعے کو ایک بحر ذخار ایک غیر محدود قوت کا خزانہ بنا دیتی ھے - ان سیاسی مخالفتوں کي تہہ میں وہ اتحاد عمل پوشیدہ ھے جس کی بدولت معاشرتی زندگی قائم ھے جس کی وجہ سے زراعت صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے سارے کام چلتے رھے ھیں اور چلتے رھیں گے - اس

مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں تاریخ کے اقتصادی ، معاشرتی اور عقلی پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت ہے - اسی طرح ہمارے موجودہ قومی حالات میں سائنس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے - اس کی صحیح تعلیم کے ذریعے ہم نہ صرف اس باہمی وابستگی کی تشریح اور تفسیر ایک دوسرے نقطہ نظر سے کر سکتے ہیں بلکہ طلبہ میں وہ علمی طرز خیال پیدا کرسکتے ہیں جس کی ہماری قوم میں بہت کمی ہے - لوگوں کے جوش ، حوصلے اور امنگ کو ابھارنے کے لئے انہیں تقدیر پرستی کے بجائے فلسفہ عمل کی تلقین کرنے کے لئے ، ان کی خوابیدہ قوت تسخیر کو بیدار کرنے کے لئے ان تک سائنس کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے - دوسری قوموں نے سائنس کے ذریعے نہ صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلیا ہے بلکہ ملکوں اور قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا ہے - برخلاف اس کے ہم اپنی غفلت اور جمود اور سائنس کی طرف سے بے پروا ہونے کی وجہ سے اپنی قدیم حیثیت کو بھی کھو بیٹھے ہیں - اس حالت کو بدلنے میں سائنس بہت مدد دے سکتی ہے - بے شک اس کا تعلق قومی سیرت کی تشکیل سے ہے جو ایک مشکل اور وسیع مسئلہ ہے جس سے ہم کتاب کے تیسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے - لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس عظیم الشان کام کی بنیاد مدرسے ہی میں ڈالی جاسکتی ہے اور اس میں علاوہ اور چیزوں کے ، نصاب کو خصوصاً سائنس کے نصاب کو بہت بڑا دخل ہے - اس کا مروجہ نصاب جو متفرق مباحث کے متعلق بالکل سطحی اور سر سری واقفیت تک محدود ہے اس مقصد کو پورا نہیں کرتا - اس میں عملی پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ میں فعالیت اور کار کردگی کی نشو و نما ہو - اس کے انسانی پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا

چاهئے تاکہ سائنس محض مجرد تصورات اور نظریوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی جد و جہد کا نتیجہ سمجھی جائے - اس مقصد کے لئے سائنس کے بڑے بڑے محققوں اور موجدوں کی سوانح عمری کا مطالعہ مفید ہے تاکہ طلبہ کو معلوم ہو کہ انہوں نے کس قدر مشکلات کا مقابلہ کیا کس طرح طلب میں صادق رہے اور اپنی تحقیقات سے دنیا کو مالا مال کرگئے - اور وہ یہ بھی سمجھہ لیں کہ ان میں سے ہر ایک کی کامیابی ان بے شمار معروف اور غیر معروف کام کرنے والوں پر موقوف تھی جو ان سے پہلے اس میدان عمل میں جد و جہد کرچکے تھے - تیسری چیز جس کو سائنس کے نصاب کا جزو بنانا چاهئے یہ ہے کہ اس سے عمرانی زندگی میں کیا کام لیا جاتا ہے یعنی طلبہ کو اس کا موقعہ ملنا چاهئے کہ سائنس کے اصولوں کا استعمال روز مرہ کے کار و بار میں دیکھیں - وہ اپنے مدرسے کے معمل میں ایک محدود پیمانے پر سائنس کے قوانین اور اصولوں کے استعمال کو دیکھہ سکتے ہیں لیکن یہ کافی نہیں - انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاهئے کہ ان قوانین کو انسان نے کس طرح بہت بڑے پیمانے پر اپنے مادی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے - اس لئے جہاں کہیں موقع ہو انہیں بڑے بڑے کارخانوں اور مشینوں کا اور روز مرہ کی زندگی میں سائنس کے کرشموں کا مشاهدہ کرانا چاهئے تاکہ ان کی نظر میں وسعت پیدا ہو اور وہ سائنس کے غیر محدود عملی امکانات سے روشناس ہوں - ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ سائنس کو ایک ایسا علم سمجھینگے جو کتابوں تک یا مدرسے کے معمل اور اس کے چھوتے چھوتے آلات تک محدود ہے - بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے طلبہ میں سے اکثر کے ذہن میں سائنس کا یہی غلط اور محدود تصور ہے- اگر سائنس کے نصاب کو مجوزہ اصولوں پر مرتب کیا جائے تو اس سے یقیناً طلبہ کے

علم اور واقفیت میں مزید اضافہ ' ہوگا اور وہ موجودہ نظام تمدن کو جو بڑی حد تک سائنس کے اشاروں پر چلتا ہے زیادہ اچھی طرح سمجھہ سکینگے اور اس کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہوکر زیادہ کامیابی حاصل کرینگے - یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ خواہ تاریخ کی تعلیم ہو یا سائنس کی یا کسی اور مضمون کی ' اخلاقی مقاصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ وہ ہر وقت طلبہ کے پیش نظر رکھے جائیں اور ان کی جا و بیجا تلقین کی جائے - ایسا کرنے سے طلبہ میں بد دلی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے - پائدار نتائج صرف اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب معلم خود تو ان مقاصد کو پیش نظر رکھے مگر طلبہ کو اس بات کا احساس نہ ہونے دے کہ ان کی اخلاقی تعلیم ہو رہی ہے - اخلاقی تلقین اور تبلیغ سے زیادہ موثر وہ بالواسطہ تربیت ہے جو معلم اپنی اثر آفرینی ' اپنے طریقہ تعلیم اور نصاب کی مناسب تدوین کے ذریعے دیتا ہے -

نصاب میں ایک طرف یہ علوم شامل ہیں جن کے ذریعے سے بچے تمدنی زندگی کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں اور مفید معلومات حاصل کرتے ہیں - دوسری طرف اس میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو علم سے زیادہ تربیت ذوق سے تعلق رکھتے ہیں اس میں ادب ' فنون لطیفہ یعنی موسیقی ' مصوری ' ڈرائنگ وغیرہ اور دست کاری شامل ہیں - تحصیل علم اور تربیت ذوق کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کیونکہ ایک حد تک انسان کی شخصیت میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں - لیکن بعض مضامین عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بعض حسن ذوق پیدا کرنے پر - نصاب میں ان مضامین کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا ' خصوصاً بچے

کا جذبہ تخلیق کسی مرئی اور خوشنما شکل میں ظاہر ہونے کے لئے بیقرار رہتا ہے - وہ اپنے گرد و پیش کی اشیا کو ایسی ترتیب دینا چاہتا ہے کہ ان میں حسن پیدا ہو - وہ مادے کو صورت بخشنا چاہتا ہے - ادب میں وہ انسانی جذبات اور خیالات کا نظم و نثر کی خوشنما شکلوں میں مطالعہ کرتا ہے اور خود اپنے جذبات کو اسی انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ہمیں ادب کی اعلیٰ معاشری قدر سے انکار نہیں کیونکہ اکثر ادب کے شاہکار انسانی زندگی کے مسائل اور محرکات کو سمجھانے میں سائنس اور تاریخ کے خشک اور علمی بیانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے ہمجنسوں کی خوشی اور غم ' کامیابی اور ناکامی میں شریک، کرکے ہمارے جذبۂ انسانیت کی توسیع اور تہذیب کرتے ہیں - کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا کلام یا کسی جید ادیب اور افسانہ نگار کی بلند پایہ تصانیف حقیقی معنی میں زندگی کی تفسیر اور تمدن کی تنقید ہوتی ہیں - لیکن کسی تحریر یا تقریر ' کسی نظم یا نثر کو ادب کا درجہ اسی وقت ملتا ہے جب وہ ہمارے ذوق حسن کی تسکین کرے - اسی طرح نصاب میں دست کاری اور فنون لطیفہ کو اس غرض سے جگہ دینی چاہئے کہ بچوں میں جذبۂ تخلیق بیدار ہو ' آرٹ کے عمدہ نمونوں کو دیکھہ کر ان کا مذاق پاکیزہ اور شستہ ہو اور انہیں ایسے مشاغل میں دل چسپی ہو جن کو وہ آئندہ زندگی میں اپنی فرصت کا خوشگوار مشغلہ بناسکیں - ہمارے ملک میں شاید سو میں سے ننانوے طلبہ کا خانگی ماحول ایسا ہوتا ہے جو ان کے مذاق کی صحیح تربیت میں کسی طرح معین نہیں ہوسکتا - ان کو اپنے چاروں طرف بھدی اور بے ڈھنگی چیزیں ' تنگ و تاریک مکان ' خراب اور میلی سڑکیں ' ادنیٰ درجے کی تصویریں ' مشین کی بد نما مصنوعات

نظر پڑتی ہیں جن کا مجموعی اثر اُن کی طبیعت اور مذاق پر بہت خراب ہوتا ہے - مدرسے کا یہ کام ہے کہ انہیں حسین چیزوں سے روشناس کرے ۔ اپنی چار دیواری کے اندر ہر چیز میں صفائی ' سادگی اور حسن ذوق کو دخل دے - اس کی عمارت صاف ستھری ہونی چاہئے - فرنیچر اور سامان کا قیمتی ہونا ضروری نہیں لیکن سڈول اور خوش نما ہونا نہایت ضروری ہے - تصویروں ' دست کاریوں وغیرہ کے عمدہ نمونوں' طلبہ کے ہاتھہ کی بنائی ہوئی خوبصورت چیزوں' اور مختلف قسم کے تعلیمی نقشوں سے کمروں کو سجانا چاہئے تاکہ اُن سب کا اثر غیر محسوس طریقے پر طلبہ کے مذاق پر پڑے - اسی طرح مدرسے میں جہاں کہیں ممکن ہو ' باغ یا چمن لگانا چاہئے کہ وہ حسن فطرت کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں کم خرچ میں خوبصورت پھولوں کے گملوں اور بیلوں کی مدد سے مدرسے میں خوش نمائی پیدا ہوسکتی ہے - طلبہ کے لئے تعلیمی سیر و سفر کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ جہاں کہیں فن تعمیر یا مصوری یا قدیم صنعتوں وغیرہ کے خوبصورت نمونے موجود ہوں وہاں جاکر وہ استاد کی نگرانی میں ان کا مطالعہ کریں اور ان کی نظر میں حسن شناسی پیدا ہو - معمولی طالب علم کو اُس کے بد نما اور بے کیف ماحول سے نکالنے کا ' بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ مدرسوں کو گویا اس وحشتناک صحرا کے بیچ میں ایک دلکش نخلستان بنا دیا جائے جس کی فضا میں پرورش پاکر ان کے مذاق کی اصلاح ہو وہ خوشنما اور بد نما چیزوں میں تمیز کرسکیں ' عالم فطرت اور عالم صنعت میں جہاں کہیں کوئی خوبصورت چیز دیکھیں اس کی قدر کریں اور اس سے لطف اندوز ہوں اور اپنی صلاحیت اور میلان

کے مطابق خود بھی تخلیق حسن میں حصہ لے سکیں ۔ اس کا طریقہ وھی ھے جو ھم اوپر بیان کر چکے ھیں یعنی طلبہ کو حسن صورت اور حسن ذوق کے ماحول میں رکھا جائے جو غیر محسوس طریقے پر ان کے ذاتی مذاق کو سدھارے اور نصاب میں ایسے مضامین شامل کئے جائیں جو ان کو عملی یا انفعالی طور پر جذبۂ تخلیق کے اظہار کا موقع دیں ۔ ادب اور فنون لطیفہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ھے کہ جس شخص میں ان کا صحیح مذاق پیدا ھو جاتا ھے وہ گھٹیا چیزوں اور بد نما حرکتوں سے نفرت کرنے لگتا ھے ۔ مثلاً ادنیٰ درجے کے ناولوں اور قصوں ' بری تصویروں ' بے جا نمائش اور مبالغے سے اسے وحشت ھوتی ھے اور وہ خرد بخود ان سے دور رھتا ھے ۔ اس کے لئے کسی عقلی دلیل یا غور فکر کی ضرورت نہیں ھوتی ۔ کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں مہذب نہیں ھوسکتی جب تک عوام کے مذاق کا معیار بلند نہ کیا جائے اور اس کی ذمہداری بھی ' اور بہت سی ذمہداریوں کی طرح مدرسوں پر عائد ھوتی ھے ۔ ھمارا یہ دعویٰ نہیں کہ ھر شخص میں اعلیٰ احساس جمال پیدا ھوسکتا ھے یا ھر شخص صناع بن سکتا ھے ۔ لیکن ھمارے نزدیک ھر شخص کا مذاق ایک حد تک اصلاح پذیر ھے اور بے شمار خوبصورت مناظر اور صنائع میں سے کسی نہ کسی سے ضرور لطف اندوز ھوسکتا ھے ۔ ساری قوم کے احساس جمال کی تربیت کے لئے مدرسے کے ساتھہ اور بہت سے بیرونی اداروں کا اشتراک عمل ضروری ھے لیکن جہاں تک نو عمروں کا تعلق ھے مدرسے بہت کچھہ کرسکتے ھیں بشرطیکہ معلموں میں اس بات کا احساس ھو اور خود ان میں ذوق جمال مفقود نہ ھو ۔ ذوق ایسی چیز ھے جو سکھا یا نہیں جاسکتا بلکہ اس کا اثر براہ راست دل پر پڑتا ھے ۔

ھندوستانی مدارس کے نصاب کی بحث میں ھمیں مادری زبانوں اور ان کے ادب کا ذکر کرنا ضروری ھے کیونکہ بہت سے داخلی اور خارجی

اسباب کی وجہ سے ہمارے یہاں اپنی زبان اور ادب کی کماحقہ قدر نہیں کی جاتی - بہت سے ناواقف لوگوں کا جنھوں نے صرف مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور تمام علوم انگریزی زبان میں پڑھے ہیں یہ خیال ہے کہ ہندوستانی زبانیں ابھی بہت کم مایہ ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کا بار اُٹھا سکیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ سیاسی اور اقتصادی حالات سے مجبور ہوکر اپنی زبان اور اپنے علوم سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور اپنی ساری توجہ اور کوشش مغربی علوم انگریزی زبان کے ذریعے سے حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں - اس صورت حال کے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ تعلیمی اور قومی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہیں - ایک تو انگریزی زبان پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور دیسی زبانوں سے غفلت برتنے سے ان زبانوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی جس کو نا سمجھہ لوگ ان کے خلاف بطور ایک دلیل کے پیش کرتے ہیں ! دوسرے ' چونکہ ابتدا میں تقریباً تمام تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی تھی اور اب بھی ثانوی تعلیم بڑی حد تک اور اعلیٰ تعلیم تمام تر انگریزی میں ہوتی ہے اس لئے ملک میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان بیگانگی پیدا ہوگئی جس کے اثرات دونوں کے لئے بہت برے ثابت ہوئے - یعنی ان کے اغراض ومقاصد میں جو اختلاف تھا وہ اور بڑھ گیا اور معاشری معاملات میں اتفاق رائے اور اتحاد عمل ناممکن ہو گیا - گزشتہ چند سال میں سیاسی اسباب اور تحریکوں کی بدولت اس کی کسی قدر اصلاح ہوئی ہے - لیکن ابھی تک ان طبقوں میں یکجہتی پیدا نہیں ہوئی خالص تعلیمی نقطہ نظر سے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تمام طلبہ کا علمی معیار بہت کم ہوگیا ہے جنھیں غیر زبانوں کی تحصیل سے کوئی خاص مناسبت نہیں اور چونکہ بہت بڑی تعداد ایسے ہی طلبہ کی ہے اس لئے مدرسوں کے عام معیار پر نہایت

خراب اثر پڑا - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لئے یہ بہت مشکل ہے
کہ وہ کسی مضمون مثلاً تاریخ ' جغرافیہ یا سائنس کا مطالعہ ایک غیر
زبان میں کرے - اس کی آدھی توجہ مطلب پر ہوتی ہے اور آدھی ان الفاظ
پر جن کا صحیح مفہوم سمجھنے کی وہ کوشش کرتا ہے اور اکثر کامیاب
نہیں ہوتا - یا ہوتا بھی ہے تو بڑی محنت سے اور بہت سا وقت ضائع کرنے
کے بعد - لوگ بہت سے ہندوستانیوں کو صحت اور روانی کے ساتھہ انگریزی
بولتے اور پڑھتے دیکھتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ لاکھوں طلبہ میں
سے مشکل سے سو دو سو کو یہ بات حاصل ہوتی ہے اور اگر بالفرض طلبہ کی
بہت بڑی تعداد انگریزی پر عبور حاصل کر لے تب بھی کوئی وجہ سمجھہ
میں نہیں آتی کہ وہ وقت جو مختلف سائنسوں اور عمرانی علوم کی
تحصیل میں صرف ہوسکتا ہے اور جس کی وجہ سے طلبہ کی
علمی قابلیت کا معیار بہت بڑہ سکتا ہے کیوں محض ایک زبان
کی تحصیل میں ضائع کیا جائے ؟ اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ
انگریزی زبان نصاب سے خارج کر دی جائے کیونکہ ہمیں اس کی اہمیت
کا پورا احساس ہے - اس وقت تو وہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے ایک
خاص حیثیت رکھتی ہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے - لیکن
جب ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط نہ رہے گا تب بھی تجارت
اور بین الاقوامی سیاست کے لئے ہم اس کے محتاج رہینگے اور اس سے
بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ہمارے اور مغربی تہذیب و تمدن کے درمیان
انگریزی زبان ہی واسطے کا کام دے سکتی ہے - لہذا اس کی مستقل
اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا - لیکن ہمیں تعلیمی نقطہ
نظر سے اس امر پر اعتراض ہے کہ وہ نصاب پر بالکل حاوی ہو گئی ہے
اور اس کی تحصیل میں طلبہ کو بے اندازہ وقت اور محنت صرف

کرنی پڑتی ھے - ھمارے خیال میں اس کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے
اب کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی - کیونکہ ملک کی
تمام بڑی بڑی زبانوں میں اتنا علمی اور ادبی ذخیرہ موجود ھے اور وہ اس
تیزی سے ترقی کر رھی ھیں کہ نہ صرف ثانوی بلکہ اعلیٰ مدارج میں
بھی یہ زبانیں ذریعہ تعلیم کا کام دے سکتی ھیں - انگریزی زبان کو
ھائی اسکولوں اور کالجوں دونوں میں ایک نہایت اھم اختیاری زبان
کی حیثیت دینی چاھئے جس کو وہ تمام طلبہ حاصل کریں جن کو
تجارت یا سرکاری نوکری یا مغربی علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے
یا مغربی تہذیب و ادب سے مستفید ھونے کے لئے اس کی ضرورت ھے -
ابتدا میں اس کو اختیاری زبان بنا دینے سے کوئی نمایاں تبدیلی پیدا
نہ ھوگی کیونکہ پیشتر طلبہ اقتصادی اور سیاسی وجوہ سے اور مغربی
تہذیب کے ذھنی تسلط سے مجبور ھوکر انگریزی پڑھینگے لیکن رفتہ
رفتہ لوگ جن کو ایسے پیشے اختیار کرنے ھیں جن میں انگریزی زبان
کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً کاشتکاری ' یا چھوٹے پیمانے پر دوکانداری
یا صنعت و حرفت اس کو چھوڑ دینگے اور اس کی تعلیم اس مختصر
جماعت کے لئے مخصوص ھوجائے گی جن کو علمی مشاغل یا سیاست
یا بڑے پیمانے پر صنعت و حرفت اور تجارت میں زندگی بسر کرنی ھے -
اس وقت خود اس زبان کی تعلیم بھی بہت بہتر ھوجائے گی - کیونکہ
معلموں پر یہ بار نہیں ھوگا کہ وہ ھر کس و ناکس کو خواہ قدرت نے
اسے اس قابل بنا یا ھو یا نہ بنا یا ھو ' زبر دستی ایک مشکل غیر
ملکی زبان پڑھائیں - وہ اپنی پوری توجہ اور محنت ان طلبہ پر
صرف کرینگے جو واقعی اس زبان سے مناسبت اور شوق رکھتے ھیں - عام
طلبہ کو یہ فائدہ ھوگا کہ وہ اس بوجھہ سے سبکدوش ھوکر اپنی مادری زبان
اور مادری ادب کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں گے اور اس کے ذریعے نہ صرف

ان کی علمی استعداد بڑھے گی بلکہ ان میں ذوق ادب بھی پیدا ہوگا - کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس زبان کے ادبی نکات اور خوبیوں سے لطف اندوز ہونا قدرتاً زیادہ آسان ہے جو گویا بچپن سے ان کی گھٹی میں پڑی ہے اور جس کے اصول سے وہ غیر محسوس طریقے پر باتوں باتوں میں واقف ہوجاتے ہیں علاوہ اپنی زبان اور اپنے ادب میں طلبہ کو ایسے جذبات اور خیالات ایسے واقعات اور مناظر ملتے ہیں جو ان کے تجربے کے اندر ہیں یا جن کو وہ اپنے تخیل کی مدد سے بہ آسانی سمجھہ سکتے ہیں اس لئے انہیں قدرتی طور پر اس سے زیادہ دل بستگی ہوتی ہے - خود قومی زبانوں کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ جب وہ یونیورسٹی میں دوسرے علوم و فنون کی ہم پلہ ہونگی اور ان کے ذریعے تمام علوم و فنون پڑھائے جائنگے تو ان کا معیار بلند ہوجائے گا اور تعلیم یافتہ جماعت میں سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو اپنے آپ کو ان کی خدمت کے لئے وقف کر کے انہیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مرتبے پر پہنچا دے گا - اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا تجربہ گو ابھی اس کی عمر چند ہی سال کی ہے بہت امید افزا ہے - اس کی بدولت بہت سی علمی تصانیف اردو زبان میں منتقل ہوگئی ہیں اور منتقل ہوتی جاتی ہیں اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اردو زبان کے ذریعے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم دی جا سکتی ہے - مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت کو ایک حد تک تعلیمی محکموں نے تسلیم کرلیا ہے اور سوائے چند جمود پسند یونیورسٹیوں کے تقریباً سب جگہہ ہائی اسکولوں کی تعلیم صوبے کی زبان یا زبانوں میں دی جاتی ہے - اور غالباً چند سال کے اندر اندر کوئی یونیورسٹی ایسی نہ رہے گی جہاں ثانوی تعلیم انگریزی کے ذریعے دی جائے - لیکن اس کے بعد دیسی زبانوں کو ایک اور تعلیمی جہاد کرنا پڑے گا جس کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں

کی تسخیر ہوگا - اس جہاد کی ابتدا بھی ہوچکی ہے اور کہیں کہیں سرکاری طور پر تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئي ہیں کہ وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر نظر ڈال کر رپورٹ پیش کریں - اسي قسم کی ایک کمیٹی جو ناگپور یونیورسٹی کی طرف سے مقرر ہوئی تھي اس کی رپورٹ بحیثیت مجموعی اس اصول کی موید ہے کہ کالجوں میں طلبہ کی مادري زبان میں تعلیم دی جائے اور گو اس پر ابھی تک عمل در آمد نہیں ہوا لیکن بطور ایک علامت کے اس کی بہت اہمیت ہے - اور اس سے ہوا کے رخ کا اندازہ ہو سکتا ہے - پنڈت مدن موہن مالویہ نے حال ہی میں بنارس یونیورسٹی کے ایک اہم اجلاس میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ عنقریب وہاں انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم ہندی میں دی جائے گی -

اب یہ امر واضع ہو گیا کہ یہ نصاب جدید جس کے اہم عناصر سے ہم بحث کر چکے ہیں مدرسے کے مروجہ نصاب سے بہت زیادہ وسیع اور متنوع ہوگا اور اس میں طلبہ کی مکمل تربیت کے بہت زیادہ امکانات ہوں گے - ان کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں جن کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں :—

اول درسی مضامین جن میں زیادہ تر وہ مروجہ علوم ہوں گے جو اب بھی مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں مثلاً سائنس ' تاریخ ' جغرافیہ ' ریاضی ' مادري زبان ' قدیم زبانیں ' انگریزی وغیرہ - ان مضامین کا نصاب بالکل وہی نہیں ہوگا جو اب ہے گو نام یہی رہیں گے - ان کے مواد کی اچھی طرح تنقید کرنی ہوگی اور غیر ضروری چیزوں کو نکال کر زندہ مسائل اور دل چسپ مباحث شامل کئے جائیں گے جو طلبہ کے ذہنی معیار اور میلان کے مطابق ہوں اور ان کو معاشرتی زندگي کے نظام سے آگاہ کریں -

دوسرے وہ مضامین اور مشاغل جن کا تعلق ہاتھہ اور آنکھہ کی تربیت سے ہے اور جن کے ذریعے قوت تخلیق اور حسن ذوق پیدا ہوتا ہے یعنی مختلف قسم کی دستکاریاں مصوری ' موسیقی اور ادب بحیثیت ایک فن لطیف کے - ہمارے مروجہ نصاب میں یہ شعبہ بہت ناقص ہے - اکثر مدارس میں تو ان مضامین کی تعلیم کا بالکل ہی انتظام نہیں ہے اور اس نقص کی وجہ سے طلبہ کی تربیت نامکمل اور یک طرفہ رہتی ہے - بعض مدارس میں صرف ڈرائنگ یا کہیں کہیں لکڑی کا کام نصاب میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس کے واقعی مفہوم اور اہمیت کو خود معلموں نے بھی نہیں سمجھا - کیونکہ وہ اس کو محض ہاتھہ کا ہنر سمجھہ کر سکھاتے ہیں نہ اس طرح سے کہ طلبہ کو تخلیق کے ذریعے اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع ملے - اگر ہم مدرسے کو بجائے ایک غیر دل چسپ "درسگاہ" کے بچوں کی "تربیت گاہ" بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں ان مضامین کی تعلیم پر زیادہ زور دینا پڑے گا -

تیسرے وہ بہت سے مشاغل ہیں جو براہ راست نصاب سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان کے ذریعے طلبہ اپنے فرصت کے وقت میں ' خواہ مدرسے میں یا گھر پر ' اپنے شوقوں کو جو اکثر نصابی مشاغل کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں - اس قسم کے مشاغل میں ' جو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں ' طلبہ کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے - ان میں اعتماد ذات ' صلاحیت عمل اور ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا سیکھتے ہیں - ہر اچھے مدرسے میں اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق اور اہتمام سے رائج

ہوجاتے ہیں - مثلاً مدرسے کا میگزین نکالنا ' مختلف قسم کی علمی اور ادبی انجمنیں قائم کرنا ' تعلیمی سیر و سفر کا اہتمام کرنا ' مجلس مباحثہ کو چلانا ' حکومت خود اختیاری کا انتظام ' فرصت کے اوقات میں دست کاری کا مشغلہ ' اپنے شوق سے فنون لطیفہ میں سے کسی فن کی مشق -

ایک زندہ مدرسے کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کے طلبہ اپنے شوق سے کتنے مشاغل جو نصاب سے باہر ہیں یا اس میں محض ضمنی طور پر شامل ہیں رائج کر سکتے ہیں اور انہیں استقلال کے ساتھ جاری رکھ کر مدرسے کی زندگی کو خوش گوار ' مفید اور عملی بناتے ہیں - نصاب کی تدوین کرنے میں معلم اس قسم کے مشاغل کو بالارادہ پیش نظر نہیں رکھتا لیکن اس کی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ وہ ہر مضمون کی تعلیم اس طرح دے کہ طلبہ کے شوق مختلف صورتوں میں ظاہر ہوں اور وہ ان شوقوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے اہتمام سے مدرسے میں جماعتیں اور انجمنیں قائم کر لیں - مثلاً اگر تاریخ کا معلم اپنے مضمون میں ذوق اور قابلیت اور انہماک رکھتا ہے اور اپنی تعلیم کے دوران میں طلبہ کو اس کے معاشری پہلو سے آگاہ کرتا ہے ' تاریخی عمارتوں سے دل چسپی دلاتا ہے ' مشاہیر کی شخصیت ان کے سامنے جیتے جاگتے الفاظ میں پیش کرتا ہے تو یقیناً جماعت کے بعض طلبہ پر اس کا اثر ضرور پڑے گا - ممکن ہے کہ ان میں سے چند کو فن تعمیر سے دل چسپی پیدا ہو جائے اور وہ اس کا محنت اور شوق کے ساتھ مطالعہ کرنے لگیں - تاریخی عمارتوں کو دیکھیں ' ان کے نقشے بنائیں ' مختلف زمانوں کے فن تعمیر کا مقابلہ کریں اور اپنی واقفیت سے نہ صرف خود مستفید ہوں بلکہ استاد

کی تھوڑی سی ہمت افزائی سے اپنے ہم جماعتوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں - اسی طرح ممکن ھے کسی طالب علم کو کسی بڑی تاریخی شخصیت مثلاً اکبر ' یا اشوک یا علاءالدین کے حالات سے خاص دل چسپی پیدا ہوجائے اور وہ کتب خانے کی کتابوں سے مدد لے کر اس کے متعلق کوئی مبسوط اور قابل قدر مضمون لکھے - یا چند طلبہ مل کر تاریخ کے کسی عہد کا مطالعہ اس طرح کریں کہ اس کے مختلف شعبوں کو آپس میں تقسیم کر لیں اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد ایک تاریخی مقالہ تیار کریں - اس طرح اگر مادری زبان کے تعلیم دینے والے استاد طلبہ میں تحریر کا صحیح مذاق پیدا کر دیں اور دوسرے اساتذہ ان کے ساتھ تعاون کریں تو یقیناً ان میں یہ خواہش پیدا ہوسکتی ھے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور اپنے روزمرہ کے تجربات اور دل چسپ مشاغل کو تحریر میں لانے کے لئے مدرسے کا میگزین نکالیں - پھر اس اشاعت کے ضمن میں اور بہت سے کام نکل سکتے ہیں مثلاً خبروں کی فراھمی ' انجمنوں کی رپورٹیں لکھنا ' میگزین کی کتابت یا طباعت کا انتظام کرنا ' اس کے لئے سرمایہ کا فراھم کرنا وغیرہ وغیرہ - ان سب کاموں کو باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دینا بہت بڑی علمی اور عملی تربیت ھے جس کا بدل درسی مضامین کی تعلیم نہیں ھوسکتی - ھمارے مدارس میں اول تو اس قسم کے مشاغل رائج ھی نہیں اور اکثر استاد ان کو تضییع اوقات سمجھتے ہیں اور جہاں کہیں خال خال پائے جاتے ہیں وہاں ان کا مقصد بالعموم نمائش یا انسپکٹر کو خوش کرنا ھوتا ھے - ایسی حالت میں ان سے پورا تعلیمی فائدہ ہرگز نہیں اُٹھایا جاسکتا کیونکہ وہ استاد کی طرف سے کم و بیش جبراً عائد کئے جاتے ہیں ؛ طلبہ

کی روز مرہ زندگی سے خود بخود پیدا نہیں ہوتے اور ان کے جبلی شوقوں کو ظاهر نہیں کرتے - مدرسہ جدید کے اس پہلو کی تنظیم کے لئے استادوں میں تخیل اور بیدار مغزی اور اشتراک عمل درکار ھے اور جب تک وہ سب ان مشاغل کی اهمیت کو نہ سمجھیں اور انہیں فروغ دینے کی کوشش نہ کریں ان کے مدرسے میں زندگی اور عمل کی فضا پیدا نہیں هوسکتی - اس بحث کے ضمن میں همیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاهئے کہ نصاب کی یہ تقسیم محض مضامین اور مشاغل کی نوعیت کے اعتبار سے کی گئی ھے - دوران تعلیم میں اس کو قطعی سمجھ کر ان شعبوں* کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا نہایت سخت غلطی هوگی - نفسی اعتبار سے ان سب میں نہایت گہرا اور لازمی تعلق ھے کیونکہ وہ سب ایک هی فرد کی علمی اور عملی تربیت کے وسائل هیں اور ان کے مجموعی اثر سے اس کے دماغ اور اس کی صلاحیت عمل کی نشو و نما هوتی ھے - اس لئے معلم کو ان کے درمیان ربط اور تعلق قائم رکھنا چاهئے یعنی درسی مضامین اور دستکاری کی تعلیم میں کوئی حد فاصل نہیں هونی چاهئے بلکہ دستکاری کی خواهش اور شوق سے درسی مضامین کے پڑھانے میں کام لینا چاهئے - مروجہ مضامین میں سے کوئی مضمون بھی ایسا نہیں جس میں دستکاری اور فنون لطیفہ سے کام لینے کے مواقع موجود نہوں - ادب کی تعلیم میں مصوری ' ڈرائنگ اور موسیقی ' جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم میں نقشہ کشی ' مصوری ' عمارتوں اور لباس اور سامان کے نمونے تیار کرنا ' سائنس میں آلات کے نقشے کھینچنا ' عملی تجربوں کے لئے سامان تیار کرنا ' یہ سب چیزیں ایسی هیں جن کے ذریعے نہ صرف بچوں کے جذبہ تخلیق کا اظہار هوگا بلکہ انہیں اپنے درسی مضامین سے پہلے سے کہیں زیادہ دل چسپی اور رغبت پیدا هوجائے گی -

علی ہذالقیاس تیسرے شعبے میں ہم نے جن مشاغل کا ذکر کیا ہے ان کو مدرسے کے واقعی کاموں سے بے تعلق نہیں سمجھنا چاہئے - جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان میں سے اکثر کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی اثر آفریں معلم طلبہ میں اپنے مضمون کے کسی خاص پہلو سے گہری دل چسپی اور ذوق پیدا کر دیتا ہے اور وہ اس کی تسکین کے وسائل تلاش کرتے ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچاتے ہیں - اگر درسی تعلیم اور ان آزاد مشاغل میں ربط پیدا ہوجائے گا تو اس سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا - طلبہ اپنے اختیاری مشاغل کے انتخاب میں ان کی تعلیمی قدر کا لحاظ رکھیں گے یعنی انہیں مشاغل کو پسند کرینگے جو ان کی تعلیم میں بلا واسطہ یا بالواسطہ مدد دیتے ہوں اور جب طلبہ ان مشاغل کو اپنی خوشی اور اپنے شوق سے انجام دیں گے تو ان کی عام ذہنی بیداری اور قابلیت کا معیار بلند ہوگا اور اس کا اثر ان کے درسی مشاغل پر پڑے گا - ہر سمجھدار معلم کو اس بات کا تجربہ ہوگا کہ جب کوئی طالب علم کوئی کام اپنے شوق سے انجام دیتا ہے اور اسے اس میں کامیابی ہوتی ہے تو اس میں اعتماد نفس زیادہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنا روز مرہ کا کام بھی پہلے سے زیادہ انہماک اور مستعدی سے کرنے لگتا ہے - لہذا معلموں کی متفقہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ مدرسے کے تمام درسی مضامین اور دوسرے مشاغل کو ایک دوسرے کے ساتھ ربط دیں تاکہ ان کے ذریعہ طلبہ کی شخصیت کی مکمل اور ہم آہنگ تربیت ہوسکے -

اسی طرح مروجہ درسی مضامین میں بھی ربط اور تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس ربط کی اہمیت موجودہ زمانے میں خاص طور پر زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ کل علوم جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں سائنس کی مثال سے متاثر ہو کر مختلف شعبوں میں تقسیم ہوگئے ہیں

اور ہر شعبے کی حد بندی اس طرح کی گئی ہے کہ نہ صرف بچوں کے
خام کار دماغوں کو بلکہ اکثر استادوں کو بھی وہ اپنی جگہ پر مکمل اور
دوسرے مضامین سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے - لیکن ہم نے علم اور زندگی
کی باہمی وابستگی کی بابت جو بحث کی ہے اس سے صاف طور پر
معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تفریق نہ صرف علوم کی تاریخی ارتقاء
کے لحاظ سے غلط ہے بلکہ تعلیمی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہے - اس
صورت حال کی اصلاح کے لئے ماہرین تعلیم نے مختلف کوششیں کی
ہیں جن کو مجموعی طور پر " ربط مضامین نصاب " کی تحریک کہا
جاتا ہے - اس کا منشا یہ ہے کہ نصاب کو معاشرتی زندگی کے ساتھ
ہم آہنگ بنانے کے لئے مضامین کی قطعی اور مصنوعی تقسیم کو مٹا کر وہ
ربط و تعلق پیدا کر دیا جائے جو ان میں قدرتی طور پر موجود تھا -
اگر اس اصول کے جانچنے کے لئے ہم وہی معیار اختیار کریں جس سے
ہم نے پہلے کام لیا ہے یعنی مدرسے کے باہر تمدنی زندگی کے کاروبار پر
نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں علم کی ایسی تقسیم نہیں پائی
جاتی جیسی مدرسوں میں تنگ نظر معلموں اور تعلیمی محکموں نے
اپنی آسانی کی غرض سے رائج کردی ہے - جب ہم اپنے مختلف تمدن
اور معاشرتی فرائض انجام دیتے ہیں یا صنعت و حرفت ' تجارت '
زراعت اور دوسرے پیشوں میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ
سکتے کہ فلاں کام کے لئے تاریخ کے علم کی ضرورت ہے فلاں کے لئے جغرافیہ
کی ' فلاں کے لئے سائنس کی - ہمیں اِن مشاغل میں مختلف قسم کی
معلومات اور واقفیت درکار ہوتی ہے اور ہم حسب ضرورت بغیر کسی
منطقی تحلیل کے ان سب علوم و فنون سے کام لیتے ہیں جنہیں ہم نے
حاصل کیا ہے - مثلاً ایک شخص اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کا ممبر
ہے اور وہ اس کے جلسے میں شریک ہوتا ہے - وہاں مختلف قسم کے مسائل

درپیش ہوتے ہیں - کسی کا تعلق تعلیم سے ہے ' کسی کا شہر کی مالی حالت سے ' کسی کا حفظان صحت سے ' کسی کا شہر کی عمارات سے - ان تمام امور کے متعلق معقولیت کے ساتھہ رائے دینے کے لئے ہمیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم علیحدہ علیحدہ علوم سے مدد لیں جو ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں بلکہ اپنی مجموعی معلومات ' واقفیت اور تجربے کی بنا پر ہم ایک رائے قائم کرتے ہیں مثلاً اگر زیر غور مسئلہ صحت عامہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو سمجھنے اور اس کا حل سوچنے میں ہمیں ایک حد تک اس واقفیت سے مدد ملے گی جو ہمیں اپنی درسی تعلیم کے دوران میں علم حفظان صحت کے مطالعے سے حاصل ہوئی تھی - اس کے ساتھہ ساتھہ ہمیں اپنے عام تجربے اور مشاہدے سے کام لینا ہوگا جو روز مرہ کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے اور اس میں مدرسے کی تعلیم کو کوئی خاص دخل نہیں - علاوہ بریں مجوزہ تجویز کا ایک مالی پہلو بھی ہوگا جس پر غور کرنے میں ہمارا تجربہ اور مخصوص اقتصادی واقفیت کام آئے گی - یہی صورت ہر شخص کو روز مرہ کے کاروبار میں پیش آتی ہے - یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین خصوصی بھی جن کو بظاہر علم کے ایک خاص شعبے سے تعلق ہوتا ہے اپنا کام اُس وقت تک عمدگی سے نہیں کرسکتے جب تک انہیں دوسرے متفقہ علوم سے کافی واقفیت نہ ہو اور وہ اپنے عام تجربات اور مشاہدات سے فائدہ نہ اُٹھائیں - اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ارباب فکر کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کی واقفیت اور دل چسپی صرف اپنے مخصوص علم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسرے علوم و فنون اور عملی مشاغل سے بھی ذوق رکھتے ہیں - اگر ان تمام دلچسپیوں میں مناسب تنظیم قائم رکھی جائے تو یہ ان کے مخصوص علمی مشاغل میں مخل نہیں ہونگی بلکہ ان میں مدد دیںگی کیونکہ وہ اپنے کام

کو وسیع نقطہ نظر سے یہ سمجھہ بوجھہ کر انجام دینگے کہ اسے زندگی کے دوسرے مسائل سے کیا تعلق ہے - ان کے دماغ کی مثال ایک مکمل اور پیچیدہ مشین کی سی ہے جو بہت سی کلوں کو چلاتی ہے اور ان سے حسب ضرورت کام لیتی رہتی ہے - برخلاف اس کے اکثر ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو بہت کچھہ معلومات رکھتے ہیں لیکن اسے ضرورت کے وقت استعمال نہیں کرسکتے - اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی معلومات میں ربط اور نظم اور حرکت نہیں ہوتی -

ہر قابل معلم کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جب کوئی مضمون پڑھاتا ہے مثلاً کسی تاریخی یا ادبی مسئلے سے بحث کرتا ہے تو وہ اپنے درس کو محض تاریخ یا ادب ہی کے دائرے میں محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی عام معلومات اور ذاتی تجربے سے مدد لے کر بہت سی ایسی چیزیں مثال کے طور پر یا مقابلے اور تشریح کے لئے پیش کرتا ہے جن سے زیر بحث مسئلے پر روشنی پڑتی ہے - وہ تاریخی مسائل کے ضمن میں دنیا کے مختلف قوموں اور ملکوں کے تمدنی اور معاشرتی حالات ' بنی نوع انسان کی جد و جہد کامیابیوں اور ناکامیوں اور آرزؤں کا ذکر کریگا ' اس طرح نہیں کہ وہ غیر متعلق مباحث معلوم ہوں بلکہ اس طرح کہ وہ خاص مسئلہ جس کا مطالعہ طلبہ کر رہے ہیں انسانی تاریخ کے عظیم‌الشان سلسلے میں اپنے مناسب مقام پر نظر آئے - اس طرح اس کی تعلیم میں جان پڑ جاتی ہے - وہ طلبہ میں ذوق اور انہماک پیدا کردیتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ علم چند درسی مضامین کا نام نہیں جن کو امتحان کی خاطر پڑھنا پڑتا ہے بلکہ زندگی کی ایک مربوط اور مسلسل تفسیر ہے جس سے انسان نے بہت کچھہ فائدہ اٹھایا ہے اور وہ خود بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں - برخلاف اس کے جس استاد

میں علم یا تخیل کی کمی ہوتی ہے یا یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ مختلف قسم کے واقعات اور معلومات میں ربط پیدا کرے اور کسی ایک مسئلے پر مختلف سمتوں سے روشنی ڈال سکے اس کی تعلیم ہمیشہ بے لطف اور بے جان ہوتی ہے - طلبہ جو کچھہ علم حاصل کرتے ہیں اس کو ان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوتا - ہمیں اکثر ایسے اُستادوں سے سابقہ پڑتا ہے جو پڑھاتے وقت گویا گھوڑوں کی طرح آنکھوں پر اندھیری لگا لیتے ہیں یعنی اگر وہ کوئی ادبی کتاب پڑھا رہے ہیں تو اس کے دوران میں انہیں یہ خیال تک نہیں آئیگا کہ کسی تاریخی یا جغرافی واقعے کا حوالہ دیں جس سے ممکن ہے مضمون کی دل چسپی کئی گنی زیادہ ہوجائے - یا وہ جغرافیہ پڑھا رہے ہیں اور مثلاً کسی نئے ملک کا حال شروع کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات نہ آئیگی کہ طلبہ میں اس ملک کی طرف سے دل چسپی پیدا کرنے کے لئے ان کی عام واقفیت سے کام لیں یا کسی ایسے امر کی طرف اشارہ کریں جو جغرافیہ کے رسمی مفہوم میں داخل نہ ہو - فرض کیجئے کوئی اُستاد مصر کا جغرافیہ اپنے طلبہ کو پڑھانا چاہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ مصر کی قدیم تہذیب اور اس کی یادگاروں ' مصر کے مشہور عالم اہرام اور ان جدید انکشافات اور دریافتوں کا ذکر نہ کرے جن کا حال بہت سے یا کم سے کم بعض طلبہ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا ؟ -

انگلستان کے مشہور معلم اور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں - اس نے اپنے مدرسے میں مضامین کی مصنوعی تقسیم بڑی حد تک مٹا دی تھی تاکہ طلبہ مختلف علوم کی باہمی وابستگی اور زندگی سے ان کے تعلق کو سمجھیں - جب وہ خود کسی مضمون پر گفتگو کرتا ' خواہ جماعت کے کمرے میں یا سائنس کے

معمل میں یا گرجا گھر میں ، تو اس کے خیالات کی رو میں سائنس ، ادب ، فلسفہ ، انسانی ارتقا کی تاریخ ، اخلاقیات کے مسائل سبھی کچھہ آجاتا تھا - تاریخ کی تفسیر میں وہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور اس کے نتائج سے بحث کرتا ، سائنس کی اهمیت سمجھانے کے لئے وہ تاریخ تمدن پر نظر ڈالتا اور هر مضمون کا تعلق تمدنی زندگی کے وسیع تر مسائل اور مقاصد سے دکھاتا - اس طرح اس کے طلبہ هر سبق کے بعد زندگی کے متعلق ایک زیادہ وسیع ، زیادہ باریک نقطہ نظر لے کر اُٹھتے اور یہ محسوس کرتے کہ انہوں نے جو کچھہ اس گفتگو میں سیکھا ھے وہ ان کے حافظے پر بار نہیں ھے بلکہ ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں گھل مل گیا ھے اور اس کی وجہ سے ان کی دلچسپی کا دائرہ بہت بڑہ گیا ھے اور وہ اپنے درسی مضامین کا ربط پہلے سے بہتر سمجھہ سکتے هیں - یہی بات رگبی پبلک اسکول کے هیڈ ماسٹر آرنلڈ (Arnold) کے تاریخی درس کے متعلق بیان کی جاتی ھے - اور یہ شان هندوستان کے مشہور قدیم معلموں میں بھی پائی جاتی تھی جن کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع هوتا تھا اور جو اپنی زبردست علمیت سے اپنے شاگردوں کی شخصیت اور ان کے نظریہ حیات کو متاثر کرتے تھے - لیکن اس زمانے میں جب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم بھی قواعد اور ضوابط کی پابندیوں میں جکڑ دی گئی ھے اور معلم کی فنی تربیت کے لئے آٹھہ نو مہینے کی قلیل مدت کافی سمجھی جاتی ھے یہ صفت استادوں میں بہت کمیاب ھے - ان کی ذهنی دلچسپیوں میں تنوع اور زندگی نہیں پائی جاتی اور وہ اپنے طلبہ میں بھی یہ بات پیدا نہیں کرسکتے - البتہ اب بھی وہ نامور علمی محققین جنھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعے اپنے علوم میں انتہائی قابلیت حاصل کرلی ھے اور نہ صرف ان

کے فنی پہلو پر حاوی ہیں بلکہ ان کے معاشرتی اور فلسفیانہ نتائج سے
بھی واقف ہیں ' یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ زندگی کا مطالعہ ایک مربوط
اور منظم کل کی حیثیت سے کرسکیں - اس امر کو سمجھانے کے لئے اور زیادہ
تشریح کی ضرورت نہیں کہ عملی زندگی کی ضروریات اور انسان کی ذھنی
ترقیات دونوں کے اعتبار سے درسی مضامین کی مصنوعی تقسیم بہت مضر
ھے - مدرسے کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لوگ جو کچھہ علم حاصل کرتے
ھیں وہ اپنے تجربے اور مشاھدے کے ذریعہ حاصل کرتے ھیں اور اس کے
مختلف عناصر ایک دوسرے کے ساتھہ پیوست اور مربوط ھوتے ھیں اور
وہ اسی شکل میں اسے استعمال بھی کرتے ھیں - بچوں کے نصاب میں
اس قسم کی تقسیم رائج کرنا اور بھی زیادہ قابل اعتراض ھے کیونکہ عام
تجربے اور نفسیاتی تحقیقات دونوں کی تعلیم یہی ھے کہ کم از کم ابتدائی
چند سال میں بچوں کے ذھن میں نہ اس قسم کی تقسیم پائی جاتی
ھے ' نہ اس کو پیدا کرنے کا امکان ھے - اگر جبریہ تقسیم کو ان کے ذھن
پر عائد کیا جائے تو ان کی قدرتی نشو و نما میں حرج واقع ھوگا - ان کے
لئے زندگی ایک مسلسل اور لامتناھی تجربہ ھے جس کے تمام عناصر اور
کیفیات ایک دوسرے کے ساتھہ وابستہ ھیں اور اس کے لئے بہترین تشبیہہ
وھی ھے جو مشہور عالم نفسیات ولیم جیمز (William James) نے دی
ھے - یعنی بچے کی شعوری زندگی کی مثال ایک بہتے ھوے دریا کی سی
ھے جس کے مختلف تجربات لہروں کی مانند ھیں جو ایک دوسرے سے
جدا نہیں کیے جاسکتیں - وہ اپنے روز مرہ کے گوناگوں تجربات کو تاریخ '
جغرافیہ ' سائنس ' ریاضی ' ادب وغیرہ کی اصطلاحوں میں تحویل
نہیں کرتا - اس کے لئے مینھہ کا برسنا اور زمین پر چھوٹے چھوٹے ندی
نالے بہادینا جن میں وہ کشتی چلا سکتا ھے ' یا خود اس کا مٹی کے

گھروندے بنانا یا اپني ماں سے کہانیاں سننا سب ایک مسلسل زندگي کا حصہ ھیں جو تجربات سے پر ھے جن کے ذریعے وہ اپنے ماحول کے واقفیت حاصل کرتا ھے اور اس سے حتی الامکان کام لیتا ھے - اگر ھم ان تجربات کو قبل از وقت ایک دوسرے سے علحدہ کرکے مختلف باضابطہ مضامین میں تقسیم کرنا چاھیں اور مدرسے میں ہر گھنٹے بچوں کي توجہ اور دلچسپي کو ایک شغل سے دوسرے شغل کي طرف منتقل کرتے رھیں تو ان کي حقیقي اھمیت ضائع ھوجائے گي - بچوں کو وہ شوق اور انہماک نہ رھے گا جو اپنے آزاد اور پسندیدہ مشاغل میں ھوتا ھے اور وہ مدرسے کا کام بیدلی کے ساتھہ رسمی طریقے سے کرنے لگیں گے - لہذا مدارس جدید میں یہ التزام ھے کہ نصاب کی ترتیب و تدوین میں خصوصاً چھوٹے بچوں کے نصاب میں مضامین کی کوئی قطعی اور مصنوعی تقسیم نہ کی جائے بلکہ ان کے گرد ونواح کی زندگی اور ان کے پسندیدہ مشاغل اور تجربات کو مطالعے کا موضوع بنایا جائے اور اس مطالعے کو رفتہ رفتہ مرتب اور منظم کیا جائے - یہاں تک کہ انہیں خود بخود یہ خیال پیدا ھوجائے کہ وہ اپنے مختلف قسم کے تجربات میں نظم و ترتیب قائم کریں تاکہ ان سے پوری طرح مستفید ھوسکیں - اس ضرورت کا احساس دلانے اور اسے پورا کرنے کے لئے استادوں کی مدد بہت مفید ھے لیکن ابتدا میں یہ خواھش خود طلبہ میں پیدا ھونی چاھئے - استاد کا کام یہ ھے کہ وہ ان کے مطالعے اور طریقہ تحصیل کو بتدریج ایسے راستوں پر ڈالے کہ وہ ترتیب و تقسیم کے فائدے خود بخود محسوس کریں -

کسی قدر ترمیم کے ساتھہ اسی اصول پر اونچے درجوں میں بھی عمل کیا جاتا ھے - ابتدائی درجوں میں تو مضامین کی مصنوعي تقسیم کو بالکل ھی مٹا دینا چاھئے - لیکن جب طالب علم اُونچی جماعتوں میں

پہنچتا ہے جن کے نصاب میں مضامین کی تقسیم قدرتی طور پر قائم ہو جاتی ہے اس وقت بھی استاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نصاب کی ترتیب اور اپنی تعلیم کے طریقے میں ان کی باہمی وابستگی اور تعلق کو پیش نظر رکھے اور طلبہ کو بھی سمجھاتا رہے - اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں - بعض ماہرین تعلیم نے اس طریقہ کی تائید کی ہے کہ ایک وقت میں صرف چند مضامین پر توجہ کی جائے ' ان کا مطالعہ گہرائی کے ساتھہ کیا جائے - لیکن یہ مضامین ایسے ہوں جن کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے تعلق ہے - چنانچہ بلجیم کے مدرسہ جدید کا بانی واسکونسلو (Vasconcellos) اسی اصول پر زور دیتا ہے - اس کا خیال ہے کہ اگر ایک وقت میں بچے کی توجہ بہت سے مضامین میں منتشر رہے تو نہ صرف اس کی عام دماغی تربیت کو نقصان پہنچے گا بلکہ تحصیل علم میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگی - کیونکہ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے ایسے مضامین کا مطالعہ کریگا جن میں کوئی لازمی نفسی رابطہ نہیں اور اس وجہ سے اس کا دماغ پریشان اور پراگندہ ہوجائے گا - اپنے مدرسے کے نصاب سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :—

" ایک ہی دن میں ریاضی ' لکھنا پڑھنا ' تاریخ ' جغرافیہ ' طبیعات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ہے ایک جرات آزما مہم کہی جاسکے لیکن اس کا (تعلیمی) نتیجہ صفر ہوگا کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں ہے - " [1]

اس خرابی سے بچنے کی غرض سے اس نے اپنے مدرسے میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ہر میقات (ٹرم) کے لئے چند ایسے مضامین منتخب

---

[1] A New School in Belgium صفحہ ۷۷

کر لئے جاتے تھے جو ایک حد تک موسم سے مناسبت رکھتے تھے - مثلاً
موسم گرما اور موسم بہار میں سائنس کے شعبے میں سے علم حیوانات
اور علم نباتات کا مطالعہ کیا جاتا کیونکہ وہ زمانہ اس کے لئے مقابلتاً
زیادہ مناسب ہے - طبیعات اور کیمیا کی طرف اس زمانے میں کم توجہ
کی جاتی تھی - بلکہ اُن پر جاڑے اور خزاں کے موسم میں زیادہ زور دیا جاتا
تھا - اس تقسیم کی وجہ سے طلبہ منتخب شدہ مضامین کا مطالعہ زیادہ
دل چسپی ، گہرائی اور انہماک سے کرتے تھے - مگر یہ اصول صرف انتخاب
مضامین ہي تک محدود نہ تھا بلکہ ہر مضمون کے مخصوص موضوع کا انتخاب
بھی اسی اصول پر کیا جاتا تھا - ہر روز طلبہ یا تو کسی مضمون کی ایک
خاص شاخ کا مطالعہ کرتے تھے یا کئی ایسی شاخوں کا جن سے ایک
دوسرے کے مسائل اور مباحث پر روشنی پڑے - اسی طرح ہر موضوع کے
مطالعے میں گہرائی پیدا ہوجاتی ہے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے
اچھی طرح غور کیا جا سکتا ہے - مثلاً کسی روز طلبہ اپنے وقت کا زیادہ
تر حصہ فرانسیسي زبان کے مطالعے میں صرف کرتے تھے - ان کو یہ مجبوری
نہ تھی کہ ہر گھنٹے کے بجنے پر اپنے کام کو نامکمل چھوڑ کر اپنی توجہ
کو دفعتاً ایک مضمون سے کسی بالکل مختلف مضمون کی طرف منتقل
کریں جس سے نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ ذہن منتشر ہوجاتا ہے -
اس خیال سے کہ طبیعت کسی کام کو کرتے کرتے اُکتا نہ جائے وہ مضمون
کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کرتے تھے - مثلاً اگر فرانسیسي کا دن ہے
تو وہ اس زبان کي کتابیں پڑھتے ، اس کی قواعد سیکھتے ، اس میں
مضمون لکھتے ، گفتگو کرتے - اس طرح وہ جس مضمون یا موضوع کو
اُٹھاتے اس پر محنت ، صبر اور استقلال کے ساتھ کام کرتے یہاں تک
کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہوجاتا - سائنس کے مختلف شعبوں میں

جہاں اکثر مسلسل اور طویل تجربات اور مشاهدوں کی ضرورت هوتی ھے یہ طریقہ خاص طور پر مفید ھے - کیونکہ اس کی وجہ سے طلبہ کو اتنا وقت اور فرصت مل جاتی ھے کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے اپنے بل پر کام کریں اور اپنی غلطیوں کی تصحیح اپنی کوشش اور سمجھہ سے کریں - اس اصول پر عمل کرنے سے " خیالات میں گہرائی پیدا هوتی ھے اور هر مضمون کے مختلف شعبوں اور مظاهر کے باهمی تعلقات کے مطالعے کا موقع ملتا ھے اور اس کے ساتھہ هی همارے علم کی وسعت بڑھتی ھے اور هم مختلف مضامین کی معلومات کو باهم مربوط کر سکتے هیں " یہ طریقہ " اجتماع مطالعہ " کہلاتا ھے -

هر مدرسے میں اس طریقہ پر عمل کرنا مشکل ھے کیونکہ جب تک نصاب کی ترتیب و تنظیم قابل اُستادوں کے هاتھہ میں نہ هو اور ان کو امتحانوں کی بندشوں سے ایک حد تک آزادی نہ حاصل هو وہ نصاب کی تدوین اور طریقہ تعلیم میں ترمیم اور اصلاح نہیں کر سکتے- لیکن مضامین میں ربط قائم کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ایسا ھے جس پر همارے موجودہ مدارس میں بھی عمل کیا جا سکتا ھے حالانکہ ان میں نئے تعلیمی تجربات کے راستے میں هر قسم کی رکاوٹیں حائل هیں - وہ طریقہ یہ ھے کہ مدرسے میں کوئی مضمون اس طرح نہ پڑھایا جائے گویا وہ بجائے خود ایک مکمل اور مستقل حیثیت رکھتا ھے اور اس کو سمجھنے یا اس سے پوری طرح فائدہ اُٹھانے کے لئے کسی دوسرے مضمون سے مدد لینے کی ضرورت نہیں - نصاب میں بعض مضامین تو ایسے هیں جن کو اپنی نوعیت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے صریحی تعلق ھے مثلاً جغرافیہ اور تاریخ جن کا مشترک موضوع انسان اور اس کی اجتماعی زندگی ھے اور دونوں اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے

اس پر روشنی ڈالتے ھیں - اس اشتراک موضوع کی وجہ سے ان دونوں مضامین میں ھر ھر قدم پر ربط پیدا کرنے کا امکان اور ضرورت ھے - تاریخ انسانی کا ارتقاء اسی عالم آب و گل میں ھوا ھے جس میں بے شمار طبعی قوتیں کام کرتی ھیں جن کو سمجھنا اور سمجھانا جغرافیہ کا کام ھے - جغرافیہ کے مظاھر اور فطرت کی قوتیں انسان کی آزادی کو محدود بھی کرتی ھیں اور اس کو اس کے مقاصد کے حصول میں مدد بھی دیتی ھیں اس لئے ھم تاریخی واقعات کو اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھہ سکتے جب تک ان جغرافی حالات سے واقف نہ ھوں جنھوں نے ان پر اثر ڈالا ھے اور ان کی تشکیل میں حصہ لیا ھے - اسی طرح تاریخ کی حقیقی اھمیت اور اس کی روح کو سمجھنے کے لئے ادب کے مطالعے کی ضرورت ھے اس لئے کہ ادبی تصانیف میں ان انسانی آرزؤں اور حوصلوں اور کوششوں کی تفسیر نظر آتی ھے جن کی عملی تعبیر تاریخ کے واقعات کے ذریعے ھوتی ھے اِسی طرح سائنس اور ریاضی میں ادب ؛ تاریخ جغرافیہ اور دست کاری میں نفس مضمون کے اعتبار سے ربط قائم کرنے کے امکانات موجود ھیں جن سے اُستاد کو فائدہ اُتھانا چاھئے - علاوہ بریں اس تحریک کا تقاضا یہ بھی ھے کہ ھر مضمون کے نصاب میں بعض مناسب چیزیں دوسرے مضامین سے شامل کی جائیں جن سے اس کے مطالب پر مختلف پہلوؤں سے روشنی پڑے اور وہ زیادہ مکمل طریقے پر طلبہ کی سمجھہ میں آجائیں - سائنس کے مضامین کا نصاب بنانے میں اس طرح ایک دوسرے سے مدد لینا خاص طور پر ضروری ھے کیونکہ اس کے بغیر وہ " بے جان ' بے زبان اور بیکار " ھوکر رہ جاتے ھیں - جب ھم سائنس کے ذریعے مظاھر قطرت کی تفسیر کرنا یا اس کو تمدنی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاھتے ھیں تو ھمارے لئے اس کی کوئی ایک شاخ کافی نہیں ھوتی بلکہ مختلف شاخوں سے

کام لینا پڑتا ھے - طبیعات ' کیمیا ' حیاتیات وغیرہ کو نظری طور پر سمجھنے اور ان سے عملی طور پر کام لینے کے لئے ان کی باھمی وابستگی اور تعامل کا سمجھنا ضروری ھے ورنہ وہ اپنے ماحول کے مناظر اور مظاھر کی صحیح تفسیر نہ کر سکیں گی - اِس کی تشریح واسکونسلو (Vasconcellos) نے ایک مثال سے کی ھے - وہ کہتا ھے کہ اگر علم حیوانات کے کسی سبق میں ھمیں سائنس کی آمد رفت کو بیان کرنا ھو تو اس کی ضرورت پڑے گی کہ ھم کیمیا کی طرف رجوع کریں اور کاربن اور آکسیجن کے متعلق واقفیت حاصل کریں - اسی طرح اگر ھم انسان کے جسم کے ڈھانچے کی ساخت کو سمجھانا چاھتے ھیں تو ایک طرف طبیعات سے مدد لے کر بیرم (Lever) کا اصول بتانا ھوگا جس کے بغیر ھڈیوں کی حرکت سمجھہ میں نہیں آسکتی اور دوسری طرف کیمیا کی مدد سے ھڈیوں کی ماھیت پر روشنی ڈالنی پڑیگی - ان مثالوں سے ظاھر ھوتا ھے کہ کسی ایک علمی یا تمدنی مسئلے کو سمجھنے کے لئے بھی ھمیں مختلف علوم و فنون اور تجربات سے کام لینا پڑتا ھے اور جب تک نصاب کی تدوین میں ھم اس بات کو پیش نظر نہیں رکھینگے ھمارے لئے اپنے علم کی تنظیم اور اس کا استعمال بہت مشکل ھوجائیگا - نصاب کے مضامین کو صحیح معنوں میں مربوط کرنے کے لئے ان کی باھمی وابستگی کو ظاھر کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ھے کہ وہ نقطہ تلاش کیا جائے جو ان سب کا مرکز ھے اور ان میں سے ھر ایک کا تعلق اس کے ساتھہ دکھایا جائے - وہ مرکز ظاھر ھے کہ نظام معاشرت اور بچوں کی فطرت کا اجتماعی رجحان ھے - تمام مضامین کی ترتیب میں ھمیں تعلیم کے معاشرتی اغراض اور تمدنی زندگی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ضروری ھے تا کہ ھم طلبہ پر یہ بات واضح کرسکیں کہ ان کے اغراض اور ضروریات کے پورا کرنے میں یہ مضامین انھیں کس طرح مدد دے

سکتے ہیں - امریکہ میں اس تعلیمی تحریک نے مدرسوں میں انقلاب پیدا کردیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ طریقہ تعلیم ' نصاب تعلیم اور ضبط و تادیب کے نظام وغیرہ کو مندرجہ بالا مقصد کے مطابق مرتب کیا جائے وہاں کے معلموں نے اس کے لئے " مدرسوں کی تنظیم معاشری " [۱] کا نام تجویز کیا ہے - نصاب کے معاملے میں اس تحریک نے دو باتوں پر زور دیا ہے - ایک تو یہ کہ تمام مضامین اور مشاغل ایسے ہوں جو طلبہ کے تمدنی احساس اور معلومات میں اضافہ کریں - دوسرے یہ کہ ان تمام امور کو نصاب سے خارج کردیا جائے جو تمدنی زندگی سے کوئی مفید اور معقول تعلق نہیں رکھتے - جیسا ہم اوپر بتا چکے ہیں نصاب کی یہ تنقید اور محاسبہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اکثر ضروریات زمانہ کے ساتھہ ہم‌آهنگ نہیں ہوتا اور اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ترقی کی منزلوں میں تمدن کا ساتھہ نہیں دیتا یعنی جو اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا لحاظ نہیں رکھتا - گذشتہ صدی میں سائنس اور قدیم علوم اور زبانوں میں جو جنگ جاری رہی اور اس زمانے میں نظری اور عملی تعلیم کے مطالبات میں جو کشمکش ہے وہ اسی وجہ سے ہے - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ ان چیزوں کو مقدم اور لازم سمجھیں جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لئے اہمیت رکھتی ہیں اور جو چیزیں محض نمائشی یا آرائشی ہیں ان کو ثانوی حیثیت دیں - مضامین نصاب کی اِضافی قدر و قیمت کا مسئلہ دراصل تہذیب کے مفہوم سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق ابھی تک خود معلموں اور تمدنی مفکروں کے خیالات واضح نہیں ہیں - کیونکہ ایک طرف موجودہ زندگی کے نئے مطالبات ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسری طرف تہذیب کا قدیم تصور جو مختلف حالات میں پیدا ہوا

---

[۱] " Socialization of Education "

تھا ان کے ذہن پر مسلط ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) وغیرہ نے اس مسئلے پر بلکہ تعلیم کے تمام مسائل پر اس نقطہ نظر سے غور کیا ہے کہ ایک جمہوری معاشرے کے لئے کس قسم کی تعلیم اور کس قسم کے نصاب کی ضرورت ہے - ان کا خیال ہے کہ اس لحاظ سے نصاب میں ان مضامین اور مشاغل کو ترجیح اور اہمیت دینی چاہئے جن کا تعلق افراد اور معاشرے کے مشترک تجربات سے ہے یعنی وہ تجربات جن میں زیادہ سے زیادہ تعداد لوگوں کی شریک ہوتی ہے - برخلاف اس کے جن علوم و فنون کا تعلق خاص جماعتوں یا مخصوص پیشوں کی ضروریات سے ہے اُن کی اہمیت مقابلتاً کم ہے - لہذا تعلیم کو اولاً عام انسانی ضروریات اور مقاصد کا خیال کرنا چاہئے اور اس کے بعد مخصوص پیشوں کے مشاغل کا - اسی وجہ سے بعض علوم و فنون مثلاً زراعت اور باغبانی کی اہمیت جبر و مقابلہ سے اور دست کاری کی اہمیت ٹائپ نویسی سے کہیں زیادہ ہے - کیونکہ زراعت یا باغ بانی یا دست کاری نہایت قدیم انسانی مشاغل ہیں جن کا تعلق تمدن کی تاریخ اور تشکیل سے بہت گہرا ہے اور جن میں ہر زمانے کے بیشتر افراد نے حصہ لیا ہے برخلاف اس کے جبر و مقابلہ یا ٹائپ نویسی کی اہمیت بہت محدود ہے اور یہ صرف خاص خاص کاموں اور پیشوں کے لئے مفید ہیں - اگر اس طرح ہم تمام مضامین کو تعلیم کے مرکزی مقصد کے لحاظ سے دیکھیں تو ان میں یہ انتشار باقی نہیں رہے گا بلکہ خود بخود ربط قائم ہوجائیگا ۔ اس تحریک کی تفصیل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کا ایک عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام درسی کتابوں کو از سر نو جدید اصول پر لکھنا پڑیگا - مغربی ممالک میں گذشتہ پچاس سال کے اندر درسی کتابوں میں بہت ترقی ہوئی ہے مختلف علوم کی درسیات تصنیف تجربہ

کار اور قابل لوگوں کے ھاتھہ میں ھے جو نہ صرف ان علوم میں مہارت رکھتے ھیں بلکہ نفسیات اطفال سے بھی کم و بیش واقف ھیں - بعض مدرسوں میں جہاں ایک مستقل اور مقررہ نصاب طلبہ کی تعلیمی ترقی میں حارج سمجھا گیا ھے ' معلموں نے خود اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ھر مضمون کا نصاب تیار کیا ھے اور بجائے اس کے کہ ایک ھی نصاب ھر سال پڑھاتے رھیں وہ اپنے تجربے اور طلبہ کے ذھنی اور عمل کے مطابق اس میں ترمیم اور تبدیلی کرتے رھتے ھیں - طریق ڈالٹن (Dalton Plan) کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ھے کہ نصاب میں ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش رکھنی چاھئے اور ھر مضمون کے معلم کو اپنے تجربے اور معلومات کے مطابق ھر ھفتے اور ھر مہینے کے کام کے لئے نصاب کے خاکے تیار کرنے چاھئیں اور اگر وہ عملاً کامیاب ثابت نہ ھوں تو ان میں تبدیلی کرکے دیکھنا چاھئے کہ کیا نتیجہ ھوتا ھے - اس طرح کے آزمائشی نصاب کی ایک بہت عمدہ مثال امریکہ کی ریاست ونٹکا (Winnetka) کے مدرسوں کی دی جاچکی ھے جہاں استاد خود ھر مضمون کا نصاب معاشری ضروریات اور طلبہ کے نفسی رجحانات کو پیش نظر رکھہ کر مرتب کرتے ھیں ۔ اور اس کو دوسی کتابوں کی شکل میں چھپوانے کے بجائے ٹائپ کرا لیتے ھیں اور طلبہ میں تقسیم کردیتے ھیں - اس ٹائپ میں لکھے ھوئے تعلیمی مواد کو ان کے مطالعے کا مرکز یا بنیاد سمجھنا چاھئے جس کے ذریعے وہ ھر موضوع کے متعلق ایک صحیح اور دل چسپ نقطۂ نظر قائم کرلیتے ھیں - اس کے بعد اپنی واقفیت کو بڑھانے اور علم میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتے ھیں جن کا حوالہ ان کے اس نصاب میں موجود ھوتا ھے یا جن کو استاد تجویز کرتے ھیں - یا وہ خود اپنے شوق سے لائبریری سے کتابیں

لے کر پڑھتے ھیں - مگر ھمارے مدارس میں جس قسم کی درسی کتابیں بالعموم رائج ھیں وہ تعلیمی ترقی اور تعلیمی اصلاح کے راستے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ھیں - جب کبھی کسی نئے تعلیمی تجربے مثلاً طریق ڈالٹن کو رائج کرنے کا خیال پیدا ھوتا ھے تو اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ھے کہ اول تو کتابیں بہت کم ھیں اور جو ھیں وہ بہت ناقص اور نامناسب ھیں اور علاوہ اور بہت سی خرابیوں کے وہ اپنے موضوع کے معاشرتی پہلو کو نمایاں نہیں کرتیں - بیشک تاریخ ' یا جغرافیہ یا سائنس کے معاشرتی پہلو کو واضح کرنے میں طریقہ تعلیم و تحصیل کو بہت دخل ھے لیکن اگر درسی کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان علوم کی تمدنی قدر و قیمت پر روشنی پڑے تو معلم کے لئے تعلیم کی معاشرتی تنظیم آسان ھوجائے گی - مثال کے طور پر سائنس کو لیجئے - مدرسوں میں سائنس کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ھیں (اور بالعموم علاوہ استادوں کے پڑھائے ھوئے سبق کے طلبہ کا تمام دار و مدار ان میں سے کسی ایک پر ھوتا ھے) وہ ایسے خشک اور اصطلاحی انداز میں لکھی جاتی ھیں کہ پڑھنے والے کا ذھن سائنس کے معاشرتی پہلو کی طرف منتقل ھی نہیں ھوتا - حالانکہ جیسا ھم اوپر بیان کر چکے ھیں اس میں بے شمار امکانات موجود ھیں جن سے فائدہ اُٹھا کر ھم طلبہ کے معاشرتی احساس کو مستحکم کر سکتے ھیں مثلاً ھم مشہور سائنس دانوں کے سوانح حیات کو دل چسپ اور موثر طریقے پر پیش کرکے سائنس کے " انسانی " رخ پر روشنی ڈال سکتے ھیں - اُس طرح طلبہ کے دل میں بتدریج یہ احساس مستحکم ھوجائے گا کہ سائنس کی ترقی اور تدوین میں انسان کو مسلسل جد و جہد اور کاوش کرنی پڑی ھے اور اس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں

بہت سے ملکوں اور قوموں کی متحدہ کوشش کو دخل ہے - اگر سائنس
دان ایک دوسرے سے بے تعلق ہوکر کام کرتے اور خود غرضی کی بنا پر
اپنی اپنی تحقیقات کے نتائج کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھتے تو
سائنس ہرگز اس قدر ترقی نہ کر سکتی جتنی اس نے اب تک کی ہے -
سائنس اشتراک عمل کا یہ سبق بہت وضاحت اور خوبی کے ساتھ
سکھاتی ہے بشرطیکہ معلم کو اس بات کا احساس ہو اور درسی کتابوں
میں اس پر زور دیا جائے - لیکن کتنی درسی کتابیں ایسی ہیں جو
اس شرط کو پورا کرتی ہیں ؟ اسی طرح سائنس کے نصاب اور درسی کتب
میں اس بات کی توضیح کی ضرورت ہے کہ موجودہ صنعت و حرفت ،
زراعت اور تجارت ، حفظان صحت ، علاج امراض ، غرض نظام معاشرت
بیشتر آسائشوں اور سہولتوں کا دار و مدار سائنس پر ہے - طلبہ کو ہر ہر
قدم پر ان کے ذہنی استعداد اور قابلیت کے مطابق یہ بتانا چاہئے کہ
جو باتیں وہ سائنس کے نام سے پڑھ رہے ہیں وہ محض امتحان پاس کرنے
یا معلومات کا ذخیرہ بڑھانے کے لئے مفید نہیں بلکہ ان کی روز مرہ کی
زندگی میں کام آنے والی ہیں اور انہیں کی وساطت سے انسان نے اپنے
ماحول کو مسخر کیا ہے -

معاشرتی تنظیم کے اصول بعض مضامین میں بوجہ ان کی نوعیت
کے ، زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور بعض میں کم مثلاً تاریخ ، جغرافیہ ،
سائنس ، دستکاری وغیرہ میں ان کو زیادہ دخل حاصل ہے - لیکن اس
تحریک کا اثر کسی نہ کسی حد تک نصاب کے ہر شعبے پر پڑا ہے -
یہاں تک کہ ابتدائی تعلیم کے مروجہ " عناصر ثلاثہ " یعنی لکھنے پڑھنے
اور حساب کی تعلیم میں بھی آج کل یہی کوشش کی جارہی ہے کہ ان
کو بھی دل چسپ اجتماعی مشاغل کے طور پر سکھایا جائے نہ بطور فنی

مشقوں کے جو بچوں کو با دل نا خواستہ کرنا پڑتی ہیں - اس وجہ سے ریاضی کی جدید کتابوں میں سوالات ، مشقوں اور رسائل کے لئے بچوں کی معاشرتی زندگی اور تجربات سے مواد حاصل کیا جاتا ہے - ان سے بعید از قیاس اور مہمل سوالات حل نہیں کرائے جاتے جن کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بچے اس بہانے سے اعداد کے باہمی علاقوں کو سمجھیں - مثلاً جمع یا ضرب یا تقسیم سکھانے کے لئے چند بیلوں اور بکریوں کو چند مربع ایکڑ کے گھاس کے قطعے میں نہیں چھوڑا جاتا جہاں وہ مشین کی طرح ایک مقررہ رفتار سے مسلسل گھاس چرتے رہیں اور بیچارے بچوں کو یہ معلوم کرنا پڑے کہ کتنے دن میں وہ قطعہ بالکل صاف ہوجائے گا - اس کے بجائے وہ مسائل پیش کئے جاتے ہیں جو روز مرہ طلبہ کے تجربے اور مشاہدے میں آتے رہتے ہیں انہیں آئے دن ایسی ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً وہ کسی کھیل کے میدان کی پیمائش کرنا چاہتے ہیں یا مدرسے میں سیونگ بنک کھولنا چاہتے ہیں یا انہیں اپنا گھر بار کا حساب رکھنا پڑتا ہے یا بازار سے سودا خریدنا پڑتا ہے - اس قسم کے معاملات میں ہر طرح کے حسابی قاعدوں اور اصولوں کو سمجھانے کے لئے بے شمار مواقع ہیں - عقل مند معلم اور سمجھدار مصنف کا فرض ہے کہ وہ تمام خلاف قیاس باتوں کو نظر انداز کر کے ایسے معاملات کی طرف توجہ کرے جن میں طلبہ کو فطرتاً دل چسپی ہے اور ان کے ذریعے سے انہیں حساب سکھائے - علیٰ ہذالقیاس مدرسہ جدید میں لکھنا بطور ایک مخصوص فن کے نہیں سکھایا جاتا کہ طلبہ کو مدتوں حروف اور ان کے مرکبات کی مشق کرائی جائے جن کا مطلب یا منشا سمجھ میں نہیں آتا - بلکہ اس کے لئے اُس فطری خواہش سے محرک کا کام لیا جاتا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے مبادلہ خیالات کرنے پر

مجبور کرتی ہے - مثلاً ایک طالب علم اپنے کسی دوست یا عزیز کو خط لکھنا چاہتا ہے تاکہ اپنے مدرسے کے کھیلوں کا یا کسی اور دلچسپ شغل کا حال بیان کرے - لیکن وہ خط اُس وقت تک نہیں لکھہ سکتا جب تک وہ حروف کی شکلوں سے واقف نہ ہو اور ان کو ملا کر الفاظ کے نقش بنانے کی مشق نہ کرے - جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس فن کی معاشرتی غرض اور فوائد کو سمجھہ کر اسے سیکھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے - اسی طرح پڑھنے کو موجودہ طریقۂ تعلیم نے بجائے ایک ناگوار فرض کے ایک دل چسپ مشغلہ قرار دیا ہے جس کے ذریعے طالب علموں کو مل جل کر عالموں اور ادیبوں کے خیالات اور جذبات سے آگاہ ہونے اور لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے - اس لئے بچوں کے مطالعے کے لئے ایسا مواد فراہم کرنا چاہئے جو اعلیٰ درجے کی ادبی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے تمدنی معاملات اور مشاغل پر روشنی پڑتی ہو - اور اس کو ایسے طریقوں سے پیش کرنا چاہئے جن میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کی گنجائش ہو - اس اصول کی تفصیل کے لئے ادب اور زبان کے تعلیمی طریقوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ایک دانش مند معلم کس طرح پڑھنے کو ایک اجتماعی اور دلچسپ شغل بنا سکتا ہے -

اس بحث کا خاتمہ ہم پروفیسر بوڈ (Bode) کی مندرجہ ذیل عبارت پر کرتے ہیں جس میں انہوں نے وضاحت کے ساتھہ یہ سمجھایا ہے کہ نصاب کے مضامین کی تعلیم کس نقطۂ نظر سے دینی چاہئے تا کہ وہ زندگی کے معاشرتی مقاصد میں معین ہوں :—

" (لوگوں میں) صحیح قسم کے خیالات اور مقاصد پیدا کرنے لئے ہمیں کسی اصول ہدایت یا معاشرتی نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے - اس بات کو مد نظر رکھہ کر درسی

مضامین پڑھانے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاھئے ؟
ہر مضمون کو پڑھانے کے دو مختلف طریقے ہو سکتے ھیں - ایک طریقہ تو یہ ھے کہ ھم اس کی تعلیم اس طرح دیں گویا وہ ایک مخصوص اور جداگانہ چیز ھے جو اور تمام چیزوں سے بے تعلق ھے - اس صورت میں ھمارا مقصد یہی ھو سکتا ھے کہ اس خاص علم کے اندر جو معلومات قواعد ' اور قوانین ھیں اُن کو استعمال کرنے میں طلبہ کو مہارت اور دسترس حاصل ھوجائے - اس قسم کی تربیت کے ذریعے ھم ماھرین خصوصی یا عملی کاریگر تیار کر سکتے ھیں ' اور اگر طلبہ کی تربیت میں سختی کے ساتھہ اسي قاعدے کی پابندي کی جائے تو تعلیم محض کاریگری کے گُروں کا مجموعہ ھوکر رہ جائے گی - بر خلاف اس کے دوسرا طریقہ یہ ھے کہ ھم اس بات کو تسلیم کریں کہ نصاب کا ھر مضمون زندگی کے ساتھہ وابستہ ھے اور ھمارا مقصد یہ ھو کہ اس کا اور انسانی تجربے کا وسیع تر تعلق ظاھر کریں کہ اس اصول کی رو سے تعلیم کے فن کی نوعیت اور منشا بالکل مختلف ھو جاتا ھے - اگر ریاضی کو محض اعداد کے مجرد علاقے ظاھر کرنے کے لئے نہ پڑھایا جائے بلکہ اس کے ذریعے یہ بات طلبہ کے ذھن نشین کی جائے کہ ریاضی کا عملی معاملات سے کیا رشتہ ھے اور اس کا تعلق اُن بڑي بڑی عملی تحقیقات اور انکشافات سے کیا ھے جنھوں نے ھمارے تصور عالم میں انقلاب پیدا

کردیا ھے ' اگر ریاضی کي تعلیم اس طرح پر دی جائے
تو اس کی نوعیت محض فنی اور صوري نه رھیگی
بلکه طلبه کو اس سے دلی تعلق پیدا ھو جائے گا - جب
طلبه کے سامنے سائنس کو اس طرح پیش کیا جاتا ھے
که وہ جدو جہد کے اس مسلسل عمل کو سمجھه سکیں
جس کے ذریعے انسان نے فطرت کو مسخر کیا ھے اور توھمات'
تعصب اور تنگ نظری کی بندشوں سے رھائی پائی ھے
تو وہ محض عالم فطرت کی کہاني نہیں رھتی بلکه
ارتقائے انسانی کے زبر دست ڈراما کا قصه سناتی ھے -
جب تاریخ کے ذریعے یه حقیقت منکشف ھوتی ھے که
انسانوں نے کن مقاصد کي خاطر جنگیں کی ھیں اور
جانیں دي ھیں اور وہ تمام پیچ در پیچ اغراض وہ حالات
کیا تھے جن کی بنیاد پر موجودہ تمدن کی عمارت تعمیر
ھوئی ھے تو وہ ماضی کے گڑے مردے کی داستان نہیں
رھتی بلکه حال کے زندہ مسائل کی تفسیر بن جاتی ھے -
ھمارے تمدن کے جو عناصر ھمارے نصاب کا موضوع بن
گئے ھیں ان کو تخیل کے کرشمے سے اس طرح طالب علم
کے ذاتی تجربے کا جزو بنایا جا سکتا ھے که وہ قابلیت
اور سلیقے کے ساتھه ھر قسم کی انساني ضروریات اور
آرزؤں کو سمجھه سکے - اور ان تمام چیزوں کی قدرشناسی
کرے جو زندگی کو معنویت اور حسن کی بدولت سے
مالامال کرتی ھیں - جمہوری سوسائٹی میں تہذیب
کا صحیح مفہوم یہی ھے - تعلیم کا جمہوری نصب‌العین

یہ نہیں کہ ہر شخص کو کسی ایک کام کے قابل بنادیا
جائے بلکہ یہ ہے کہ ہر شخص زندگی سے پوری طرح
لطف اندوز ہو جس کا ترجمہ سیاست کی اصلاح میں
یہ ہوگا کہ فرد کو زندگی ' آزادی اور لطف و مسرت کا
حق حاصل ہو" - [۱]

مختصر یہ کہ نصاب کی تدوین اور درسی مضامین کی تنظیم و ربط کا مسئلہ تنگ اور اصلاحی معنی میں تعلیمی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق علوم کی ماہیت اور سوسائٹی کے تہذیب و تمدن اور فلسفہ زندگی سے ہے - اس میں ہمیں مختلف تمدنی اور نفسیاتی مسائل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے - ایک طرف تو تمدن کی اہم ترین ضروریات کا تجربہ کر کے دیکھنا چاہئے کہ کن مضامین اور علوم کا مطالعہ نئی نسل کے بچوں اور نو جوانوں کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے اور اس نقطہ نظر سے مروجہ نصاب میں ترمیم اور تبدیل کرتے رہنا چاہئے - دوسری طرف فطرت اطفال کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تا کہ ہمیں معلوم ہوجائے کہ ہم ان مضامین کو کس ترتیب اور اسلوب سے طلبہ کے سامنے پیش کریں کہ وہ ان کے روز مرہ کے تجربات کا جز و بن کر ان کی ذہنی تربیت میں معین ہوں - لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب معلموں کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ علوم کے باہمی تعلق کو پہچانیں اور ان سب کو انسانی زندگی کی تفسیر اور تشریح کا ذریعہ سمجھیں - نصاب خواہ کتناہی عمدہ ہو لیکن معلم اس غلط فہمی میں مبتلا رہینگے کہ ہر علم بجائے خود ایک مستقل چیز ہے جس کو نظری حیثیت سے حاصل کرنا طالب علم کا فرض ہے خواہ وہ اس کا

---

[۱] Modern Education Theories صفحہ ۲۱۳ -

مقصد اور مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے تو نہ درسی مضامین میں ربط قائم ہوگا نہ ان سے زندگی کے مسائل پر روشنی پڑیگی بلکہ تعلیم جیسی خشک اور بے جان ہے ویسی ہی رہیگی - یہ ظاہر ہے کہ مضامین نصاب کی اضافی قدر و قیمت کا انحصار ہر قوم اور ہر تمدن کے اپنے اپنے معیار قدار پر ہے لیکن انسانی اعراض و مقاصد اور تمدن کی ضروریات بہت کچھہ مشترک ہیں اور ہم نے اس باب میں جن علوم سے بحث کی ہے وہی ہر ملک میں نصاب کے اہم ترین عناصر سمجھے جاتے ہیں - لیکن اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئیے کہ نصاب کے مسئلے کا کوئی دائمی حل نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ہر نسل اور ہر زمانے میں از سر نو حل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور تعلیم کے متعلق نظری بحث کرنے والوں اور معلموں دونوں کا فرض ہے کہ وقتاً فوقتاً مدرسوں کے نصاب پر تنقیدی نظر ڈال کر اس میں حسب ضرورت ترمیم کرتے رہیں -

---

باب پنجم

" تربیت جسمانی "

تعلیم جدید نے مدرسوں میں جو مختلف تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم تبدیلی تربیت جسمانی کے نظریے کی ہے - اب یہ امر دو بارہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ انسان کی مکمل تربیت اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے جسم کی مناسب نگہداشت اور نشو و نما کا انتظام نہ کیا جائے اور اس کو ذہنی اور روحانی اعمال کے لئے ایک مستعد خادم اور مفید آلہ کار نہ بنایا جائے - ہم نے " دو بارہ " کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ تقریباً تمام ملک اور تمام تہذیبیں ایک ایسے دور سے گزر چکی ہیں جب جسم کی اہمیت پورے طور پر محسوس کی جاتی تھی اور اس کی پرداخت کا باقاعدہ انتظام ہوتا تھا - قدیم یونانی تعلیم میں تربیت جسمانی کو وہی اہمیت حاصل تھی جو عقلی اور اخلاقی تربیت کو - جمناسٹک (جسمانی ورزش) اور موسیقی یونانی نظام تعلیم کے دو اہم تریں عناصر شمار ہوتے تھے - یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک جسم کی مکمل اور ہم آہنگ نشو و نما نہ ہوگی انسانی سیرت میں پختگی نہیں آسکتی اور انسان اپنی قوتوں کو فعل میں نہیں لاسکتا - ارسطو کا یہ نظریہ تھا کہ انسان کی شخصیت ایک مکمل وحدت ہے جس کے دو پہلو ہیں ، جسم اور دماغ ، اور ان دونوں کی تربیت ہم آہنگ ہونی چاہئے - اسی وجہ سے یونانیوں نے جسمانی تربیت کو بھی ایک فن لطیف بنا دیا تھا اور ان کی نظر میں ایک مریض یا کمزور ، یا بے ڈھنگے قسم کا آدمی بھی اتنا ہی ذلیل تھا جیسا ایک جاہل اور بے وقوف آدمی ! قدیم روما میں بھی

جسمانی تربیت کی اهمیت تسلیم کی جاتی تهی لیکن رومیوں کے یہاں ' خاص ملکي حالات کی وجه سے اس کا مقصد کچهه اور هو گیا تها یعنی وہ عام انسانی تربیت کا جزو نہیں سمجهی جاتی تهی بلکه تندرست شہریوں کو کامیاب اور جنگ جو سپاهی بنانے کا ذریعه بن گئی تهی - قدیم هندو تہذیب میں ایک حد تک تربیت جسمانی کی ضرورت کا احساس موجود تها چنانچه چهتریوں کے لئے جسمانی اور فوجی ورزش لازمی قرار دي گئي تهی - لیکن ان کے یہاں سوسائٹی مختلف طبقوں میں تقسیم تهی اور هر ایک طبقے کے لئے جداگانه تربیت تجویز کی گئی تهی یعنی برهمنوں کے لئے مذهبي اور ذهني ' چهتریوں کے لئے جسمانی اور فوجی تربیت ' اور ویشوں کے لئے کار و باری - اس نظام تعلیم میں اگر صریحاً نہیں تو ضمناً ' جسم اور دماغ کا وہ تناقض تسلیم کیا گیا هے جس کو موجودہ نظریه تعلیم نے مسترد کر دیا هے - قرون وسطیٰ میں ' جب یورپ میں نظام جاگیر داری کا زور تها تو وهاں بهی اسي قسم کی تقسیم رائج تهي - ایک طرف تو روحانی ریاضت کرنے والے راهبوں کي تعلیم تهی جس میں نه صرف جسمانی تربیت کو نظرانداز کیا جاتا تها بلکه جسمانی خواهشات اور ضروریات کو بهی دبانے کی کوشش هوتی تهی اور کم سے کم اصولاً پوری توجه دماغی اور روحانی تربیت پر صرف کی جاتی تهی - دوسري طرف جنگ جو سورماؤں کي تعلیم تهی جس میں ذهنی تربیت کو تقریباً بالکل نظر انداز کرکے سارا وقت جسمانی تربیت اور فوجی ورزشوں میں صرف هوتا تها - اسلامی تہذیب میں ابتدا هي سے جسمانی تربیت کی اهمیت ایک مسلمه امر سمجهی گئی - اول تو اسلام کي نشو و نما ایک ایسے مخالف ماحول میں هوئی تهی که مسلمانوں کو شروع هي سے اپنے بقائے حیات کے لئے جنگ و جدل کرنی پڑی جس کی خاطر ان کو فنون جنگ سے واقف هونا اور اپني

جسمانی طاقت کو قائم رکھنا ضروری تھا - دوسرے مذہب کی حیثیت سے بھی اسلام روح اور جسم کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا معین اور شریک کار سمجھتا ہے - چنانچہ جب تک اسلامی تہذیب کے عروج کا زمانہ رہا ، مسلمانوں نے کبھی جسمانی تربیت کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا - البتہ جب زوال کا دور آیا اور تعلیم تنگ خیال مذہبی گروہ کے ہاتھہ میں آگئی تو اس نے جسم اور روح کے قدیم تناقض کو دوبارہ زندہ کیا اور لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ انہیں جسم کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے کیونکہ وہ نفسانی خواہشات کا گھر ہے اور روحانی ترقی کے راستے میں حارج ہے - لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں عہد مغلیہ کے آخر تک شرفا کے طبقے میں بہت سی صحت افزا ورزشیں اور کھیل مروج تھے مثلاً کشتی ' پھری گتکا ' مگدر ' شمشیر زنی اور نیزہ بازی - ان میں لوگ بہت خوشی کے ساتھہ شریک ہوتے تھے اور انہیں اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے - مگر جب تنزل انتہا کو پہنچ گیا تو درباریوں اور اُمرا اور ان کی دیکھا دیکھی عام لوگوں نے بھی ان مردانہ ورزشوں کو ترک کرکے مرغ بازی ' بٹیر بازی ' اور پتنگ بازی کو اپنا مشغلہ تفریح بنا لیا - جس وقت مغربی تعلیم کا ہندوستان میں رواج ہوا ہے اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مذہبی جماعتوں اور علما نے تعلیم کو محض مذہبی علوم تک محدود کردیا تھا اور جسمانی تربیت کی طرف سے نہ صرف بے پروا بلکہ اس کے مخالف تھے اور علم طور پر مردانہ ورزشوں اور کھیلوں کا رواج اٹھہ چکا تھا اور اس قسم کا " لہو و لعب " رائج ہوگیا تھا جو صریحاً زوال پسندی کی علامت ہے - اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی لوگوں کی بالخصوص شہر میں رہنے والوں کی صحت اور جسمانی حالت خراب ہونی شروع ہوئی اور اس کا کوئی بر وقت تدارک نہیں ہوسکا -

مغربی ممالک میں بھی بعض حالات کی وجہ سے گذشتہ صدی میں یہی صورت پیش آئی تھي اور عام لوگوں کي جسماني صحت بہت خراب ہونی شروع ہوگئی تھي - اگر اس خرابی کو دور کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو وہاں کي حالت ہندوستان سے بھی بدتر ہوتی - ہمارے لئے ان حالات کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ اس سے ہمارے اپنے مسائل پر روشنی پڑتی ہے - انگلستان میں مثل دوسرے ممالک کے صنعت و حرفت کے لئے نظام نے عوام کي زندگی پر بہت انقلاب آفریں اثر ڈالا تھا جیسا ہم باب چہارم (حصہ اول) میں بتا چکے ہیں اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے وہ حالات بالکل بدل گئے ہیں جن میں مزدور پہلے کام کرتے تھے - زراعت اور کاشتکاری کو چھوڑ کر بیشتر لوگوں نے کارخانوں اور صنعت و حرفت کے بڑے بڑے مرکزوں میں کام کرنا شروع کردیا - صفائی اور آب و ہوا کے لحاظ سے ان کا یہ ماحول نہایت ہی مضر بلکہ مہلک تھا اور اس میں ان کی تندرستی کسي طرح قائم نہیں رہ سکتي تھی - بجائے کھلی ہوا اور فطرت کے صحت افزا ماحول میں کام کرنے کے وہ تمام دن اور بعض اوقات تمام رات تنگ و تاریک مکان اور کوٹھریوں میں بند رہتے تھے پھر کام کی نوعیت بھی ایسی تھی جو ان کی جسمانی صحت ، ان کے اعصاب اور نظر بلکہ ان کی دماغی صحت کے لئے بھی مضر ثابت ہوتی تھی - اس پر طرہ یہ کہ عورتیں اور نو عمر بچے بھی اسی مصیبت میں گرفتار تھے اور اس طرح نئی نسلوں کی صحت خراب ہوتی جاتی تھی - اس انقلاب کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ لوگ بجائے دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے کے بڑے بڑے صنعتی علاقوں میں آکر بس گئے اور وہاں آبادي کا اس قدر ہجوم ہوا کہ لوگوں کو رہنے کے لئے مناسب مکانات نہیں ملتے تھے - اس کا اثر عام

صحت اور اخلاقی حالت پر بہت برا پڑا - بقول کرشن سٹائنر (Kerschensteiner) کے :—

" اس زمانے کے شہروں میں ہزاروں ، لاکھوں آدمی نہ صرف فطرت کی پر اسرار زندگی سے ناواقف اور بے تعلق رہتے ہیں بلکہ ان کی جسمانی صحت اور طاقت اور اخلاقی قوت ضبط بھی زائل ہوجاتی ہے " [۱]

ابتدا میں لوگ صنعت و حرفت کے نئے کمالات اور مادری ترقی سے اس قدر مرعوب اور مسحور تھے کہ انہوں نے اس کے تباہ کن نتائج کی مطلق پرواہ نہ کی لیکن رفتہ رفتہ اس کے مجموعی اثرات اس قدر بڑھے کہ لوگوں کو ادھر توجہ کرنی پڑی - خصوصاً جس زمانے میں فوجی حکام بوئروں کی جنگ کے لئے والنٹیر بھرتی کر رہے تھے انہیں یہ اندازہ ہوا کہ قوم کی صحت اور جسمانی طاقت بالکل تباہ ہوگئی ہے [۲] اس صدی کے آغاز میں ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ وہ تربیت جسمانی کے مسئلہ پر غور کرکے اپنی تجاویز پیش کرے - اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس امر پر زور دیا کہ قومی صحت اور قوت کے قیام کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ مدرسوں میں بچوں کی تربیت جسمانی کا مناسب انتظام کیا جائے اور یہ رائے دی کہ بچوں کے طبی معائنے اور علاج کا اہتمام نہایت ضروری ہے - طبی معائنے کا انتظام کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ انگلستان کے مدرسوں میں اب بہت سی وہ بیماریاں نہیں پائی جاتیں جو پہلے بچوں میں بہت عام تھیں اور ان کی جسمانی اور دماغی تربیت میں حائل ہوتی تھیں ، مثلاً آنکھ کان ناک اور گلے کی بیماریاں -

---

[۱] Schools and the Nation -

[۲] Mackenzie ; Problems of National Education -

اول تو عام حالات کی درستی کی وجہ سے یہ بیماریاں پیدا ھی کم ھوتی ھیں اور جب ھوتی بھی ھیں تو ان کی طرف فوراً توجہ کی جاتی ھے - لیکن تعلیمی حکام نے محض اس طبی اھتمام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حفظ ماتقدم کو علاج سے بہتر سمجھہ کر اور بہت سے ایسے وسائل اختیار کئے جن کے ذریعے بچوں کی صحت بہتر ھوسکے اور ان کی جسمانی نشو و نما میں کوئی رکاوٹیں حائل نہ ھونے پائیں - چنانچہ رفتہ رفتہ نظام مدارس میں حفظان صحت کا اھتمام شامل کیا گیا - ملک میں جا بجا بچوں کے شفاخانے قائم کئے گئے ' نادار طلبہ کی خوراک کا انتظام کیا گیا ' کھیلوں اور ورزشوں کے لئے میدان مہیا کئے گئے ' چھوتے بچوں کے لئے تربیت گاھیں اور مریضوں کے لئے کھلی ھوا کے مدرسے قائم کئے گئے جن میں دستکاری ورزش اور صحت افزا مشاغل کو کتابی تعلیم کی نسبت بہت زیادہ اھمیت دی جاتی ھے - ۱۹۱۸ع کے تعلیمی ایکٹ میں ' جو فشر ایکٹ (Fisher Act) کے نام سے موسوم ھے اور جس کو انگلستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک معرکۃالارا حیثیت حاصل ھے ' ان سب چیزوں کی ضرورت کو صراحت کے ساتھہ تسلیم کیا گیا ھے اور اگرچہ مالی مشکلات کی وجہ سے تمام تجاویز پر فراخ دلی کے ساتھہ عمل نہیں ھو سکا لیکن حکومت اور پبلک کی متفقہ کوششوں کا یہ نتیجہ ھے کہ انگلستان کی نئی نسلوں کی صحت گزشتہ صدی کی نسبت کہیں بہتر ھوگئی ھے - اس کا ایک نہایت قطعی اور بین ثبوت اس بات سے ملتا ھے کہ جب ۱۹۲۵ع میں لنڈن کاونٹی کاؤنسل کی تحریک پر وھاں کے تمام ابتدائی مدارس کے طلبہ کا طبی معائنہ کیا گیا اور ان کی جسمانی صحت یعنی وزن ' قد ' حواس خمسہ اور عام صحت کے متعلق اعداد وشمار فراھم کئے گئے تو معلوم ھوا کہ اوسطاً ھر لحاظ سے ۱۹۲۵ع میں

طلبہ کي صحت ۱۹۱۴ ع کے مقابلے میں بہتر ہے حالانکہ اس دس سال
کے عرصہ میں ملک جنگ یورپ کے خوفناک دور سے بھي گذر چکا تھا
جس میں بعض اوقات غریبوں کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا اور کھلي
ہوا میں کھیلنا بھي نصیب نہیں ہوتا تھا - اس جسماني ترقي کا سہرا
صرف مدرسوں ہي کے سر نہیں ' کیونکہ اس میں حکومت کے قوانین
حفظ صحت کو اور کارخانوں وغیرہ کے ماحول کي درستي کو بھی بہت
دخل ہے ' لیکن اس میں شک نہیں کہ مدرسوں میں علمی اور فعالي
تعلیم کے اثر سے ' کھیلوں پر زور دینے اور بچوں کو کھلی ہوا میں رکھنے
کی وجہ سے اور جسمانی امراض اور کمزوریوں کی مناسب نگہداشت اور
روک تھام کی بدولت انگریزوں نے باوجود صنعت و حرفت کے ناساز
ماحول کے اپنی قوم کی جسمانی حالت کو نہ صرف سنبھال لیا ہے
بلکہ اس میں برابر ترقی ہو رہی ہے اور یہی حال کم و بیش دوسری
مغربی قوموں اور جاپان کا ہے جنھوں نے جسمانی تربیت کی اہمیت
کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کے لئے مناسب تدبیریں اور ذرائع اختیار
کئے ہیں جرمني میں جنگ یورپ کے بعد ہمارے دیکھتے دیکھتے اس خاص
شعبے میں بڑا انقلاب ہوگیا ہے اور جرمنوں نے فوجي تعلیم کے بجائے جس
کی انھیں ممانعت ہوگئی تھی ' اپنے مدرسوں میں کھیل ' ورزش سیر
و سفر اور کھلی ہوا میں رہائش کو اس قدر رواج دیا کہ باوجود تمام
مشکلات کے بچوں کی صحت خراب نہیں ہونے پائی بلکہ باقاعدہ
علاج اور صحت افزا مقامات میں رہنے کی بدولت ان بچوں کو
جو جنگ کے زمانے میں مفلسی اور ناداری کی وجہ سے اپنی
صحت اور تندرستی بالکل کھوچکے تھے ' گویا نئی زندگی حاصل
ہوگئی -

لیکن اسی زمانے میں جب دوسرے ملکوں میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے ہمارے ملک میں لوگوں کی صحت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے - اس کی طرف نہ تو پبلک نے کماحقہ توجہ کی ہے نہ حکومت نے - اور اسی وجہ سے اس شدید خطرے کے تدارک کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا - ہمارے سامنے کسی تعلیمی کمیشن کی تحقیقات کے نتائج اور اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن سے یہ بات ثابت کی جاسکے کہ قوم کی جسمانی حالت کیا ہے - لیکن تجربے اور مشاہدے کی شہادت اور باخبر اشخاص کی رائے اس بارہ میں اس قدر واضح ہے کہ ہمیں اعداد و شمار کی ضرورت نہیں - اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی تک صنعت و حرفت کے مضر نتائج اس حد تک ظاہر نہیں ہوئے جس حد تک مغرب میں ہوئے ہیں اور اب بھی ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ گاؤں اور دیہات میں رہتا ہے اور کاشتکاری وغیرہ میں مصروف ہے - لیکن قومی صحت کا زوال برابر جاری ہے - دیہاتوں کی صحت کی خرابی کی وجہ زیادہ تر ان کی جہالت اور ان کے طریقہ بود و باش کی گندگی ہے جس کی بدولت ان میں آئے دن بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں اور بچوں کی صحت بالعموم خراب رہتی ہے - لیکن شہریوں اور بالعموم تعلیم یافتہ طبقے کی خرابی صحت کی ذمہ داری مدرسوں پر بھی عائد ہوتی ہے - بالعموم جو طلبہ ہائی اسکول یا کالج سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں ان کی صحت بالکل خراب ہو جاتی ہے - زرد رنگ ، دھنسی ہوئی آنکھیں ، وقت سے پہلے ضعیفی کے آثار ، بدن میں خون کی کمی ، پست ہمتی ، افسردہ دلی ، محنت اور ہاتھہ کا کام کرنے سے جی چرانا ، زندگی کے معرکوں میں شریک ہونے سے تامل ، یہ تمام باتیں آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں - بنگال کے طلبہ کے متعلق سیڈلر کمیشن کو یہی شکایت تھی - جسمانی نشو و نما کے معطل ہوجانے

سے قومی سیرت اور ذهانت پر جو تباہ کن اثر پڑا ہے اس کا پورا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قوت برداشت ' اور قوت حیات جس کو برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) انسانی سیرت کا جزو لازم قرار دیتا ہے هندوستانیوں میں بہت کم هوگئی ہے اور اُن میں یہ صلاحیت باقی نہیں رهی کہ وہ بڑے بڑے کاموں کو همت اور حوصلے کے ساتھہ کریں اور ان کے راستے میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی اور مستعدی کے ساتھہ برداشت کریں - موجودہ زندگی جد و جہد اور جفا کشی کی طالب ہے اور اس میں کامیابی کے لئے حوصلہ اور استقلال شرط ہے - ان تمام صفات کی تربیت کا ایک اهم جزو جسمانی نشو و نما اور صحت ہے - اگر لوگوں کی صحت عام طور پر خراب هوگی یا اُن میں جسمانی طاقت نہ هوگی تو وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور اُن کے سامنے همت هار دیں گے - ممکن ہے کوئی شخص اپنی قوت ارادی کو اس قدر مضبوط ' اپنے عزم کو اس قدر راسخ بنالے کہ باوجود جسم کی کمزوری کے وہ اپنے مقاصد کی تحصیل میں لگا رہے - لیکن ایسا صرف خاص خاص اور مستثنیٰ صورتوں میں هوسکتا ہے ' عام لوگوں کے لئے جسمانی تربیت ناگزیر ہے -

هم نے تعلیم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی رو سے معلم کو صرف بچوں کی دماغی نشو و نما هی سے سروکار نہیں بلکہ اسے ان کی پوری شخصیت کی تربیت کرنی ہے جس میں جسم اور دماغ اور روح سب شامل هیں کیونکہ ان سب کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے بلکہ یہ کہنا چاهئے کہ وہ انسان کی هستی کے ' جس میں وحدت کی کارفرمائی ہے ' مختلف رخ یا پہلو هیں - لہذا تربیت کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان کے جسم کی تربیت الگ کی جائے اور

اس کے دماغ کی الگ اور اس کی روحانی تسکین کے ذرائع علیحدہ فراہم کئے جائیں - یہ تو گویا تین جدا گانہ مسئلے ہوجائیں گے - تربیت کا مسئلہ ایک ہے اور اس کو علحدہ علحدہ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - وہ مسئلہ یہ ہے کہ مدرسے میں اور معاشری دنیا میں ایسے انتظامات کئے جائیں کہ ایک ہی وقت میں بچے کے جسم اور دماغ اور روح کي تربیت ہو یا یوں کہنا چاہئے ان میں سے ہر ایک کي تربیت دوسروں کی تربیت میں معین ہو ' رکاوٹ پیدا نہ کرے - اس وجہ سے معلم کے لئے جسم اور دماغ کے صحیح تعلق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ انسانی تربیت کے متعلق کوئی صحیح تصور یا نظریہ قائم نہیں کرسکتا اور نہ درسی مشاغل کی صحیح تنظیم کرسکتا ہے - مدرسین اور ماہرین تعلیم دونوں نے عرصے تک اس تعلق کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جسم ایک حد تک دماغی تربیت کے راستے میں حائل ہے - اس کا اثر مدرسے کی تعلیم پر بہت برا پڑا - اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی تربیت کے طرف سے غفلت برتی گئي بلکہ درسی اور دماغی تعلیم بھی بہت ناقص اور ناکامیاب رہی ' کیونکہ انہوں نے علم حاصل کرنے کو محض ایک دماغی یا ذہني فعل سمجھہ لیا جس کا جسمانی افعال سے کوئی تعلق نہیں - وہ "علم" کو ایک خاص منطقی تربیت کے ساتھہ ' کتابوں اور سبقوں کي شکل میں ' طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے جو ان کے خیال میں کسی نا معلوم دماغی عمل کے ذریعہ اس کو "حاصل" کرلیتے تھے - واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ اس "تحصیل" میں کسي طرح کامیاب بھي ہوجاتے تھے تو محض اس حد تک کہ وہ تمام معلومات کو یک انفعالی طریقے پر اپنے حافظے میں جمع کرلیتے تھے - اس تحصیل

کے دوران میں کوئی حقیقی " تجربات " حاصل نہیں ہوتے تھے جو ان کے افعال و کردار پر مستقل اثر ڈالیں - وہ جسمانی اعمال کی اہمیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ان کو یہی خیال تھا کہ دماغ ایک مستقل اور قائم بالذات چیز ہے جو عقل اور علم کا گھر ہے اور اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں - اور جسم ایک مادی چیز ہے جو اکثر علم اور معرفت حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے - اس خیال کا عملی اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ اُستاد ہمیشہ طلبہ کو تنبیہ کرتے رہتے کہ وہ مدرسے میں کوئی شور و غل نہ کریں ' بلکہ آواز بھی نہ نکالیں - بالکل خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے رہیں - یہاں تک کہ اُستاد کی صورت پر آنکھیں جمائے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہنا توجہ اور انہماک کی علامت سمجھا جاتا تھا - لیکن یہ اصول تعلیم بچوں کے جبلی رجحانات کے بالکل خلاف ہے - کیونکہ جب بچہ مدرسے میں آتا ہے تو اپنا جسم اپنے ساتھ لاتا ہے اور اسے کام کرنے ' نقل و حرکت کرنے ' چیزوں کے توڑنے اور بنانے کی خواہش ہوتی ہے - لیکن مدرسوں کا معمول یہ چاہتا ہے کہ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہہ پر بیٹھا لکھتا پڑھتا رہے - اس لئے بچے کے نفس میں ہر وقت ایک کشمکش رہتی ہے - اس کی فطرت میں ولولۂ عمل اور اظہار خودی کی خواہش ہوتی ہے اور اُستاد یہ چاہتے ہیں کہ وہ اسے دبا کر رکھیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے مقررہ کام پر پوری توجہ نہیں کرتا - اس کا دماغ پریشان اور منتشر رہتا ہے اور اس میں انہماک کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی - یہ صورت حال سب بچوں کے لئے مضر ہے ' کیونکہ جو ان میں سے فطرتاً زیادہ تیز اور چلبلے ہوتے ہیں وہ اکثر اس خلاف فطرت ضبط سے گھبرا کر موقع پاتے ہی اپنی خواہش عمل کا اظہار ایسی شرارتوں میں کرتے

هیں جن کي وجه فرض شناس اُستادونکي سمجهه میں نہیں آتي - رهے وہ بچے جن کي طبیعت مقابلتاً سکون پسند اور خاموش هوتي هے وہ اس جمود اور انفعالیت کے اس قدر عادی هو جاتے هیں که ان کا ولولۂ عمل هی پژمردہ هوجاتا هے اور وہ کوئي هاتهه کا کام یا جسمانی فعل اعتماد اور خوش اسلوبي کے ساتهه نہیں کرسکتے - حقیقت یه هے که تعلیم کا سر چشمه نه کتاب هے ' نه درسي اسباق ' نه مرتب علوم بلکه وہ ذاتي اور فعالی تجربات هیں جو هم اپنی زندگی کے دوران میں حاصل کرتے هیں اور جن میں جسم اور دماغ دونوں کی بیک وقت ضرورت هوتي هے - تجربے سے هماری مراد هے کوئی ایسا کام جس کا هم پر ایک خاص اثر هو اور هم اس اثر کو قبول کریں اور اس کي وجه سے همارے رویے اور اعمال میں کوئی ترمیم یا تبدیلي هوجائے - اس کي وضاحت ایک معمولي سی مثال سے هوسکتي هے - اگر کسی بچه کي اُنگلی میں ایک کانٹا چبه جاتا هے تو اسے تکلیف محسوس هوتي هے - یه تکلیف یا تکلیف دہ " تجربه " اس کے علم اور عمل دونوں کو مستقل طور پر متاثر کرتا هے - آئندہ جب کبهي وہ اس قسم کے کانٹے کو دیکهے گا تو اس کی جانب اس کا رویه پهلے کي طرح بے پروائی کا نه هوگا بلکه اس کی نظر میں کانٹے میں ایک نئی اهمیت اور نئے معنی پیدا هو جائیں گے - اس طرح اسے جس قدر مختلف تجربات کانٹوں کے متعلق هونگے اسي قدر وہ ان کے خواص اور اثرات کو بهتر سمجهے گا اور اس کا یه حقیقي علم اس کے رویه پر اثر ڈالے گا - جب هم کهتے هیں که تجربه بهترین معلم هے تو اس سے یه مراد هوتی هے که اس کے ذریعے همیں اپنے افعال اور ان کے نتائج کا تعلق سمجهه میں آجاتا هے - جب هم کسي طرح اپنے ماحول پر کوئی عمل کرتے هیں تو ماحول کي طرف سے هم پر

اس کا رد عمل ہوتا ہے جس کا نتیجہ ہمارے دماغ میں محفوظ رہتا ہے اور اس طرح ہم نئی باتیں اور نئے کام سیکھتے ہیں - پس معلوم ہوا کہ تجربہ محض ذہنی یا دماغی چیز نہیں بلکہ جسم اور دماغ دونوں کو اس میں برابر کا دخل ہے - یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ تجربہ مثل ایک نقش کے ہے جو خارجی ماحول ہمارے دماغ پر براہ راست ، بغیر جسمانی افعال کے واسطے کے ، ثبت کردیتا ہے - تجربے کے لئے ہمیشہ یہ شرط ہے کہ ہم کسی مقصد کو پیش نظر رکھہ کر اپنے ماحول کی اشیا کے ذریعے کوئی کام کریں - اس عمل میں دماغ ہمارے جسمانی افعال کی رہنمائی کرتا ہے اس کو انجام دینے میں ہمیں ماحول کی مزاحمت اور اشیا کے قدرتی خواص سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کا رد عمل ہمارے جسم اور دماغ دونوں پر ہوتا ہے - اس رد عمل کا نام تجربہ ہے - اس کی مثال ایک بڑھئی کے کام سے مل سکتی ہے مثلاً وہ ایک کرسی تیار کرنے کے لئے لکڑی کاٹتا ہے ، اس کو صاف کرتا ہے ، اپنے اوزاروں کے ذریعے مناسب شکل کے ٹکڑے کاٹتا ہے ؛ ان کو جوڑتا ہے اور اپنی تیار کی ہوئی کرسی کا مقابلہ کرسی کے ذہنی تصور یا نمونے کی کرسی کے ساتھہ کر کے اس میں ترمیم یا تبدیلی کرتا ہے - اس تمام سلسلۂ افعال میں اسے مفید تجربات حاصل ہوتے ہیں جن کی تحصیل میں جسم اور دماغ دونوں شریک ہیں - اس طرح اس کو لکڑی کے خواص کا جو علم ہوتا ہے وہ بے جان اور بیکار نہیں ہوتا جس کو وہ استعمال نہ کرسکے بلکہ اس کے ذریعے وہ اوزاروں سے کام لینے میں زیادہ ماہر ہوجاتا ہے ، آئندہ کرسیاں بنانے میں اُسے زیادہ سہولت ہوتی ہے اور اس کی سمجھہ میں اضافہ ہوتا ہے - کس قدر کمزور اور بے فیض ہے اس کے مقابلے میں وہ علم جو ایک بچہ مدرسے میں " اسباق اشیا " (Object lessons) کے ذریعے حاصل کرتا ہے !

لہذا ہم جسمانی تربیت کے متعلق کوئی ایسا نظریہ قائم نہیں کرسکتے جس کا تعلق محض جسم کی تربیت سے ہو بلکہ ہمیں قدیم یونانی عقیدے کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جس کے مطابق جسم کی موزوں تربیت عقلی اور روحانی تربیت کے لئے لازم ہے - اس خیال کو حال کی تحقیقات سے بہت تقویت پہنچتی ہے اور نفسیات اور علم‌الاجسام دونوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نفسی اور جسمانی اعمال کا ایک دوسرے سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ہے - اِس بحث کی تفصیل کی گنجایش نہیں - یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہے کہ نفسی اعمال کا انحصار بڑی حد تک جسم کے اُس حصے سے ہے جس کو دماغ کہتے ہیں اور یہ دماغ نظام اعصاب کے ذریعے باقی تمام جسم کی حرکات اور اعمال پر کچھہ اس طرح حاوی ہے جس طرح بجلی گھر کا بٹن تختہ شہر کی تمام روشنی پر حاوی ہوتا ہے - اگر نظام اعصاب کی مناسب اور موزوں تربیت نہ کی جائے گی تو دماغ جسمانی حرکات کی نگرانی بہ خوبی نہیں کرسکتا - دماغ کا کام یہ ہے کہ وہ جسمانی افعال اور ان محرکات کے درمیان رابطہ قائم کرے جو حواس کے ذریعے ماحول سے حاصل ہوتے ہیں - مثلاً ہم سڑک پر جارہے ہیں کہ سامنے سے ہمیں ایک موٹر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - ہماری قوت باصرہ موٹر کی شکل کو جو ماحول کا ایک جزو ہے محرک عمل بنا کر نظام اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچاتی ہے - وہاں سے دماغ ہمارے اعضا کو (اس خاص موقع پر پیروں کو) یہ حکم بھیجتا ہے کہ وہ ہمیں موٹر کے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کردیں - اگر جسم اور ذہن کے درمیان دماغ کا واسطہ نہ ہوتا تو ہمارے افعال و اعمال اور ماحول کے درمیان وہ تعلق ہر گز قائم نہ ہوسکتا جس کی وجہ سے ایک طرف ہم ماحول پر قابو حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے افعال کو منظم کرتے ہیں - اس کی توضیح کسی دستکاری کے

ذریعے ہو سکتی ہے - فرض کیجئے ایک طالب علم کسی لکڑی کے ٹکڑے کا ایک قلم دان بنانا چاہتا ہے - وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے پہلے لکڑی کاٹتا ہے - اس کو چھیل کر ہموار کرتا ہے ' پھر مختلف شکلوں اور لمبائی کے ٹکڑے کاٹ کر ان کو جوڑتا ہے - اس شکل کے دوران میں دماغ برابر افعال و حرکات کے درمیان واسطے کا کام دیتا ہے - ہر ہر قدم پر حواس کے مشاہدات اور تاثرات کی مدد سے وہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ اب لکڑی کس حالت میں ہے اور اس کے ساتھہ کیا کرنا چاہئے - اس علم کی بنا پر وہ آگے بڑھتا ہے اور مختلف اوزاروں کو استعمال کر کے لکڑی کی شکل بدلتا ہے - ساتھہ ہی وہ اپنے افعال سے لکڑي میں جو تبدیلیاں کرتا ہے ان کی وجہ سے حواس کے مشاہدات بھی بدلتے جاتے ہیں - پہلے لکڑی کھردری تھی ' اب ہموار ہوگئی - پہلے ٹکڑا لمبا تھا اب گول ہوگیا ہے وغیرہ - ان نئے مشاہدات کے مطابق وہ آگے بڑھتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے افعال میں تسلسل قائم رکھنا اور ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کرنا دماغ کا کام ہے جس کو وہ اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جب ایک طرف نظام اعصاب کی صحیح تربیت کی جائے - کیوں کے اسی کے ذریعے ماحول کي خبریں حواس کی وساطت سے دماغ تک اور دماغ کے احکام اعضائے جسمانی تک پہنچتے ہیں ' اور دوسری طرف دماغ کو ایسے مواقع ملتے رہیں کہ وہ جسمانی افعال کی نگرانی اور نگہداشت کر سکے - جو لوگ بچپن اور نوجوانی میں کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے ' کسي قسم کی دستکاری یا عملی مشاغل میں شریک نہیں ہوتے وہ بڑے ہوکر نہ صرف جسمانی حیثیت سے " بے دست و پا " ہو کر رہ جاتے ہیں بلکہ اکثر عملي معاملات اور کارو بار میں ' جو دنیاوی زندگی کا جز و اعظم ہیں ' ان کا دماغ بھي اچھی طرح کام نہیں دیتا خواہ وہ کتنے ہی عالم اور پڑھے

لکھے کیوں نہ ہوں - اس وجہ سے زمانہ حال کے تعلیمی مفکرین " علم " اور " عمل ' جسم اور دماغ جاننے اور کرنے کے باھمی تعلق کو تسلیم کرتے ھیں اور مدرسوں کی تعلیم میں ایسے مشاغل کو نمایاں اھمیت دیتے ھیں جن میں جسم اور دماغ کی نشو و نما ساتھہ ساتھہ اور هم آھنگ طریقے سے ھو سکے -

تربیت جسمانی کے وسیع تر مفہوم میں انسانی حواس کی تربیت بھی شامل ھے اور جیسا هم اوپر بتا چکے ھیں حواس کی صحیح تربیت کے بغیر دماغی تربیت ناقص رہ جاتی ھے - ھمارے مروجہ مدارس میں بھی ' باوجود اس بات کے کہ تعلیم بالکل انفعالی طریقہ پر دیجاتی ھے ' طلبہ کو اپنے حواس سے کام لینا پڑتا ھے مثلاً معمولی درسی کاموں میں آنکھہ اور ناک دونوں هر وقت کام آتے ھیں اور لکھنے میں ڈرائنگ اور نقشہ کشی میں ' دست کاری میں ھاتھہ کو استعمال کرنا پڑتا ھے - لیکن مدرسے کا کام جن اصولوں پر منتظم ھے ان کی وجہ سے ان حواس کی تربیت بھی مناسب طریقے پر نہیں ھوتی کیونکہ طلبہ ان کو اپنے پسند کئے ھوئے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے دماغ کی نگرانی اور ھدایت میں استعمال نہیں کرتے - استاد اس غلط فہمی میں مبتلا ھیں کہ مختلف حواس گویا علم کو دماغ تک پہنچانے کی نالیاں ھیں - علم کتاب میں موجود ھے اور آنکھہ کے ذریعے طالب علم کے دماغ میں پہنچ جاتا ھے - یا وہ الفاظ میں پوشیدہ ھے اور کان کے ذریعے ان کے ذھن میں سرایت کرجاتا ھے - هم نے علم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ھے وہ اس خیال کے بالکل خلاف ھے - علم اس طریقہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا جس طرح کوئی پیاسا آدمی نل کی ٹوٹی کھول کر اس میں جمع کیا ھوا پانی پی لیتا ھے - بلکہ اس کو اپنے جسم اور دماغ کی

محنت اور کاوش کے ذریعے زمین سے کھود کر نکالنا پڑتا ھے - کبیر نے اپنے ایک دوھے میں بڑی پتے کی بات کہی ھے جو سارے اصول تعلیم کا نچوڑ ھے :—

پد جو رَے ' ساکھی کہے
سادھن یری گئی آوس
کاڑھا جل پیوے نہیں '
کاڑھہ پین کی ھوس

(پد جوڑتا ھے ' ساکھی کہتا ھے ' اس کی عادت پڑ گئی ھے ' بھرا ھوا پانی نہیں پیتا ' بھر کر پینے کی ھوس ھے)

حواس علم کو ماحول سے دماغ تک اور دماغ سے ماحول تک لے جانے کا بنا بنایا ذریعہ نہیں ھے تحصیل علم اور تربیت حواس دونوں کا صرف ایک ھی طریقہ ھے اور وہ یہ ھے کہ طالب علم کسی با معنی اور دلچسپ شغل میں حصہ لے - بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال میں جو مفید اور پائدار علم حاصل کرتا ھے وہ محض دوسروں کی باتیں سنکر یا ان کے کام دیکھہ کر نہیں سیکھتا بلکہ وہ اپنے گردوپیش کے دلچسپ اور گونا گوں مشاغل میں حصہ لیتا ھے ' ھاتھہ پاؤں ھلاتا ھے ' ضرورت کے مطابق اپنے حواس کے ذریعے مشاھدات اور معلومات جمع کرتا ھے ' اپنی دماغی استعداد کے بموجب فکر اور عقل سے کام لیتا ھے ' اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق سیکھہ کر اپنے طریقہ عمل کی اصلاح کرتا ھے - اس طرح وہ جن مقاصد یا ضروریات کو پورا کرنا چاھتا ھے ان کے لئے اس کے ھاتھہ پاؤں اور تمام حواس و اعضا اور دماغ مل جل کر کام کرتے ھیں اور وہ نہ صرف ان مخصوص مقاصد کو حاصل کرتا ھے بلکہ اس کی عام دماغی اور جسمانی تربیت بھی ھوتی رھتی ھے - اگر مدرسے میں

بھی یہی تعلیمی اصول اختیار کیا جائے جس پر بچے اپنی جبلت کے تقاضے سے عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس کی تعلیم اِس طرح مصنوعی اور بے جان نہ رہے جیسی آج کل ہے - لیکن بد قسمتی سے معلموں نے طلبہ کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس میں باہم کوئی ربط نہیں - اُن کے نزدیک کچھہ کام تو ایسے ہیں جن میں محض حواس و اعضا بالخصوص ہاتھہ اور کان اور آنکھوں کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لکھنا یا ڈرائنگ یا لکڑی کا کام - اُن کے لئے کچھہ ایسی مشقیں مقرر کردی گئی ہیں جن کو طلبہ بغیر کسی دلچسپی کے اور بغیر اُن کا مقصد سمجھے دہراتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن خاص حرکات کو بطور ایک معمول کے سیکھہ لیتے ہیں جن کی مثلاً لکھنے وغیرہ کے لئے ضرورت ہوتی ہے - باقی کاموں میں " دماغ " کی ضرورت پڑتی ہے جن کو ان معلموں کے خیال میں جسمانی اعضا اور ان کی حرکات و افعال سے کوئی تعلق نہیں - ادب ' جغرافیہ ' تاریخ اور سائنس وغیرہ کا مطالعہ اس حصے میں شامل کیا جاتا ہے اور مطالعے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کتابوں کو پڑھیں ' اُستاد کا لکچر سنیں اور اس طرح یہ " علوم " براہ راست ان کے دماغ میں منتقل ہوجائیں - اس تعلیمی پروگرام کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ زندگی کی عملی کشمکش میں بے بس رہتے ہیں اور اپنے جسم و دماغ کی قوتوں کو اپنے عملی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال نہیں کرسکتے - اس حالت کی اصلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ مدرسے میں ایسے تعلیمی وسائل مہیا کئے جائیں جو طلبہ کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو بیک وقت دعوت عمل دیں اور ان کو ایسے مشاغل میں لگائیں جو ان کی خصوصیات جبلی مثلاً تجسس ' خواہش تعمیر و تخلیق اور اشتراک عمل کو اظہار کا موقع دیں کیونکہ ان کی تسکین کے لئے بچوں کو عملی کام کرنے

پڑتے ھیں جن میں ھاتھہ اور دماغ کے درمیان ایک مستقل رشتہ قائم ھوجاتا ھے - اس کی تفصیل ھم تعلیمی مشاغل کي بحث میں کرچکے ھیں - یہاں یہ ظاھر کرنا مقصود ھے کہ جسم اور دماغ کي تربیت ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر نہیں ھوسکتي - جسم کو دماغ کا آلۂکار سمجھنا چاھئے جس کی وساطت سے وہ مادی دنیا کے ساتھہ اپنا رابطہ قائم کرتا ھے اور اس کو اپنے قابو میں لاتا ھے - حواس خمسہ اور اعضائے جسمانی کا یہ کام ھے کہ وہ انسانی تجربے کے ارتقاء کي رھنمائی اور اس کے اعمال اور مقاصد میں مطابقت پیدا کریں - مدارس جدید میں سائنس ' عملی کام اور دستکاری کو اسی وجہ سے بہت نمایاں اھمیت دي گئی ھے کہ ان میں جسم و دماغ کے اتحاد عمل کا امکان بہت زیادہ ھے اور باقی تمام مضامین کی تعلیم میں بھي مختلف قسم کے کاموں کو جو بچے کے اظہار خودی میں مدد دیتے ھیں مثلاً نقشہ کشي ' ڈرائنگ ' تحریری مشقوں وغیرہ کو شامل کیا گیا ھے -

ھندوستان میں تربیت جسمانی کا مکمل اھتمام کرنے کے لئے والدین ' اُستادوں ' حکومت اور تعلیمی حکام کے اشتراک عمل کی ضرورت ھے اور جب تک وہ سب ایک مفید مقصد کو پیش نظر رکھہ کر اس عظیم‌الشان تعمیری تحریک میں حصہ نہ لیں گے کامیابی ممکن نہیں کیونکہ موجودہ صورت حال ان سب کی غفلت اور بے توجھی کا نتیجہ ھے - طلبہ کی بیشتر تعداد ایسے مفلس اور نادار گھروں سے آتی ھے جہاں نہ انھیں مناسب غذا ملتی ھے ' نہ ان کے آرام و تفریح کا انتظام ھے ؛ نہ اصول حفظان صحت کی پابندی ھوتي ھے - لیکن اس کی وجہ محض افلاس نہیں ' جہالت اور عدم احساس بھی ھے ورنہ غریبوں کے لئے یہ بھی ممکن ھے کہ وہ اپنے مکانوں کو ایک حد تک صاف رکھیں اور

مقابلتاً زیادہ مقوی اور زود هضم غذائیں استعمال کریں - اس صورت حال کے پیدا کرنے میں حکومت کی ذمہ داري یہ ہے کہ اس نے وہ تدابیر اور وسائل اختیار نہیں کئے جو دوسرے ملکوں میں صحت عامہ کی تحفظ کے لئے استعمال کئے گئے ہیں یعنی لوگوں کی تفریح اور بچوں کے کھیلنے کے لئے پارک اور میدان بنانا ' شہروں اور گاؤں کي صفائی کے لئے اهتمام اور پرچار کرنا ' بیماریوں کے انسداد کے لئے تدابیر سوچنا - ان فرائض کي ذمہ داری مرکزی حکومت سے زیادہ مقامی حکام اور بلدیے پر عائد ہوتی ہے - اسی لئے ہم نے یہاں حکومت کے لفظ کو اس کی عمومی معنی میں استعمال کیا ہے جس میں یہ سب جماعتیں شامل ہیں - ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ان جماعتوں نے اس کام کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کی - توجہ ضرور کی ہے اور کہیں کہیں ان باتوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے لیکن کسی بڑے پیمانے پر کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھائی گئی کہ اتنے بڑے ملک کے شایاں شان ہوتی جس میں حکومت اور جمہور دونوں متفق ہوکر اس زبر دست مسئلہ کو بحیثیت مجموعی حل کرنے کی کوشش کرتے - تعلیمی حکام اور معلموں نے مدرسے کے امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا - ایک تو انھوں نے نصاب تعلیم کو اس قدر مجرد اور نظری بنا دیا ہے کہ جیسا ہم نے اوپر بتایا ہے بچوں کو وہاں اپنی جسمانی نشو و نما کا موقعہ نہیں ملتا - اس میں عملی اور تخلیقی مشاغل کی بہت کمی ہے اور دستکاری ' جس کے بہت سے تعلیمی فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان کو صحت افزا کام میں لگاتی ہے ' اس میں بطور ایک اہم عنصر کے شامل نہیں ہے - دوسرے اکثر مدرسوں میں کھیلوں اور ورزشوں کا کوئی مناسب اهتمام نہیں ہے اور باوجود اس تاکید کے جو آج کل

کھیل کے متعلق کی جاتی ھے واقعہ یہ ھے کہ بہت سے مدرسوں میں
طلبہ باقاعدگی کے ساتھہ کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے - صرف چند
طلبہ جو اچھے کھلاڑی ھوتے ھیں وہ نمائشی اغراض کے لئے کھیلتے ھیں
باقی سب کھڑے تالیاں بجاتے ھیں ' یا گپ شپ میں وقت ضائع
کرتے ھیں - پھر محکمہ تعلیم کی طرف سے طبی معائنہ غریب بچوں کی
خوراک ' سیر و سیاحت وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ' غالباً ان کا
خیال یہ ھے کہ یہ تمام باتیں ھندوستان جیسے مفلس ملک کے لئے
اسراف میں داخل ھیں گو مغربی ممالک میں یہ نظام تعلیم کا
جزو بن گئی ھیں - سچ پوچھئے تو اس قسم کی تعمیری اور اصلاحی
کوششوں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت انہیں ممالک میں ھوتی ھے جو
افلاس اور جہالت اور امراض کا شکار ھیں اور ان کے لئے یہ تعمیری کام
ھرگز فضول خرچی میں شامل نہیں - لہذا جسمانی تربیت کا
مسئلہ ایک وسیع مسئلہ ھے جس کے بہت سے پہلو ھیں - اس کے
لئے طلبہ کی بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ عام معاشری بود و باش کی اصلاح
درکار ھے - لوگوں کے ماحول کو زیادہ صحت افزا بنانے کی ضرورت ھے یعنی
گاؤں اور قصبوں میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام کرنے کی اور
بڑے شہروں میں علاوہ صفائی کے اھل شہر کے لئے تازہ اور کھلی ھوا
مہیا کرنے کی ضرورت ھے جہاں وہ اپنی تنگ و تاریک گلیوں اور گھروں
سے نکل کر تفریح کرسکیں اور بچوں کو کھیلنے کودنے بھاگنے دوڑنے کے لئے
جگہ ملے - مدرسوں کی تعلیم میں عملی اور فعالی عنصر کا اضافہ کرنے
کی ضرورت ھے تاکہ وہ اپنے جسم اور دماغ دونوں سے کام کرنا سیکھیں اور
دست کاریوں کے ذریعے ان کے ھاتھہ کی تربیت ھو - جو تعلیم حاصل
کرنے کا ایک نہایت اھم ذریعہ ھے - طلبہ کے لئے کھیل اور ورزش کا بھی
مناسب انتظام ھونا چاھئے تاکہ عمر کے اس نازک زمانے میں ان کی

جسمانی نشو و نما معطل نہ ہونے پائے - درسی زندگی کے دوران میں
دو منزلیں ایسی آتی ہیں جب طلبہ کی نشو و نما خاص طور پر تیز
ہوجاتی ہے - ایک وہ زمانہ جب وہ شیر خوارگی سے لڑکپن میں داخل
ہوتا ہے اور اس کی عمر چھہ یا سات سال کی ہوتی ہے اور دوسرا جب
وہ لڑکپن کے زمانے سے گزر کر بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ہے - ان
دونوں زمانوں میں اس کی طبیعت کا توازن ڈانواں ڈول ہوجاتا ہے -
کیونکہ اس کی زیادہ تر قوت جسم کی نشو و نما میں صرف ہوتی ہے اور
وہ اپنے تعلیمی مشاغل کی طرف پوری توجہ نہیں کرسکتا - اس وقت
فطرت شناس معلم کا فرض ہے کہ وہ اس نفسی ارتقاء کے عمل کو پہچانے
اور درسی کاموں پر زیادہ زور نہ دے - اکثر اوقات ہندوستانی طلبہ کی
صحت اس وجہ سے بہت خراب ہوجاتی ہے کہ اس خاص زمانے میں
جب جسمانی ورزشوں ' کھیلوں اور کھلی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے وہ
انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے لئے حد سے زیادہ دماغی محنت کرتے
ہیں جس سے ان کی جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے اور ان کو
بسا اوقات اعصابی امراض لاحق ہوجاتے ہیں - تعلیمی حکام کا یہ فرض ہے
کہ وہ علاوہ مندرجہ بالا تدابیر اختیار کرنے کے جن کا تعلق صحت کے قائم
رکھنے سے ہے طبی معائنہ اور علاج کا معقول انتظام کریں اور وقتاً فوقتاً
یہ معلوم کرائیں کہ کس قدر طلبہ آنکھہ ' کان ' ناک اور حلق وغیرہ کے
امراض میں مبتلا ہیں - والدین اور استادوں کو ان بیماریوں کے علاج
میں متفقہ کوشش کرنی چاہئے کیونکہ یہ نہ صرف جسمانی صحت کی
بیخ کنی کرتی ہیں بلکہ طلبہ کی تعلیمی ترقی میں بھی حارج ہوتی
ہیں - اس بحث کو ہم ایک ایسے مدرسے کے ذکر پر ختم کرتے ہیں
جہاں بغیر حکام یا پبلک ، کی کسی خاص امداد کے ایک دھن کے پکے
معلم نے اپنے قائم کئے ہوئے مدرسے کو ایک ایسے ماحول میں تبدیل

کردیا تھا جہاں تربیت جسمانی کے لئے بہترین ذرائع اور وسائل مہیا کئے گئے تھے - بیر جس (Bierges) کا یہ مدرسہ جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کرچکے ہیں بلجیم کے ایک معلم واسکو نسلو (Vasconcellos) نے قائم کیا تھا - یہ شہروں کے شور و غل اور کشمکش سے دور ایک دیہاتی علاقے میں واقع تھا جہاں طلبہ کو فطرت کے گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہونے اور ان کے سکون بخش اثرات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا تھا - لیکن باوجود اس تنہائی کے وہ صنعتی زندگی اور شہروں کے کاروبار سے ناواقف نہ تھے کیونکہ ان کے استاد انہیں اکثر گرد و نواح کے کارخانوں اور صنعت حرفت کے مرکزوں میں لے جاتے تھے جہاں وہ براہ راست مزدوروں کی زندگی اور تقسیم عمل کا مطالعہ کرتے تھے - مدرسے کے نصاب میں ان مشاغل کو بہت اہمیت دی جاتی تھی جن میں ہاتھہ سے کام کرنا پڑتا ہے اور وہاں بھی دیگر مدارس جدید کی طرح عملی سائنس کے لئے معمل ، لوہاری اور نجاری کے لئے کارگاہیں ، جلد سازی ، ڈرائنگ اور مجسمہ سازی اور آرٹ کے لئے کمرے موجود تھے - پرندوں ، مچھلیوں اور بہت سے مفید پالتو جانوروں کی رہائش کا انتظام تھا - مدرسے کی عمارت کے چاروں طرف جنگل اور باغات تھے اور کاشت کے لئے زمین چھوٹی ہوئی تھی جس میں طلبہ باغ بانی کرتے ، ترکاریاں بوتے اور انہیں اپنے باورچی خانے میں استعمال کرتے تھے - پھر کیا عجب ہے کہ اس مسرت بخش اور صحت افزا ماحول میں رہ کر ، جہاں ان کو محض کتابوں کے مطالعے میں دیدہ ریزی کرنے کے بجائے ، عملی کاموں کے مواقع نصیب تھے ، ان کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑتا تھا اور ان کی صحت اور تندرستی کو دیکھکر لوگ رشک کرتے تھے - جسمانی ورزش اور کھیلوں کے علاوہ اس مدرسے کی ایک خصوصیت یہ

تھی کہ اس میں دست کاری کی تعلیم بہت احتیاط کے ساتھہ منظم کی گئی تھی - بانی مدرسہ خود اس کے متعلق لکھتا ہے : —

" جسمانی ورزش کی تکمیل اس قسم کی دستکاریوں کے ذریعے ہوتی ہے جیسے ٹوکریاں بنانا ، برتن اور گتے کی چیزیں بنانا ، جلد سازی ، مجسمہ سازی ، لکڑی اور لوہے کا کام وغیرہ - یہ سب طالب علم کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے نہایت قابل قدر ذریعے ہیں ان سے نہ صرف طلبہ کو اُس ذوق عمل کی تسکین ہوتی ہے جو ان کی عمر کا خاصہ ہے ، بلکہ مشاہدے ، موازنے اور تخیل کی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور ایجاد و جدت کی خواہش اُبھرتی ہے......چھوتے بچوں کو کاغذ اور گتے کی چیزیں بنانا ، ڈرائنگ اور ماڈلنگ سکھائی جاتی ہے - ان کے بیرونی کاموں میں باغ کے روشوں کی صفائی ، کیاریوں کی کاشت اور پالتو جانوروں مثلاً مرغیوں ، خرگوشوں کی نگہداشت شامل ہے - دس سال کی عمر کے بعد وہ بڑھئی کا کام بھی سیکھتے ہیں اور جو زیادہ مضبوط ہوتے ہیں وہ لوہار خانے میں کام کرتے ہیں......"

ہم نے اس باب میں جسمانی تربیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا خلاصہ کیا ہے ؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ سب طلبہ پہلوان بن جائیں اور اپنے جسم کی پرداخت کو مقصود بالذات سمجھنے لگیں - ہمارے نزدیک جسمانی تربیت کی تکمیل کے معنی یہ ہیں جب انسان تندرست اور طاقتور ہو اور اپنی طاقتوں کو اپنے مقاصد زندگی کی تحصیل میں استعمال کرسکے ، اسے اپنے اعضا اور حواس پر پورا قابو ہو ،

اور وہ ان کے ذریعے سے اپنے ماحول کے ساتھہ رابطہ قائم رکھے اور اس سے حسب ضرورت کام لے سکے اور بالخصوص اسے اپنے ہاتھوں کی حرکت پر پوری قدرت ہو اور وہ ان کے بے شمار امکانات عمل میں سے بعض کو مشق کے ذریعے ظاہر کرسکے - جب ہم جسمانی تربیت کا یہ وسیع مفہوم اختیار کرتے ہیں تو اس سے محض جسم کی پرورش مراد نہیں ہوتی بلکہ ان تمام جسمانی قوتوں اور امکانات کی نشو و نما جن سے ہماری دماغی اور عقلی تربیت میں مدد ملتی ہے اور ہم ان تعمیری اور تخلیقی مشاغل میں شریک ہوتے ہیں جو انسان کی خلاق طبیعت کا اظہار ہیں اور جن کے ذریعے وہ بعض اہم ترین جبلتوں کو تسکین دیتا ہے -

حصہ سوم

باب اول—اخلاق کا حقیقی مفہوم -

باب دوم—اخلاق اور عمل -

باب سوم—عقلي اور اخلاقي تربیت کا تعلق -

باب چہارم—ضبط و تادیب کا نظریہ جدید -

باب پنجم—معلم کی شخصیت -

باب ششم—اخلاقي سیرت کی تعمیر -

باب اول

اخلاق کا حقیقی مفہوم

ہم نے اس کتاب کے دوسرے حصے میں مدرسہ جدید کے تعلیمی اصولوں سے بحث کی ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی نظریوں کی رو سے مدرسہ میں نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کو کس طرح مرتب کرنا چاھئے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت اور جسمانی نشو و نما بہ خوبی ہوسکے - اس ضمن میں ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مدارس کے مروجہ نصاب اور تعلیمی طریقوں میں بہت سے ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے طلبہ کی شخصیت کی تربیت صحیح طریقہ پر نہیں کرسکتے - ان کی ذہنی صلاحیتیں اکثر افسردہ ہوکر رہ جاتی ہیں ' ان کے دل میں علمی اور عملی دلچسپیاں پیدا نہیں ہونے پاتیں اور وہ زندگی کے گوناگوں امکانات سے پوری طرح لطف اور فائدہ نہیں اٹھاسکتے - علاوہ اس امر کے کہ مروجہ تعلیم انفرادی نشو و نما کی ضامن نہیں ہے - اس کے خلاف یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ طلبا کو موجودہ تمدنی زندگی کی ضرورتوں کے لئے تیار نہیں کرتی اور اس نے اب تک ان جدید تحریکوں اور اثرات کی اہمیت کو نہیں سمجھا جنہوں نے موجودہ زمانے کی معاشرت اور سیاست ' اس کے نظام صنعت و حرفت ' اس کی علمی جدو جہد کے رجحان کو بدل دیا ہے - تعلیم اور تمدنی رجحانات کو ہم آہنگ بنانے اور مدرسے کے ماحول میں افراد کی تربیت کے لئے بہترین محرکات اور اثرات مہیا کرنے کے لئے ماہرین تعلیم نے ' نفسیات اور تمدنی علوم سے فائدہ اٹھا کر ' جدید تعلیمی تجربوں اور

طریقوں کو رواج دیا ھے جن میں سے چند اھم تجربات کا ذکر ھم کرچکے ھیں -

اب ھم اس مسئلے کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع کرتے ھیں - ھم شروع میں بتا چکے ھیں کہ تعلیم سے مراد صرف علم سکھانا نہیں بلکہ عرف عام میں یہ لفظ مجموعی تربیت کے معنی میں استعمال ھوتا ھے جس کا مطلب ھے انسان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا ابھارنا ' سنوارنا اور منظم کرنا - اس لئے تعلیم کے عملی پہلو سے بحث کرنے کے بعد ' جس کا تعلق زیادہ تر ذھنی نشو و نما سے ھے ' ھمارے سامنے یہ اھم اور نازک مسئلہ در پیش ھے کہ طلبہ معاشرتی زندگی میں حصہ لینے اور اپنے ملک اور زمانے کی بہترین اخلاقی قدروں اور اصولوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کس طرح تیار کئے جاسکتے ھیں - واقفیت اور علم میں اضافہ کرنا آسان ھے لیکن انسان کے اصول زندگی پر اثر ڈالنا ' اس کے جذبات اور حیات کو ایک عمدہ اور اعلی نصب‌العین کے تحت میں لاکر مہذب اور منظم کرنا اور اسے اپنی قابلیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ھے - لیکن یہ کام جس قدر مشکل ھے اسی قدر ضروری ھے اور معلم کو جو گویا ایک انسان برتر کی تخلیق میں مصروف ھے اس فرض کو اچھی طرح سمجھنا چاھئے اور اس کی بجا آوری میں پوری پوری کوشش کرنی چاھئے - یہاں اسے انسان کی نہایت قدیم اور بنیادی جبلتوں سے سابقہ پڑتا ھے جو اس کے خیالات اور افعال پر بہت گہرا اثر ڈالتی ھیں اور جب تک وہ بہت احتیاط اور ھوشیاری سے ان قوتوں کو راہ پر لگا کر اپنا معین و مددگار نہ بنائے گا اسے کامیابی نہیں ھو سکتی - اس لئے اسے نفسیات اطفال سے اچھی طرح واقف ھونا چاھئے تاکہ وہ ان قوتوں کو صحیح طور پر سمجھ کر رھنمائی کرے - لیکن محض علم‌النفس سے واقف ھونا اس کے لئے

کافی نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے تو اسے صرف اسی قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے کس مواد سے کام لینا ہے - یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ وہ کس منزل کی طرف اپنا قدم بڑھائے ' کس نصب‌العین کے حاصل کرنے کی کوشش کرے - مقصد کے تعین کے لئے اسے اخلاقیات اور عمرانیات سے مدد لینے کی ضرورت ہے - اور یہ جاننا لازم ہے کہ وہ کون سے اخلاقی اور معاشرتی اصول زندگی ہیں جن کو بہترین علما اور حکما نے تسلیم کیا ہے ' تا کہ وہ اپنے طلبہ کو ان سے روشناس کرے اور انہیں ان پر عمل کرنے کی عادت ہو -

ہمیں اس موضوع پر نظر ڈالنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ ذہنی اور اخلاقی تربیت کی بحث میں ہم نے جو تقسیم قائم کی ہے وہ نفس امر کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اظہار خیال میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اختیار کی گئی ہے - تمام تعلیمی مباحث میں ہم‌نے اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ طالب‌علم کی شخصیت اور تعلیم کے عمل دونوں میں ایک اندرونی وحدت اور ربط ہے جس کو نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ہے - اصل میں ہم انسان کی ہستی کو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کرسکتے - یہ نہیں کہ سکتے کہ جسم اور دماغ ' عقل اور اخلاق ' روح اور مادہ بالکل مختلف چیزیں ہیں جن کو ایک دوسرے سے سروکار نہیں اور جن کی تربیت اور نشو و نما کے لئے بالکل جداگانہ تدابیر درکار ہیں - جس طرح آرٹ کے ہر بڑے شاہکار میں ایک مرکزی خیال یا جذبہ کار فرما ہوتا ہے جو اسے ایک مخصوص وحدت (Unity) یا بقول ڈاکٹر نن (Nunn) کے " انفرادیت " (Idividuality) بخشتا ہے ' اس طرح انسان کی زندگی اور اس کی ذات میں جو قدرت کا سب

سے بڑا شاہکار ہے ایک وحدت پائی جاتی ہے جو اس کے مختلف اعمال و افعال ' اس سے مختلف عناصر کو باہم مربوط رکھتی ہے - اس خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا عمل بھی ایک سالم عمل ہے جس کو جسمانی تعلیم ' ذہنی تعلیم ' اخلاقی تعلیم وغیرہ میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - گو ہم اپنی آسانی کے لئے اور ایک وقت میں کسی خاص پہلو کو نمایاں کرنے کی غرض سے اس تقسیم سے کام لیتے ہیں ' لیکن ہمیں یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ تعلیم کے یہ مختلف پہلو واقعی مستقل وجود رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں ڈالتے اور معلم ان میں سے ہر ایک کے لئے علحدہ علحدہ تدابیر اور وسائل سوچ سکتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ انتظام جو مثلاً جسمانی تعلیم کے لئے کیا جاتا ہے محسوس یا غیر محسوس طور پر طلبہ کی دماغی اور اخلاقی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے - اس طرح مدرسے میں جو وسائل ہم طلبہ کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لئے اختیار کرتے ہیں وہ ان کی اخلاقی سیرت کی تشکیل میں بھی حصہ لیتے ہیں - مروجہ اخلاقی تعلیم کی خرابی کی ایک بڑی وجہ جس کی توضیح ہم آئندہ چل کر کرینگے یہ ہے کہ بالعموم لوگوں نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے وہ بہت محدود اور نا کافی ہے - در اصل اس میں علم اور عقل دونوں کو بہت بڑا دخل ہے - اس لئے طلبہ کی علمی اور عقلی تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کی سیرت اور طرز عمل میں تغیر واقع ہو - اس وجہ سے گو اب تک ہم نے فی نفسہ اخلاقی تربیت کے مسئلہ کو نہیں اٹھایا لیکن گذشتہ بحثوں میں ضمنی طور پر بار بار اس کا ذکر آچکا ہے - کتاب کے اس حصے میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ مدرسے کے تمام کار و بار اور مشاغل کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں کہ وہ کس حد تک اخلاقی تربیت میں معین یا مزاحم ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے ان کی تنظیم کس طرح کرنی چاہئے -

سب سے پہلے ہمیں اخلاق کے صحیح مفہوم اور اس کی حدود کو سمجھ لینا چاہئے - لوگوں نے عام طور پر اخلاق کو انسانی زندگی کا ایک شعبہ سمجھ رکھا ہے - ان کا خیال ہے کہ زندگی بہت سے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے - کارو باری ' سیاسی ' معاشرتی ' اخلاقی وغیرہ - گویا ہر انسان بہت سی مختلف اور غیر مربوط شخصیتوں کا مجموعہ ہے جن کو وہ بہ مشکل ایک ساتھ تو رکھ سکتا ہے لیکن ہم آہنگ نہیں بنا سکتا - یہ سچ ہے کہ اس ناقص اور نا مکمل دنیا میں اکثر لوگوں کی حالت ایسی ہی ہے کہ ان کے نفس میں تفریق اور انتشار پایا جاتا ہے - ہر شخص اپنے نفس کے مشاہدے اور دوسروں کی سیرت کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے - چونکہ زیادہ تر لوگوں کے نفس میں یہ تفریق دماغی جنون کی حد تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ اسے انتہائی صورت میں دیکھتے ہیں مثلاً سٹیونسن (Stevenson) کے مشہور افسانے " ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ " (Dr. Jekyll and Mr. Hyde) میں نفس کی دوئی کی داستان پڑھتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی غیر طبعی چیز ہے جس کو صحیح العقل انسانوں کے روز مرہ کے تجربات سے کوئی تعلق نہیں - حالانکہ اس شخص میں جو دو بالکل متضاد طبیعتیں رکھتا ہے ' اور معمولی آدمیوں میں فرق محض کمیت کا ہے کیفیت کا نہیں - وہ بھی دنیاوی کارو بار اور تجارت میں ایک اصول رکھتے اور برتتے ہیں اور مذہبی امور یا خانگی زندگی میں بالکل دوسرے اصول اور طرز عمل کے تابع ہوتے ہیں - انگریزی کی ایک ضرب المثل اس مروجہ تقسیم کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ " ہفتے میں چھ دن دنیاداری کے ساتواں دینداری کا " - غرض یہ بات تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عملی

حیثیت سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کی شخصیت میں ہم آہنگی پائی جائے اور بالعموم اکثر لوگ اپنی زندگی کو مختلف اور غیر مربوط حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں - مگر یہ تعلیم و تربیت کی خرابی کا ثبوت ہے - ہم اس نا قابل اطمینان صورت حال کو اپنا منتہائے نظر نہیں بنا سکتے - صحیح تربیت کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ وہ افراد کی شخصیت میں یہ انتشار پیدا ہونے نہ دے اور ان کی تمام علمی اور عملی قوتوں کو اس طرح مربوط اور منظم کردے کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی نصب العین کے حصول کے لئے استعمال ہوسکیں جو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں طور پر شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - لہذا ہمارے نقطہ نظر سے اخلاق کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں اور تمام مشاغل کو محیط ہے اور اخلاقی سیرت کا اظہار انسان کے ہر کام میں ہونا چاہئے خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا تجارت سے یا محنت اور مزدوری سے یا مذہب سے - اخلاق کا یہ مفہوم اس مروجہ مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع اور پر معنی ہے جو آداب نشست و بر خواست اور طریقہ کلام و طعام تک محدود ہے یا کبھی کبھی جنسی تعلقات کے لئے استعمال ہوتا ہے - عام طور پر جب لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا اخلاق اچھا ہے - تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی بات چیت اور برتاؤ میں شائستگی پائی جاتی ہے اور وہ آداب محفل سے واقف ہے لیکن اخلاق کے لفظ کو اس قدر محدود معنی میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسے ہم بیچ سمندر میں غوطہ لگانے کے بجائے محض اس کی سطح کو چھونے پر قناعت کریں - بے شک ایک با اخلاق شخص کی گفتگو میں شیرینی اور اس کے برتاؤ میں حفظ مراتب کا خیال بھی ہونا چاہئے لیکن اگر یہ صفات اس کی تہذیب نفس کا نتیجہ نہیں ہیں تو پھر محض اوپری چیز ہیں جن کو ہم کوئی وقعت نہیں دے سکتے - بہت ممکن ہے کہ ایک بدباطن اور بد کردار شخص لوگوں کو فریب

دینے کے لئے اس قسم کا جھوتا اور نمائشی " اخلاق " ظاھر کرے - ھمیں روز مرہ کي زندگی میں اکثر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ھے جو باوجود اس سطحی " اخلاق " میں ماھر ھونے کے نہایت درجہ ذلیل اور بد اخلاق ھوتے ھیں - ممکن ھے کہ بعض لوگ جو وسیع تجربہ اور غائر نظر رکھتے ھیں ان کی ریا کاري کو پہچان سکیں اور کھرے اور کھوتے سکے میں تمیز کرسکیں لیکن عام لوگ دھوکے میں آجاتے ھیں اور نقصان اتھاتے ھیں - اس لئے ھمیں اخلاق کے اس سطحی مفہوم کو یک قلم مسترد کر دینا چاھئے - اسی طرح جو لوگ اخلاق کو جنسی تعلقات کے ساتھہ مخصوص کر دیتے ھیں اور " بااخلاق " کے لفظ کا اطلاق ان لوگوں پر کرتے ھیں جن کي زندگی کا صرف یہ پہلو قابل تعریف ھوتا ھے وہ بھی کل کے بجائے جزو پر قانع ھوجاتے ھیں - اس میں شک نہیں کہ یہ بھی اخلاق کا ایک نہایت اھم حصہ ھے لیکن اس کو اخلاق کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں سمجھنا چاھئے کیونکہ انسان پر زندگی کی گوناگوں کشمکش میں مختلف قسم کے فرائض عائد ھوتے ھیں - اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو ادا کرے اور باقي کے طرف سے بے اعتنائی برتے تو ھم اس کو اخلاقي اعتبار سے اچھا نہیں سمجھہ سکتے - مثلاً اگر کسی شخص کا کردار جنسي تعلقات کے لحاظ سے بالکل پاک و صاف ھے لیکن وہ نہ سچ بولتا ھے ' نہ جائز ذرائع سے حصول معاش کرتا ھے ' نہ اپنے خاندان والوں اور ھمسایوں کے حقوق ادا کرتا ھے تو اس کو یقیناً بد اخلاق کہنا چاھئے - لہذا ان دونوں معنوں کو چھوڑ کر ھمیں اخلاق کا وھی مفہوم اختیار کرنا پڑیگا جو زندگي کے تمام مشاغل اور معاملات کو محیط ھو -

مدرسے کي خصوصیت یہ ھے کہ وہ خارجی زندگی کے خیالات اور عقائد سے متاثر ھوئے بغیر نہیں رہ سکتا - چونکہ سوسائٹی نے اخلاق کا

مفہوم غلط سمجھہ رکھا ھے اس لئے مدرسے میں بھی اخلاق سے متعلق ایک بہت محدود اور تنگ نقطۂ نظر رائج ہو گیا ھے اور اخلاق اور زندگی کے گہرے رابطے کو فراموش کردیا گیا ھے - مدرسوں میں '' اخلاقی تربیت '' کے یہ معنی لئے گئے ھیں کہ بچوں کو چند اخلاقی اصول بتادئے جائیں - بہت سے اُستادوں کو تو اس کی فرصت ھی نہیں ملتی یا سرے سے احساس ھی نہیں ہوتا کہ اخلاقی تعلیم کا کوئی بندوبست کریں لیکن جن معلموں کو اس کا خیال ھوتا بھی ھے ان میں سے بھی اکثر اس بات پر قناعت کرتے ھیں کہ طلبہ کو اچھے اچھے مقولے اور اخلاقی نصیحتیں سنادیں اور ان پر عمل کرنے کی تاکید کردیں - بعض جو زیادہ ایماندار اور محنتی ھوتے ھیں اور احساس فرض کے بوجھ سے دبے جاتے ھیں وہ ان اصول کی تشریح و تفسیر بھی کردیتے ھیں - اتنا کرکے وہ یہ سمجھہ لیتے ھیں کہ اخلاقی تربیت کی مہم سر ھوگئی - بے شک بعض معلم ایسے بھی ھیں جو اپنی مثال اور شخصیت کے مقناطیسی اثر سے طلبہ کی زندگی میں سچا اخلاقی احساس پیدا کردیتے ھیں اور غیر شعوری طریقے پر ان کے معیار فکر و عمل ' ان کے مذاق اور اخلاق کو بلند اور بر تر کرتے رھتے ھیں - خال خال ایسے روشن دماغ معلم بھی مل جائینگے جن کو شعوری طور پر یہ معلوم ھے کہ اخلاقی تربیت کے اصول کیا ھیں اور اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاھئیں - لیکن ان مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر اخلاقی تربیت کی عام کیفیت وھی ھے جو ھم نے اوپر بیان کی ھے - اس میں مطلق مبالغہ نہیں ھے - اس بے توجہی اور بے اصولی کا نتیجہ صرف یہی نہیں کہ معلموں کا مقصد حاصل نہیں ھوتا بلکہ وہ اپنی غلط کوششوں سے ' گو وہ نیک نیتی پر مبنی ھوں ' بچوں کی قدرتی نشو و نما میں حارج ھوتے ھیں اور اپنی مداخلت سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچاتے ھیں - ان کی نام نہاد

اخلاقی تعلیم کو بچوں کی روز مرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ اس تلقین کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنائیں - اس لئے اخلاقی نصیحتیں اور مقولے صرف ان کے کانوں تک پہنچ جاتے ہیں ' دل میں نہیں اترتے ' عمل کی شکل نہیں اختیار کرتے - وہ ان کو طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں اور جب ضرورت ہو فر فر سنا دیتے ہیں لیکن قول اور فعل کی علحدگی ان میں بلا ارادہ ریا کاری پیدا کرتی ہے اور مدرسے کی اخلاقی تعلیم سطحی ' مصنوعی اور غیر موثر رہ جاتی ہے - خود مدرسے کی چار دیواری میں بھی اس کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوتا اور مدرسے کو چھوڑنے کے بعد تو وہ بالکل ہی بیکار اور فضول ثابت ہوتی ہے -

اس بحث سے ہمیں اخلاقی تربیت کا پہلا بنیادی اصول ہاتھ آتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم کو وسیع اور جامع یعنی طلبہ کی پوری زندگی پر حاوی ہونا چاہئے اور اس کی بنیاد ان کے ماحول اور مشاغل اور ان کی فوری ضروریات اور فطری خواہشات پر رکھنا چاہئے - اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ تعلیم ایسی ہو جو بلا تفریق و امتیاز ان کی کل خواہشات پوری کرے یا ان کی روز مرہ کی زندگی اور مشاغل کی سطح سے بلند نہ ہونے پائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم تمام تر عملی ہو یعنی وہ طلبہ کی زندگی کے گونا گوں تجربات اور مشاغل کو پیش نظر رکھ کر ان میں بہتر تنظیم و ترتیب قائم کرے اور ان کو اخلاقی اصولوں کی تحت میں لائے نہ یہ کہ ان کی عملی ضرورتوں سے قطع نظر کر کے ان پر زبر دستی مجرد اخلاقی اصول عائد کردے - اس لئے مدرسے میں ہر اصول اور قاعدے کی تشریح ' ہر قانون کی مثال طلبہ کی زندگی میں سے مہیا کرنی چاہئے - مثلاً فلسفہ اخلاق کا ایک نہایت اہم اصول یہ ہے کہ معاشرتی

زندگی اس وقت تک نہیں چل سکتی اور نہ افراد کو آزادی عمل حاصل ہو سکتی ہے جب تک لوگ اس کے عادی نہ ہوں کہ ایک دوسرے کے ساتھہ رعایت اور رواداری برتیں ' اپنے اپنے حقوق اور فرائض پہچانیں اور دوسروں کے کام میں بے جا مداخلت کرنے سے باز رہیں - طلبہ کو محض اس اصول کا زبانی سمجھا دینا کافی نہیں کیونکہ جب تک یہ ان کے ذاتی تجربے کی مستحکم اور پائدار بنیاد پر قائم نہ ہو ' ان کی اپنی کامیابی اور نا کامی کی مثالوں سے اخذ نہ کیا گیا ہو ان کے عمل کی رہبری نہیں کرسکتا - اس کے لئے ضروری ہے کہ مدرسے میں ایک معاشرتی ماحول مہیا کیا جائے - تا کہ طلبہ اس کے نشیب و فراز سے واقف ہوکر خود اس نتیجے پر پہنچیں کہ حقوق کے ساتھہ فرائض بھی وابسطہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ اسے اپنے مشاغل کے لئے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو تو اسے دوسروں کے مشاغل میں بےجا مداخلت نہیں کرنی چاہئے ورنہ وہ بھی اس کے کاموں میں دست اندازی کرینگے - انفرادی حقوق اور ان کی حدود کی یہ معرفت محض اُستاد کے بیان سے حاصل نہیں ہوسکتی - اس کے لئے بچے کو پڑھائی کے کمروں میں ' بورڈنگ ہاؤس کی زندگی میں ' کھیل کے میدان میں اور تمام مشترک مشاغل کے دوران میں اپنے ہم عمر اور اپنے سے چھوٹے بڑے ساتھیوں کے ساتھہ تعاون عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ساتھی براہ راست اپنے مخصوص طریقوں سے یہ سبق اچھی طرح ذہن نشین کرادیتے ہیں - اگر کوئی طالبعلم مدرسے کے بن لکھے قوانین اور روایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو طلبہ خود مجرم کو قرار واقعی سزا دیتے ہیں اور اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عام روایات اور طریقہ عمل کی پیروی کرے - یہ سزا اسے ناگوار نہیں

هوتی یا کم سے کم اتنی ناگوار نہیں هوتی جتنی استاد کی سزا ' جو اکثر مبہم وجوہ پر مبنی هوتی هے جن کو سمجھنے سے وہ قاصر هوتا هے کپلنگ (Kipling) نے پبلک اسکول کی زندگی کے متعلق جو دل چسپ اور مشہور کتاب " ستاکی اینڈ کو " (Stalky and Co.) لکھی هے اس میں اس حقیقت کو نہایت خوبصورتی کے ساتھہ دکھایا هے - خصوصاً ایک باب میں جس کا عنوان " اخلاقی مصلحین " هے اس نے ایک سبق آموز کہانی بیان کی هے جس سے معلوم هوتا هے کہ اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لئےجو تدابیر اکثر خود طلبہ اختیار کرتے هیں وہ کس قدر موثر اور کارگر هوتی هیں خواہ استادوں اور والدین کے سنجیدہ نقطہ نظر سے وہ قابل اعتراض هوں -

تعلیم اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج هیں ان میں سے بہت سی ایک غلط نفسیاتی عقیدے پر مبنی هیں جس کی درستی کئے بغیر هم اخلاقی تربیت کے اصول قائم نہیں کرسکتے - لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا هے کہ انسان کے نفس میں دو جداگانہ قوتیں هیں جو همیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رهتی هیں - ایک طرف اس کی جبلتیں ' اس کے جذبات اور اس کی خواهشیں هیں جو اسے اپنی جانب کھینچتی هیں اور دوسری طرف اس کی عقل هے جو ایک مستقل اور آزاد قوت هے - یہ اس کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتی هے اور اسے جذبات اور جبلتوں کے فریب سے بچانے کی کوشش کرتی هے - انسان اور حیوان میں عموماً یہی چیز مابہ‌الامتیاز قرار دی جاتی هے کہ انسان عقل کا تابع هوتا هے اور حیوانات اپنی خواهشوں کے بندے هوتے هیں - انسان کی کامیابی اسی میں سمجھی جاتی هے کہ وہ اپنی عقل کی هدایت سے فائدہ اتھا کر اپنی خواهشات اور جذبات کو زیر کرے

بلکہ اگر ہوسکے تو انہیں بالکل مٹا دے - گویا عقل و ارادہ اور دوسری قوتوں میں لازمی کشمکش ہے اور اخلاقی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ عقل باقی تمام قوتوں پر غالب آجائے - لیکن نفسیات کی جدید تحقیقات اس خیال کی تردید کرتی ہے - جیسا ہم ابھی بتا چکے ہیں انسان کے نفس میں بہ حالت طبعی ہم آہنگی ہوتی ہے - اس کثرت مشاغل اور افعال میں جو اس کی زندگی میں نظر آتی ہے ایک خاص وحدت پوشیدہ ہے - اس کی تمام جسمانی اور دماغی ، علمی اور اخلاقی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں - ان کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنا غلطی ہے کیونکہ ان سب کی ابتدا انہیں سادہ اور جبلی رجحانات سے ہوتی ہے جو تمام افراد کی فطرت میں پائے جاتے ہیں - نفسیات ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان کی تمام اعلی قوتیں رفتہ رفتہ اُن اضطراری افعال ، جبلتوں اور صلاحیتوں کے تعاون اور تعامل سے وجود میں آتی ہیں جو بچے کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں - یہی وہ سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے - اور انہیں چیزوں کی صحیح نگہداشت اس کی آئندہ دماغی اور اخلاقی تربیت کا دار و مدار ہے -

ابتدا میں یہ مختلف قسم کی حرکات بالکل غیر شعوری ہوتی ہیں اور محض ماحول کے رد عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں - انہیں سے شیر خوار کی ابتدائی منزل میں بقائے حیات کا کام انجام پاتا ہے - لیکن ابھی تک اس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ ان حرکات کے ذریعے اپنے جسم کو سنبھالے اور اس کی حفاظت کرے یا اپنے ماحول پر قابو حاصل کرے اور گرد و پیش کے معاملات اور مسائل کو سمجھ سکے - لیکن جوں جوں بچے کو مختلف قسم کے تجربات پیش آتے ہیں وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے ، اس کے مظاہر اور خواص کو سمجھتا ہے اسے روز مرہ نئی مشکلات

اور نئے مسائل پیش آتے ہیں - فرد اور ماحول کے اس باہمی تعامل سے اس کی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہونا اور ایک منظم صورت اختیار کرنا شروع کرتی ہیں - تکلیف اور آرام کا احساس جو اس کو مختلف چیزوں اور کاموں سے حاصل ہوتا ہے اس کے دل میں اپنے ماحول کے مختلف اجزا اور عناصر کے متعلق ایک احساس قدر پیدا کرتا ہے یعنی بعض کو وہ پسند کرتا ہے اور ان کو حاصل کرنے یا ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے - بعض کو ناپسند کرتا ہے اور ان کو دور کرنا یا ان سے دور رہنا چاہتا ہے - اس طرح اوائل عمر ہی میں ایک قسم کا ابتدائی اور فطری معیار اقدار مرتب کر لیتا ہے ' جو زیادہ تر محض اس کے ذاتی تاثرات پر منحصر ہوتا ہے یعنی جس چیز سے اس کے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے اس کو "برا" سمجھتا ہے جس سے خوشی حاصل ہوتی ہے اسے "اچھا" سمجھتا ہے - مثلاً ڈاکٹر جو بچے کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے اس کا نام اس کی فہرست میں نہایت ناپسندیدہ لوگوں میں لکھا جاتا ہے اور بیوقوف نوکر جو اس کو وقت بے وقت مٹھائی کھلائے وہ اس کے نزدیک سب سے بہتر شخص ہے - اس طرح جو شخص بھی اس کو اس کے پسند کے برے اور مضر کاموں سے جنھیں وہ کرنا چاہتا ہے روکے وہ اس کو برا معلوم ہوتا ہے اور جو شخص اس کی ضدوں کو پورا کرے وہ اسے محبوب ہوتا ہے - ممکن ہے ان مثالوں پر غور کرنے سے کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ معیار بہت ہی ناقص اور ادنیٰ ہے اور محض ذاتی تاثر کی بنا پر چیزوں اور آدمیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا بڑی غلطی ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اصول انسانی فطرت کے نہایت مستحکم اور اٹل قوانین میں سے ہے - آگے چل کر اس کی شکل بدل جاتی ہے ' اس کے استعمال کا طریقہ دوسرا ہوجاتا ہے لیکن انسان کی پسند اور ناپسندیدگی میں شخصی رنگ کی جھلک یعنی فلاں کام یا فلاں شخص میرے لئے کیسا ہے ' مجھے

کیسا معلوم ہوتا ہے اس کی شخصیت کی ہر ارتقائی منزل میں پائی
جاتی ہے - جب انسان کی عقل اور تجربے اور وسعت نظر میں ترقی
ہوتی ہے تو اس کے نزدیک تکلیف اور آرام ، رنج اور خوشی کا مفہوم اور
ان کے محرکات بھی بدل جاتے ہیں - اس کو بعض نئی چیزیں پسند آتی
ہیں اور بعض چیزیں جو پہلے مرغوب تھیں ناگوار معلوم ہونے لگتی ہیں -
لیکن ہر حالت میں وہ ان کے متعلق جو رائے یا طرز عمل رکھتا ہے اس
کی بنا اسی پر ہوتی ہے کہ آیا ان سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا
رنج - لیکن نفسیات کی اصطلاح میں خوشی اور رنج کا حقیقی مفہوم وہ
نہیں جو عیش طلب لوگ سمجھتے ہیں - خوشی نام ہے اس احساس یا
جذبے کا جو شخصیت کی توسیع اور ترقی سے انسان کے دل میں پیدا ہو -
ہر وہ چیز جو میری شخصیت کو قوت پہنچاتی ہے ، اس میں استحکام
اور گہرائی پیدا کرتی ہے ، میری خوشی کی باعث ہوگی خواہ اس کے
حصول میں مجھے کتنی ہی محنت کرنی اور تکلیف اٹھانی پڑے - برخلاف
اس کے جو چیز میری شخصیت کو محدود اور کمزور کرتی ہے وہ رنج
پہنچاتی ہے خواہ بہ ظاہر مجھے اس سے آرام اور فائدہ محسوس ہوتا -
فرض کیجئے آج میرا خیال ہے کہ کسی کاروبار میں بہت سا روپیہ
لگانے سے میری شخصیت کو استحکام اور تقویت پہنچے گی - اس صورت
میں میں اپنی تمام کوششوں کو اس مقصد کے لئے وقف کردوں گا -
ہر اس چیز کی جو اس میں معین ہوگی دل سے قدر کرونگا اور باقی
تمام چیزوں کو اپنے لئے نقصان دہ اور باعث انتشار سمجھونگا - لیکن اگر
کل میرا خیال یہ ہوجائے کہ ملک میں مدرسے قائم کرنا نہایت
ضروری ہے اور اس سے بڑھکر اور کوئی مفید کام نہیں تو میں اپنے روپیے کو
بے دریغ اس کار خیر میں صرف کرونگا اور میری نظر میں دولت کی
حیثیت صرف اتنی ہوگی کہ وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک

ذریعہ ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی افعال کا محرک ہمیشہ وہی ایک جذبہ ہوتا ہے یعنی شخصیت کا فروغ اور استحکام یا عزم‌للقوۃ - لیکن وہ اغراض و مقاصد جن کے لئے انسان جد و جہد کرتا ہے ' اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے ' اپنی قوتیں اور وسائل استعمال کرتا ہے ' بدلتے رہتے ہیں -

اخلاقی تعلیم کا منشا اور منتہا یہ ہے کہ بچوں کے تمام کاروبار اور مشاغل کا رشتہ اعلیٰ ترین اندار اور مقاصد سے جوڑے تاکہ وہ انہیں کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کریں ان کے اندر اپنی شخصیت کو محو کردیں اور اس طرح اس کو زیادہ قابل قدر بنا کر دوبارہ حاصل کریں - بالفاظ دیگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچے کی توجہ کو اس کی ذات کی فوری اور عارضی ضروریات سے ہٹا کر مستقل اور بلند تر اجتماعی ضروریات کی جانب مائل کریں جن کو پورا کرنے میں اسے تکمیل نفس اور اظہار خودی کے بہترین مواقع مل سکیں - وہ کسی کام کو محض اس خیال سے نہ کرے کہ اس سے اس کا نفس حیوانی "آرام" پاتا ہے ' نہ کسی کام سے محض اس لئے پرہیز کرے کہ اس میں محنت اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے بلکہ وہ اپنی زندگی کی راہ کو کسی ایسے نصب‌العین کی روشنی سے منور کرے کہ اس کو سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں کی پروا نہ رہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نفس کش زاہدوں کی طرح آرام کی خواہش ہی نہ کرے یا تکلیف اٹھانے کو فی نفسہ باعث ثواب سمجھے - البتہ اسے جسمانی آشائش اور جسمانی خواہشات کی تشفی کو بھی اعلیٰ تر ' مقاصد میں معین بنانا چاہئے - جہاں کہیں جسمانی آسائش کے مطالبات ارتقائے شخصیت کے مطالبات سے بر سر پیکار ہوں اسے جسمانی آسائش کو ترک کر دینا

چاھئے - اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ھے کہ صحت جسمانی کا لحاظ اور خورد و نوش کا اھتمام اسی حد تک ضروری بلکہ اخلاقی فرائض میں شامل ھے جہاں تک اس سے انسان کو اس کام میں مدد ملتی ھو جو اس کا مقصد حیات ھے - جسم روح کا خادم اور آلہ‌کار ھے اس لئے اس کی خبرگیری اور نگہداشت لازم ھے - لیکن تربیت جسمانی کو مقصود بالذات بنا لینا اور بعض جسم پرستوں کی طرح اس خبط میں مبتلا ھوکر زندگی کے اور تمام فرائض اور مطالبات سے غافل ھوجانا سراسر ناجائز ھے - اس کے معنی یہ ھیں کہ انسان نے بر تر کو کمتر پر قربان کردیا ھے اور وسیلے کو مقصد بنا لیا - اخلاقی تربیت کا سب سے اھم پہلو یہ ھے کہ طلبہ وسیلے اور مقصد میں تمیز کرسکیں اور مختلف مقاصد میں باعتبار ان کی اخلاقی قدر و قیمت کے ترتیب قائم کرسکیں -

اب سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ طلبہ کو اس اخلاقی معیار سے کس طرح روشناس کیا جائے کہ وہ ان کی زندگی میں ایک اثر آفریں قوت بن جائے -

ھم ابھی بتا چکے ھیں کہ ابتدا میں بچے کی پسند اور نا پسندیدگی کا انحصار اس کی اپنی ذات کی نشو و نما اور آرام و آسائش پر ھوتا ھے - یہ اخلاق کی سب سے پہلی منزل ھے - اس کے بعد اسے گرد و پیش کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ھے وہ اپنے والدین کو پہچاننے اور ان سے محبت کرنے لگتا ھے ' اپنے عزیزوں کے ساتھہ رھتا سہتا ھے ' ھمسایوں اور پڑوسیوں میں اُٹھتا بیٹھتا ھے ' مدرسے میں اپنے ساتھیوں سے ملتا جلتا ھے اور رفتہ رفتہ ان کے خیالات اور جذبات ' ان کی بود و باش ' ان کی رسوم و روایات کو اپنا بنا لیتا ھے - اس معاشری تجربے کا اثر یہ

ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے اعمال اور افعال کو معاشرے کی پسندیدگی کے معیار پر پرکھنے لگتا ہے - اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے ہم عمروں اور بڑوں کی خوشنودی حاصل کرے - ان کی ناراضگی اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے اور اس کے احساس خودی کو کمزور کرتی ہے اور ان کی خوشنودی سے اس کے نفس میں احساس قوت پیدا ہوتا ہے - گویا اس کی ذات روز بہ روز وسیع ہوتی جاتی ہے اور اپنے محدود دائرے سے آگے بڑھکر اپنے متعلقین کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتی ہے - اس طرح اس کے لئے ایک نیا معیار قائم ہوجاتا ہے جو ابتدائی معیار سے بلند تر ہے - اس کے اثر سےاس کو عمرانی زندگی کے اصولوں سے انس اور مناسبت پیدا ہوتی ہے اور وہ بہت سی ایسی باتیں سیکھہ لیتا ہے جو اس کے معاشری ماحول کے مروجہہ اخلاق کا جزو ہیں - وہ عملاً یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر فرد کو اپنی نشو و نما کے لئے معاشرے کی اداروں اور انتظامات سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے لیکن اس حق کے بدلے میں معاشرے کی طرف سے اس پر فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کی پابندی اس کے لئے ضروری ہے مثلاً یہ فرض کہ وہ دوسروں کے ساتھہ مل جل کر کام کرے لیکن ان کے مشاغل میں بےجا مداخلت سے باز رہے - ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ہمدردی ، اشتراک عمل ، معاشری کارکردگی کا نظری مفہوم ابھی تک اس کی سمجھہ سے باہر ہو لیکن عمل کے ذریعے وہ ان عادتوں کو پختہ کرلیتا ہے جن پر اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے - اگر اوائل عمر میں ان عادتوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جائے تو آگے چل کر انسان کو اپنی ساری توجہ اور محنت ان جزئیات کی اصلاح میں صرف کرنی پڑتی ہے اور وہ اعلیٰ تر اخلاقی مقاصد کا حق ادا نہیں کرسکتا -

اس کے بعد اخلاقی تربیت کی تیسری منزل آتی ھے، جب طالب‌علم بچپن کی حدود سے نکل کر شباب کی سرحد میں قدم رکھتا ھے اور نہ صرف جسمانی اور ذھنی اعتبار سے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی اپنے پیروں پر کھڑا ھونا سیکھتا ھے - اب وہ اپنے ھر فعل کو اس معیار پر نہیں پرکھتا کہ اس سے مجھہ کو آرام و آسائش حاصل ھوگی یا نہیں اور نہ یہ سوچتا ھے کہ اگر میں فلاں کام کرونگا تو میرے دوست اور عزیز میرے متعلق کیا رائے قائم کرینگے ۔ اس وقت تک وہ اپنے ھدایت کے لئے کچھہ اصول اور قاعدے معین کر چکتا ھے اور اس کی یہ خواھش ھوتی ھے کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنی راہ چلے اور ان کی مدد سے زندگی کے سارے مرحلے طے کرے بلکہ بلوغ کے زمانے کی ایک خصوصیت یہ ھے کہ اکثر نوجوان محض اظہار خودی کے لئے اس شاھراہ سے ھٹ کر جس پر دوسرے چلتے ھیں اپنے لئے نیا راستہ کرتے ھیں تاکہ خود انہیں اور دوسروں کو یہ محسوس ھو کہ وہ ایک آزاد شخصیت کے مالک ھیں - لیکن یہ مبالغہ آمیز اظہا خودي محض ایک علامت ھے جس سے ھمیں یہاں بحث نہیں - ھمارے پیش نظر وہ مضبوط اور مستحکم اخلاقی سیرت ھے جو اپنے اصولوں کی خاطر آرام و آسائش کو قربان کرنے اور تکلیفیں اٹھانے کے لئے تیار ھو اور محض دوسروں کی خوشنودي یا تعریف کی خاطر اُس طرز عمل کو نہ چھوڑے جو اس کے نزدیک انصاف و صداقت کا تقاضا ھو - یعنی اس منزل میں پہنچ کر نئے سرے سے انسان کی رھنما اس کی اپنی ذات ھوجاتی ھے لیکن اب یہ ذات پہلے کی طرح عارضی اور فوری خواھشوں کی غلام نہیں ھوتی بلکہ تربیت اور تہذیب کی بدولت اخلاقی اقدار مقاصد سے آشنا ھوجاتی ھے - اب وہ ھر بات کا فیصلہ محض جسمانی راحت اور تکلیف کی بنا پر نہیں کرتی بلکہ اُس کا معیار بہت

بلند ہو جاتا ھے اور وہ اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کو اپنی شخصیت کے اظہار اور عزم للقوۃ کی تسکین کا ذریعہ بنا لیتی ھے -

یہ ضروری نہیں کہ ھر شخص اخلاقی تربیت کی ان تینوں منزلوں سے گذر کر اپنی سیرت کی تکمیل کرے - بلکہ واقعہ یہ ھے کہ بہت سے لوگ پہلی ھی منزل میں رہ جاتے ھیں اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے - وہ اپنی ساری عمر اس ادنیٰ اور پست سطح پر بسر کرتے ھیں جہاں اعمال و کردار پر فوری خواھشات اور حفظ نفس کی حکمرانی ھوتی ھے - ان کی اخلاقی حالت بچوں کی سی ھوتی ھے بلکہ اس سے بد تر - کیونکہ بچوں کے لئے تو یہ چیز فطرت کے موافق ھے اور ان غلطیوں اور کمزوریوں میں بھی معصومیت کی ایک شان پائی جاتی ھے - لیکن یہ لوگ جن کی اخلاقی نشو و نما مسدود ھو جاتی ھے نہ اپنی عقل سے کام لیتے ھیں نہ تجربے سے ، سوائے اس ابتدائی اور فطری تجربے کے جو انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ھے اور انہیں بعض صریحاً مضر اور مہلک چیزوں سے بچاتا ھے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور معاشرے کی رائے کا بھی خیال نہیں کرتے - بعض لوگ اس حالت سے آگے بڑھکر اخلاق کی درمیانی منزل تک پہنچ جاتے ھیں - جس میں دوستوں اور ھم چشموں یا اپنے سے بہتر لوگوں کی تقلید اور رضا جوئی کی خواھش زندگی پر حاوی ھوتی ھے ان کی بات چیت ، چال ڈھال ، وضع قطع ، ادب آداب ، غرض سارے ذاتی اور معاشرتی معاملات کا معیار یہی ھوتا ھے کہ کوئی بات ایسی نہ کریں جو دوسروں کی نظر میں کھٹکے - اس قسم کے لوگ سراسر رسم پرست اور تقلید پرست ھوتے ھیں اور معاشرے کے بے بس غلام بن کر رہ جاتے ھیں - ایک عجیب بات یہ ھے کہ نوجوانوں کی نفسی زندگی میں جہاں ایک طرف اظہار خودی اور

نمود کی خواهش بہت نمایاں هوتی هے وهاں بعض باتوں میں وہ معاشرے
کے دستور کا حد سے زیادہ لحاظ رکھتے هیں اور کم سے کم اپنے هم چشموں
کی مخالفت کرنے میں بہت جھجکتے هیں - ان متضاد رجحانات کا
اکثر یہ نتیجہ هوتا هے کہ نوجوان اپنے بزرگوں اور استادوں کے سامنے
خواہ مخواہ بڑھ بڑھ کے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا هے - هر بات میں ان
کی مخالفت اور ان کے بتائے هوئے راستے سے هٹ کر چلتا هے - مگر یہی نوجوان
اپنے هم‌عمروں اور دوستوں کے سابقے میں هر معاملے میں مروجہ رسم
اور دستور کی تقلید اور حمایت کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاهتا
هے - هم یہ نہیں کہ سکتے کہ ارتقائے نفس کا یہ دور مفید یا اهم نہیں
هے کیونکہ کسی شخص کی اخلاقی سیرت اس وقت تک مکمل نہیں
هوسکتی جب تک وہ اس منزل سے نہ گزرے - هر معاشرے کے اخلاقی
اصول و اقدار اور معیار عمل صدیوں کی جد و جہد اور تجربے کے بعد
قائم هوتے هیں اور اس کے افراد کی طبیعت اور زندگی میں سرائت
کرتے هیں - کوئی شخص آسانی سے ان تمام موثرات کی تفصیل اور ان
کی نشو و نما کو بیان نہیں کرسکتا جن سے کسی قوم کی اخلاقی زندگی
کی تشکیل هوتی هے - لیکن یہ حقیقت مسلمہ هے کہ یہ اخلاقی
زندگی هر بچے کو ابتدا هی سے اپنے اثر میں لے لیتی هے - اگر معاشرے کی
عام اخلاقی حالت قابل اطمینان هے تو ایک نوخیز هستی کی تربیت
کا بہترین ذریعہ یہی هے کہ وہ اس ماحول میں زندگی بسر کرے اور اس
کے اخلاقی اصولوں کو جذب کر کے ان پر عمل کرنے لگے - یعنی ایک طرف
تو ذاتی مطالعے اور مبادلہ خیالات کے ذریعے گھر میں اور مدرسے میں،
ان اصولوں کو نظری طور پر سمجھے اور ان کے حسن و قبح پر غور کرے
اور دوسری طرف اپنے کردار میں ان کو عملی جامہ پہنائے - چونکہ بعض

لوگوں میں فطری کمزوریوں یا ماحول کي خرابی کی وجہ سے یہ صلاحیت
ھی نہیں ھوتی کہ اس منزل سے آگے بڑھکر معاشری معیار اخلاق کو ذاتی
طور پر پرکھیں اور معاملات کے متعلق اپنے ضمیر کی روشنی میں آزادی
سے فیصلہ کرسکیں - اس لئے مدرسے کا یہی فرض ھے کہ ان کو معاشرے
کے بہترین اخلاقی اصول اور عمل سے روشناس کرے اور ان کے کردار کو
اخلاق کي معمولی سطح سے نیچے نہ گرنے دے -

لیکن اس صورت حال کو ھم اپنا مطمح نظر نہیں بناسکتے -
ھمارے نزدیک وہ اخلاقی تربیت ھرگز مکمل نہیں جس کا مرکز نقل
دوسرے لوگوں کي رائے اور ان کی خوشنودی ھو ' جس میں انسان کے
اپنے ضمیر کو کوئی دخل نہ ھو بلکہ ھر معاملے میں معاشري روایات اور
تعصبات کی پیروی کی جاتی ھو - تاریخ کے اوراق میں ھمیں جو مثالیں
اعلیٰ ترین انسانوں کی ' بالخصوص مذھبي رھنماؤں کی ملتی ھیں '
ان سے صاف طور پر ظاھر ھوتا ھے کہ فطرت انسان کی ارتقاء کا کمال یہ
ھے کہ انسان نہ صرف اپنی نفساني خواھشات اور فوری اغراض کی
کشمکش سے بلند ھوجائے بلکہ اس کے اندر اتنی قوت ' اعتماد نفس
اور بصیرت پیدا ھوجائے کہ اپنے نور باطن کو اپنا رھنما بنائے اور جب کوئی
ایسا اھم اور نازک موقع آپڑے کہ ضمیر کی آواز اور حق کا مقتضا
معاشرے کے مطالبے کے خلاف ھو اور ضمیر کی پیروي کرنے میں ساري
دنیا کی ناخوشي کا اندیشہ ھو تو انسان اپنے آرام و آسائش ' دنیاوی
اغراض اور معاشرے کی پسندیدگي کو ٹھکرا کر اپنے عقیدے پر عمل کرے
اور اس راستے پر چلے جو اس کے نزدیک سیدھا اور صحیح ھے - نفسیات
فلسفہ اور مذھب تینوں کي تعلیم یہی ھے گو ان میں سے ھر ایک اس
حقیقت کے اظہار میں مختلف انداز بیان اور اصطلاحیں استعمال کرتا

ھے کہ انسان کی روح آزاد ھے اس کو اپنی بھلائی برائی کا اختیار ھے اور
وہ خود اپنی قسمت کو بناتا یا بگاڑتا ھے - نفسیات کا نظریہ یہ ھے کہ
ھر ذی حیات ھستی میں انفرادیت کی شان اور اپنی رھنمائی آپ کرنے
کی صلاحیت پائی جاتی ھے اور اس کی صحیح نشو و نما صرف اسی
حالت میں ھوسکتی ھے جب تمام تعلیمی تدابیر اور وسائل اور ماحول
کے اثرات اس کی انفرادیت کو ظاھر ھونے کا موقع دیں اور اسے تقویت
پہنچائیں - فلسفہ بھی کانٹ کی زبان سے اس خیال کی تصدیق ان
الفاظ میں کرتا ھے -

" ھر انسان بجائے خود ایک مقصد ھے محض ذریعہ نہیں ھے "

اس کے معنی یہ ھیں کہ وہ ھر ایسے نظام یا ادارے کو ناقص
اور خلاف انصاف سمجھتا ھے جو افراد کو محض دوسرے لوگوں کے مقاصد
اور اغراض کا آلہ کار بنا دے - اس میں شک نہیں کہ ایک لحاظ سے
ھر شخص ذریعے کا کام کرتا ھے - وہ ان مشترک اغراض کی تحصیل میں
کوشاں ھوتا ھے جو معاشرے کی مادی یا ذھنی فلاح و بہبود کے لئے
ضروری ھیں اور اس طرح اپنے آپ کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ھے -
لیکن اس صورت حال کو ھم کسی طرح اخلاق کی رو سے جائز قرار نہیں
دے سکتے جو مثلاً لاتعداد انسانوں کو محض کارخانوں کا مزدور بنادے
اور ان کے تمام انسانی حقوق اور صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کردے -
اسی طرح تمام بڑے بڑے مذاھب نے مختلف پیرایوں میں یہ تعلیم
دی ھے کہ انسانی روح کو بہ راہ راست اپنے خالق سے تعلق ھے اور انسان خود
اپنے اختیاری افعال و اعمال سے اپنی روح کو عظمت اور بلندی کی طرف
لے جاتا ھے یا ذلت اور پستی میں گرادیتا ھے اس کو خارجی طاقتوں کے
ھاتھ میں بے بس سمجھنا بہت بڑی غلطی ھے -

" ہم نے انسان کو بنایا اور اسے اختیار دیا کہ خواہ وہ (ہماری دی ہوئی نعمتوں کا) شکر ادا کرے (یعنی ان کو صحیح مصرف میں لائے) یا کفران نعمت کرے (یعنی ان کا غلط استعمال کر کے ان کو ضائع کردے) "

(قران شریف)

اگر ہم انسانی روح اور انسانی شخصیت کی اس قدر مطلق کو تسلیم کرلیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ھے کہ انسان پوری طرح آزاد اور تربیت یافتہ اسی وقت ہوتا ھے جب وہ اپنے اعمال کی پوری ذمہ داری خود قبول کرے اور اس کی سیرت اخلاقی کمال پر اس وقت پہنچتی ھے جب وہ اپنے اھم فرائض کو اپنے علم اور اپنی پسند سے انجام دے نہ اس وجہ سے کہ معاشرے کی نظر میں اچھا سمجھا جائے - ورنہ محض دوسروں کی تقلید میں یا ان کی خوشنودی کے خیال سے تو حیوان بھی بہت سے کام کرتے ھیں - بعض جانور مثلاً کتے ، بندر ، گھوڑے وغیرہ اس طرح سدھائے جاتے ھیں کہ وہ اپنی طبعی حرکات میں تبدیلی کر کے ایسے کام سیکھہ جائیں جو انسان کے لئے مفید یا مرغوب ھوں لیکن اس " سدھانے " میں اور انسان کی " اخلاقی تربیت " میں بڑا فرق ھے - جانوروں کو اپنے ان کاموں کی غرض اور غائت سے کوئی سروکار نہیں ھوتا ، نہ وہ اخلاقاً ان کے نتائج کے ذمہ دار ھوتے ھیں - بر خلاف اس کے انسان ایک مکلف اور ذمہ دار ھستی ھے اور جب تک اسے یہ بات حاصل نہ ھو کہ ضرورت کے وقت معاشرے کی بندشوں سے آزاد ھوکر کام کرسکے اس کی ذمہ داری کوئی معنی نہیں رکھتی -

تربیت کو معاشرے کی تقلید تک محدود رکھنے میں بہت بڑا عمرانی نقصان یہ ھے کہ نظام اخلاق میں ارتقاء اور اصلاح کی گنجائش

نہیں رہتی - تعلیم محض موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کا یہ مقصد اعلیٰ فوت ہو جاتا ہے کہ وہ '' حیات برتر '' کی کفیل ہو - ہم نے اس کتاب میں برابر تعلیم کے اس جامد مفہوم کی مخالفت کی ہے جس کی رو سے مدرسے کا فرض محض اتنا ہے کہ فرد اور ماحول میں مطابقت پیدا کی جائے - اخلاقی تعلیم کی بحث میں بھی ہم اس جامد نقطہ نظر کو قبول نہیں کرسکتے کہ تعلیم مروجہ اخلاق کو اپنا منتہائے نظر سمجھ کر طلبہ کو اسی کے لئے تیار کرے - اگر ابتدائے تمدن سے یہ خیال کار فرما ہوتا تو شاید آج تک انسان اپنی قدیم وحشیانہ حالت سے آگے نہ بڑھ سکتا -

اکثر قوموں اور جماعتوں پر ایسے زمانے گزرے ہیں کہ ان کی اخلاقی حالت بہت ذلیل ہوگئی تھی اور معاشرے نے خوبیوں کو برائیاں اور برائیوں کو خوبیاں سمجھ لیا تھا - ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نظام تعلیم کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ اس معیار اخلاق کو بچوں اور نوجوانوں میں رائج کرے - معاشری اخلاق کی صحت اور اصلاح کی ضمانت یہی ہے کہ افراد میں اپنے اور دوسروں کے اعمال کا محاسبہ کرنے کی قابلیت ہو اور وہ ہر مروجہ عقیدے اور اصول کو آنکھیں بند کرکے تسلیم نہ کرلیں - اگر افراد کے نفس سے یہ صلاحیت جاتی رہے اور معاشرے کی حالت بہت ابتر ہو تو اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی انقلاب آفریں شخصیت پیدا ہو جو دلیری سے کام کر کے موجودہ نظام کو تہہ و بالا کردے اور لوگوں کو بہتر معیار اور اعلیٰ تر قدروں سے روشناس کرے - تاریخ میں بارہا ایسا ہی ہوا ہے - حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے رومی سوسائٹی کی کیا حالت تھی ؟ سب لوگ دولت پرستی اور عیش پسندی میں مبتلا تھے ' انسانوں میں مساوات اور ہمدردی باقی نہیں رہی تھی -

لوگ قوت کو انصاف کا مرادف جانتے تھے - غریب ہونا انتہائی ذلت کا باعث تھا اور انسان کو اس کے انسانی حقوق سے محروم کر دیتا تھا - کیا اس مصلح اعظم نے ان خیالات اور حالات کے سامنے سر تسلیم کردیا ؟ نہیں اس نے ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اپنا انقلاب انگیز پیغام معاشرے کے سامنے پیش کیا اور اس فرض کے ادا کرنے میں نہ ذاتی مصیبتوں کی پروا کی نہ اپنے زمانے کے تعصبات اور عقائد کا پاس کیا اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم نظام اخلاق کو درھم برھم کردے گی گویا ''! دیوانہ بکارگہ شیشہ گررسید !'' کا معاملہ ہوجائے گا - لیکن محض ان کی شخصیت اور بے خوف جد و جہد کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے ایک ایسے معیار اخلاق کو اپنی آنکھوں سے دیکھہ لیا جو مروجہ اخلاق سے کہیں بلند اور برتر تھا -

اسی طرح مہاتما بدہ نے اپنی سیدھی سادھی پاک صاف تعلیم ہندوستان میں پھیلائی اس وقت معاشرے کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوچکی تھی - مذھب مہمل رسوم میں مبتلا ہو کر اپنی معنویت کھو چکا تھا اور لوگ ذات پات کی بندشوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ انسان کی بطور انسان کے نہ کوئی حیثیت تھی نہ حقوق - اس زمانے میں بدھہ کی تعلیم بہت خطرناک معلوم ہوتی ہوگی اور کہنے والوں نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ اگر ایسے خیالات دنیا میں پھیل گئے تو نظام تمدن برباد ہو جائیگا - لیکن انہوں نے اپنے نور باطن کی ہدایت پر عمل کیا اور معاشرے کے اخلاق میں انقلاب کر دکھایا -

اسی قسم کے اثر کی سب سے زبردست مثال عرب میں حضرت محمدؐ رسول اللہ کی ذات میں نظر آتی ہے جنہوں نے بیس پچیس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی قوم کی کایا پلٹ دی جس کے اندر ہر

قسم کی اخلاقی خرابیاں اور عیوب صدیوں سے رچ گئے تھے - اس کی حالت کا جیتا جاگتا نقشہ حالی نے اپنی مسدس میں کھینچا ھے - اس کی زندگی کا شاید ھی کوئی اصول یا عقیدہ ایسا ہو جو ناانصافی ، بد دیانتی اور بد اخلاقی پر مبنی نہ ہو - جب اس قوم کے سامنے حضرت محمد صؐ نے اپنی پاک تعلیم پیش کی تو لوگوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا دین و مذہب ، تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہوگئی ہیں اور انہوں نے انتہائی شدت کے ساتھہ اس نئی تعلیم کی مخالفت کی - لیکن پیمبر اور مصلح کا کام ھی یہ ھے کہ مخالفتوں کا مقابلہ کرے اور لوگوں کو راہ دکھائے خواہ اسے اس فرض کی ادائگی میں اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پڑے - چنانچہ حضرت محمد نے ایسا ھی کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ھی دیکھتے وہ جنگجو قبیلے ایک زبر دست منظم اور با اخلاق قوم بن گئے - ان تمام مثالوں سے معلوم ہوتا ھے کہ کوئی شخص جو کسی قوم کے لئے مصلح بن کر آتا ھے محض مروجہ اخلاق کی اشاعت پر قناعت نہیں کر سکتا -

اس سے کم درجے پر یہی فرض ہر معلم پر عائد ہوتا ھے - اس کو چاھئے کہ طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا کرے کہ وہ ضرورت کے وقت معاشرے کی قیود اور بندشوں سے آزاد ہوکر رائے عامہ کے خلاف ایسے کام کرسکیں جو ان کے نزدیک صحیح ہوں - یہ سچ ھے کہ عام لوگوں کو ایسے مواقع آئے دن پیش نہیں آتے اور ممکن ھے بعض کو کبھی ایسا موقع پیش ھی نہ آئے لیکن یہ اخلاقی جرات انسانی سیرت کا اعلیٰ زیور ھے اور اس کے بغیر کوئی شخص انسانیت کی انتہائی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا - مندرجہ بالا مثالیں ایسے زمانوں کی ہیں جن میں معاشرے کی اخلاقی حالت خاص طور پر خراب ہوگئی تھی لیکن جو فرض

وھاں ان مصلحین اعظم کا تھا وہ آج کل بھی ھر ملک اور قوم میں معلموں اور مصلحوں پر عائد ھوتا ھے - دنیا میں کوئی معاشرہ ایسا نہیں جس میں اصلاح کی گنجائش نہ ھو ' جس میں ایسے ادارے اور رسوم و قوانین نہ پائے جائیں جو ھر ذی‌حسن اور انصاف پسند آدمی کے نزدیک قابل اعتراض ھیں - لہذا ھر جماعت میں ایسے دل و دماغ کے لوگوں کی ضرورت ھے جو اس کے نظام اخلاق کی تنقید اور احتساب کرسکیں اور ان تمام رسوم اور قوانین کے خلاف بغاوت کریں جو ان کے نزدیک افراد اور معاشرے کے لئے مضر اور انسانیت کے منافی ھیں اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ ھم دنیا کے مختلف معاشروں کے نام لے کر یہ بتائیں کہ وھاں ایسے لوگوں کی کس قدر ضرورت ھے جو آزادی کے ساتھہ اپنی عقل اور ضمیر کے مطابق کام کریں اور لوگوں کي نکتہ چیني اور ملامت کي پروا نہ کریں - مثال کے طور پر اگر ھم اپنے ھی ملک کی حالت پر نظر ڈالیں تو معلوم ھوگا کہ ھماري زندگی کے ھر شعبے میں اخلاقی خرابیاں موجود ھیں اور اصلاح و ترمیم کي گنجائش ھے - معاشرے میں عورتوں کا مرتبہ اور ان کی تعلیم ' امیروں غریبوں کے باھمی تعلقات ' محنت اور محنت کرنے والوں کے ساتھہ تعلیم یافتہ طبقے کا رویہ ' دولت کا بےجا استعمال ' کارو باری دیانت کی کمي ' تعصبات اور توھم پرستی ' غرض ایسی بہت سی چیزیں ھیں جو ھمارے قوم کو گھن کی طرح کھا رھی ھیں - جب تک نئی تعلیم یافتہ نسلوں میں اتنی اخلاقي جرات نہ ھو کہ وہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کریں اور لوگوں کی مخالفت اور ھنسی کو خاطر میں نہ لائیں عمرانی اصلاح ممکن نہیں - اس وجہ سے معلم کا ایک نہایت اھم فرض یہ ھے کہ وہ اپنے طلبہ میں اخلاقی جرات پیدا کرے -

باب دوم

اخلاق اور عمل

اب اخلاقی تربیت کا مسئلہ بحیثیت مجموعی واضح ہوگیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اخلاق کی حدود کس قدر وسیع ہیں اور ایک نوخیز شخصیت کو اخلاقی سیرت کی تحصیل و تکمیل میں کن منازل سے گزرنا پڑتا ہے - ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ ہے کہ مدرسوں میں اخلاقی تربیت کے کیا وسائل اور ذرائع موجود ہیں اور ان سے کس طرح کام لینا چاہئے - اس بحث کے آغاز ہی میں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ اخلاقی سیرت محض زبانی تعلیم و تلقین کے ذریعہ مستحکم نہیں ہو سکتی - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی قسم کی تعلیم و تربیت بھی جس کا انحصار لفظی تعلیم و تعلم پر ہو موثر اور کامیاب نہیں ہو سکتی - جسم کی تربیت کے متعلق تو یہ بالکل ایک بدیہی امر ہے کہ جب تک ہم ورزش نہ کریں اور جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لئے مختلف مناسب ذرائع اور وسائل اختیار نہ کریں جسمانی نشو و نما کا امکان ہی نہیں خواہ ہمیں علم حفظان صحت سے کتنی ہی گہری اور وسیع واقفیت ہو - صحت کو قائم رکھنے کا علم یقیناً ضروری اور مفید ہے لیکن بجائے خود کافی نہیں جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے - یہی حال ذہنی تعلیم کا ہے - جب تک علم عمل کی کسوٹی پر نہ کسا جائے اور قوت سے فعل میں نہ آئے وہ ایک جسد بے جان ہے معلومات کا ایک جامد اور بے روح مجموعہ ہے - جس سے انسان مطلق فائدہ نہیں اٹھا سکتا - اخلاقی تربیت پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے - بلکہ اخلاق تو نام ہی عمل کا ہے - اس لئے یہاں یہ بات اور بھی

زیادہ وثوق کے ساتھہ کہی جاسکتی ھے کہ بچوں کو بہترین اخلاقی اصول اور عقائد کا یاد کرادینا اور سمجھا دینا اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ ان پر عمل بھی کریں گے - واقفیت اور سمجھہ بجائے خود بہت اچھی چیزیں ھیں اور بالغ و راشد ھوجانے کے بعد انسان کو ھر کام سوچ سمجھہ کر اس کی بھلائی برائی دیکھہ بھال کر کرنا چاھئے ورنہ اس کی حالت بالکل ایک مشین کی سی ھوگی - لیکن محض واقفیت کافی نہیں - اس کے ساتھہ قوت عمل کی بھی ضرورت ھے ' جو مشق یا عادت اور جسم اور دماغ پر قابو حاصل کرنے سے پیدا ھوتی ھے ' اور جوش جذبات کی بھی - جب تک یہ تینوں عناصر جمع نہ ھوں انسان ان طرح طرح کی ترغیبوں اور تحریصوں پر فتح نہیں پاسکتا جو اس کو راہ راست سے بر گشتہ کر دیتی ھیں اور اس کی سیرت اخلاقی اصول و اقتدار کے مطابق تشکیل نہیں پاسکتی - ھمیں یاد رکھنا چاھئے کہ خیالات میں بجائے خود یہ قوت نہیں ھوتی کہ وہ افعال کو اخلاق کے سانچے میں ڈھال دیں - یعنی اگر ھم کسی بچہ کو اخلاق اور نیکی اور راست بازی کے متعلق چند باتیں بتادیں یا ایمانداری ' سچائی ' ھمدردی کی خوبیاں اس کے ذھن نشین کردیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خود بخود با اخلاق نیک اور راستباز بن جائیگا - یہ صفات اس کی سیرت کا جز و صرف اس صورت میں ھوسکتی ھیں جب اس کو روز مرہ کی زندگی میں اس کی مشق کرائی جائے کہ وہ بے ایمانی سے پرھیز کرے اور ایمان داری سے کام لے - جھوٹ سے بچے اور سچ بولے - اپنے دوستوں اور عزیزوں اور ضرورت مندوں کے ساتھہ ھمدردی کرے اور کسی کا دل نہ دکھائے - واقعہ یہ ھے کہ ذھنی تربیت کی طرح اخلاقی تربیت میں ذاتی اور بلاواسطہ تجربے اور اعادے کی اھمیت بہت زیادہ ھے - اخلاق کے دائرے

میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم محض دوسروں کے تجربے سے سیکھہ سکتے ہیں - یہاں قدم قدم پر خود محسوس کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے - بے شک والدین ' اُستاد اور معاشرے کے دوسرے افراد بچوں اور نوجوانوں کو مختلف طریقوں سے اپنے تجربوں کے نتائج سے آگاہ کرتے رہتے ہیں - لیکن جب انہیں خود سبق آموز اخلاقی تجربے حاصل نہ ہوں وہ اُن کی نصیحتوں اور مشوروں کے معنی سمجھہ ہی نہیں سکتے - یہ سچ ہے کہ وہ ہر قسم کے تجربے خود حاصل نہیں کرسکتے لیکن کسی اخلاقی اصول کی تہ تک پہنچنے کے لئے اُنہیں اس نوعیت کے کچھہ نہ کچھہ تجربے ضرور ہونے چاھئیں تا کہ وہ ان کی بنا پر دوسروں کے تجربوں اور ان کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں کو معنی پہنا سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں - اس کی توضیح ایک مثال سے ہوسکتی ہے - فرض کیجئے آپ بحیثیت ایک معلم کے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نوجوان طالب علم کو وطن کی محبت اور وفاداری کا سبق سکھائیں اور یہ اصول اس کے ذہن نشین کریں کہ باھمی ہمدردی اور اشتراک عمل کے بغیر کسی قوم کا کام اچھی طرح نہیں چل سکتا - اس کا ایک پرانا اور مروجہ اصول تو یہ ہے کہ آپ اس موضوع پر لکچر دیں اور نظری طور پر یہ ثابت کر دکھائیں کہ محبت اور ہمدردی نہایت ضروری صفات ہیں جن کا اظہار ہر فرد کے عمل میں اور افراد کے باھمی تعلقات میں ہونا چاھئے - اگر طالب علم کی ذہنی نشو و نما اس حد تک ہو چکی ہے کہ وہ اس بحث اور ان دلائل کو سمجھہ سکتا ہے تو ممکن ہے یہ باتیں اس پر اثر کریں اور وہ اس اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرے - لیکن اس کوشش میں کامیابی بہت مشکل ہے - اول تو جب تک اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ان مطالب کی تعبیر اپنی ذہنی اور عملی زندگی

میں کر سکے وہ ان کی پوری اہمیت کو سمجھہ ہی نہیں سکتا - یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم اور ملک اور اشتراک عمل وغیرہ کا تصور کرنے کے لئے اپنے گھر اور مدرسے کی زندگی اور اس کے مشاغل اور تعلقات کو پیش نظر رکھے - اور ان چیزوں کے اندر سے ان تصورات کی جھلک دکھائی دے - علاوہ بریں یہ اشتراک عمل کا اصول اس وقت تک اس کی عملی زندگی پر محیط نہیں ہوگا جب تک اسے بچپن اور جوانی کے زمانے میں چھوٹے پیمانے پر اس پر عمل کرنے کا موقع نہ ملے - لہذا مندرجہ بالا مثال میں معلم کو پوری کامیابی اسی صورت میں حاصل ہو گی جب بچوں کی خانگی اور مدرسے کی زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ انہیں ہر روز امداد باہمی مبادلہ خیالات اور تجربات میں شرکت کے مواقع ملیں اور عملاً ان کے دل میں اس جماعت یا گروہ کے ساتھہ وفاداری کا احساس پیدا ہو جس کے وہ رکن ہیں اور جس کی رکنیت کی وجہ سے انہیں بہت سے حقوق اور اختیارات حاصل ہوتے ہیں - اگر ابتدائی زندگی میں انہیں مسلسل اس قسم کے واقعی تجربے حاصل ہونگے تو جب وہ آیندہ بڑی جماعتوں کے رکن بنیں گے تو وہ قومیت اور شہریت کا صحیح مفہوم سمجھیں گے اور اس رشتہ کی اہمیت کو پہچانیں گے جو فرد اور جماعت میں ربط پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھہ چکے ہوں گے کہ ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی کامیابی اور قیام کے لئے ایسے ہی تعلقات کی ضرورت ہے - علاوہ بریں وہ ذہنی اور جسمانی عادتیں جو اس اجتماعی زندگی کے بسر کرنے سے قائم ہونگی آگے چل کر بہت کام آئیں گی اور ان کے راستہ میں یہ رکاوت حائل نہ ہوگی جو عام طور پر پیش آتی ہے کہ "دل تو آمادہ ہے لیکن جسم میں سکت نہیں" -

اس مثال سے ایک اور اہم تعلیمی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کو ایسے اخلاقی اصول اور قوانین نہیں بتانے چاہئیں جن کی ضرورت انہیں ابھی اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوئی اور جن کا تعلق اُن حالات اور مواقع سے ہے جن سے بچوں کو سابقہ نہیں پڑا - بالفاظ دیگر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اگر مدرسے کو ایک اثر آفرین اخلاقی ماحول بنانا مقصود ہے تو اس میں بچوں کے لئے ایسے عملی مواقع اور وسائل مہیا کرنے چاہیں جن میں اخلاقی اصول و قوانین کی ضرورت پڑے اور نو عمر طالب علم بعض صورتوں میں ان کو نظری طور پر سمجھنے سے پہلے ہی ان پر عمل کرنے لگیں اور اس طرح ان میں اخلاقی عادتیں پختہ ہو جائیں - بعض ماہرین تعلیم اور ارباب فکر کا یہ خیال ہے کہ بچوں کی مطلق کوئی عادتیں ڈالنی ہی نہیں چاہئیں - چنانچہ روسو (Rousseau) کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ :—

" امیل (Emile) کی صرف یہ عادت ڈالنی چاہئے
کہ وہ کوئی عادت نہ ڈالے "

لیکن یہ خیال جو در اصل بعض خاص حالات کے خلاف رد عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا ' غلط ہے اور نفسیات اطفال کا عام اس کی تائید نہیں کرتا - بچوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اوائل عمر ہی میں مفید اور عمدہ عادتیں سیکھیں جو آئندہ چل کر ان کے لئے سہولت کا باعث ہوں - اس معاملہ میں مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمز (Willaim James) کی رائے زیادہ صائب ہے - وہ کہتا ہے کہ عمدہ عادتوں کو بطور ایک سرمائے کے سمجھنا چاہئے - کہ جب ہم اسے جمع کرلیتے ہیں تو اس کا سود ہمیں عمر بھر ملتا رہتا ہے [1] - ان عادتوں کی وجہ سے

[1] دیکھو ان کی مشہور تعلیمی تصنیف " Talks to Teachers " (مضمون سے دو دو باتیں)

انسان اپنے روز مرہ کے معمول اور معینہ فرائض کو بغیر کسی دقت یا تامل کے پورا کر لیتا ھے اور جب کوئی نازک یا کٹھن موقع آکر ہوتا ھے تو وہ ان عادتوں کے بل پر اکثر بڑے بڑے کام کر جاتا ھے اور عارضی اور وقتی تحریصات پر غالب آجاتا ھے اس لئے موجودہ زمانے کے اکثر ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ھیں کہ مدرسے کو ایک خوشگوار ماحول اور خوش اسلوب جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاھئے جس میں حقوق اور فرائض کی باقاعدہ تقسیم ھو ' جس کو تمام اراکین جماعت خوشی کے ساتھہ قبول کریں ' اور جماعتی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے فرائض محنت اور شوق سے ادا کریں اور اپنے حقوق سے جائز طور پر فائدہ اتھائیں - اس طرح وہ قدرتی طور پر اخلاقی مسائل اور مشکلات سے دو چار ھوں گے اور خود بخود ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے - ان کی کامیابی اور ناکامی ان کے لئے معلم کا کام دے گی اور وہ ایک مصروف ' عملی زندگی کے دوران میں بعض اہم ترین اخلاقی اصول سیکھہ لیں گے - بہت سے جدید تعلیمی تجربے مثلاً مس ھیلن پار کھرسٹ (Helen Parkhurst) کا طریقہ ڈالٹن (Dalton Plan) اور میڈم مانٹسوری (Montessori) کے مدرسے اسی اصول پر قائم ھیں کہ طلبہ میں احساس' فرض اور انفرادی اور اجتماعی قوت عمل اس وقت پیدا ھوسکتی ھے جب انھیں ابتدا ھی سے چھوٹے چھوٹے فرائض کی بجا آوری کی عادت ڈالی جائے جن کو وہ اپنی مرضی اور خوشی سے بغیر بیرونی مداخلت کے انجام دے سکیں - جن مدرسوں میں تقسیم فرائض کا یہ تجربہ کیا گیا ھے وھاں ثابت ھوا ھے کہ اس طرح طلبہ میں نہایت مفید اخلاقی عادتیں پیدا ھوجاتی ھیں جو انھیں عمر بھر کام دیتی ھیں بشرطیکہ معلم اپنی مثال اور شخصیت کے اثر سے ان میں جوش

اور خلوص کو قائم رکھے - جہاں کہیں منصوبی طریقہ (Project Method) استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی یہی تجربہ ہوا ہے کہ اس سے نہ صرف ذہنی بیداری اور قوت اجتہاد پیدا ہوتی ہے بلکہ شخصی ذمہ داری اور امداد باہمی کا احساس بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے جو اخلاقی سیرت کی تکمیل کے لئے بہت ضروری ہے - لہذا معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا سب سے موثر اور اہم وسیلہ یہ ہے کہ مدرسے کی معاشری زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ طلبہ عملاً ان تجربوں کو حاصل کریں جن پر اخلاق کا انحصار ہے -

بعض ماہرین تعلیم بالخصوص امریکہ کے تعلیمی مفکرین کا خیال ہے کہ اخلاقی اور معاشری تربیت بالکل ہم معنی ہیں اور ان دونوں کے حدود ایک ہی ہیں - یعنی اگر ہم کسی شخص کو معاشری زندگی کے تمام فرائض سکھادیں اور اسے ان کی ادائگی کے لئے تیار کردیں تو اس کی اخلاقی تربیت بھی مکمل ہو جائے گی - ہمیں اس نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق نہیں - یہ مانا کہ اخلاقی تربیت کا ایک بہت بڑا حصہ ان حقوق و فرائض پر مشتمل ہے جو معاشری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اخلاق کا دائرہ ان تعلقات کی حدود سے بھی زیادہ وسیع ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے ساتھہ وابستہ کرتے ہیں - مشرق کے معلمین اخلاق نے ان حقوق کو جو کسی فرد پر عائد ہوتے ہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے - اول حقوق اللہ یعنی وہ حقوق جو خالق کو اپنے بندوں پر حاصل ہیں اور جن کو پہچانے اور ادا کئے بغیر انسان اپنی پوری حقیقت کو نہیں سمجھہ سکتا - دوسرے حقوق العباد یعنی وہ حقوق جو ہمارے ابنائے جنس کو ہم پر حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھہ ایک رشتہ میں مربوط ہیں - تیسرے

حقوق النفس یعنی وہ حقوق جو خود ہمارے نفس کو ہم پر حاصل ہیں - انسان کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے حقوق کو دیانتداری کے ساتھہ ادا کرے - وہ لوگ جو اخلاقی تربیت کو معاشری تربیت کا مرادف قرار دیتے ہیں محض حقوق العباد پر زور دیتے ہیں باقی دونوں قسموں کے حقوق کی پوری اهمیت تسلیم نہیں کرتے - ممکن ہے کہ نظری طور پر فلسفہ ان تینوں کو ایک ثابت کردے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ تمام حقوق وفرائض ایک دوسرے سے وابستہ اور مربوط ہیں ' بالکل علحدہ اور بے تعلق نہیں - لیکن عمل کے اعتبار سے ان کی نوعیت میں فرق ہے - کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اپنے معاشری فرائض ادا کرتا ہو لیکن حقوق اللہ اور حقوق نفس کی طرف سے بالکل غافل ہو ؟ مثلاً وہ معاشری خدمت انجام دے ' ہمسایں اور شہر والوں کے حقوق ادا کرے - لیکن ان قدروں سے بے اعتنائی برتے جن کا حامل مذہب ہے - یا وہ اپنی جسمانی صحت اور تہذیب نفس کی مطلق پروا نہ کرے اور اسے اس کا احساس نہ ہو کہ خود اس کی ذات میں اعلی درجہ کی صلاحیتیں موجود ہیں جن کو قوت سے فعل میں لانا اس کا فرض ہے - علاوہ بریں جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اخلاق کی تکمیل کے لئے محض معاشری محرکات اور موانعات کافی نہیں یعنی کسی شخص کو اچھے کام محض اس لئے نہیں کرنے چاھئیں کہ معاشرے کے فرائض اور اخلاقی اصول اس کے متقاضی ہیں - نہ برے کاموں سے صرف اس وجہ سے پرھیز کرنا چاھئے کہ وہ معاشری اخلاق کے خلاف ہوں گے - مکمل اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ جب انسان بالکل تنہا ہو یعنی سوائے اپنی ذات یا اپنے ضمیر کے اس کا کوئی نگراں نہ ہو اس وقت بھی اس کے خیالات اور جذبات میں پاکیزگی پائی جائے اور وہ خیال میں بھی برے افعال کا مرتکب نہ ہو - وہ اس بات کو محسوس کرے کہ ایمان ' دیانت

داری ' راستی اور پاکبازی نہ صرف اس لئے ضروری ھے کہ ان کی وجہ سے معاشری کار و بار اچھی طرح چلتے ھیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا اور عزت نفس کو برقرار نہیں رکھہ سکتا - اس طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ھے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھہ محبت اور عبودیت کے وہ جذبات رکھے جو اس کی مختصر اور بظاہر بے معنی زندگی کو ابدی اور روحانی قدروں سے وابستہ کرتے ھیں اور اس کا رشتہ سر چشمہ حیات سے جوڑتے ھیں ' اگرچہ ان کا اثر براہ راست معاشری تعلقات پر نہیں پڑتا اور نہ ان کی جڑ معاشری زندگی میں تلاش کی جاسکتی ھے - یہ وہ مقام ھے جہاں اخلاق اور مذھب کی حدیں آکر مل جاتی ھیں اور انسان اپنے اعمال اور خیالات کا محاسبہ محض معاشری اخلاق کی بنا پر نہیں کرتا بلکہ احترام ذات اور قانون الہی کو اپنا رھبر بنا کر ان کی اصلاح کرتا ھے اور جہاں انسانی قانون کا دسترس نہیں وھاں بھی اپنے آپ کو ایک اعلی تر قانون کا پابند جانتا ھے -

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے بعد ھمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اخلاقی تربیت کا بہت بڑا حصہ معاشری زندگی سے تعلق رکھتا ھے اور طلبہ کی تربیت اس طرح ھوسکتی ھے کہ وہ مدرسے کی معاشری زندگی ' اس کی کشمکش اور جد و جہد میں پوری طرح حصہ لیں اور جو عملی مواقع وھاں بہم پہنچائے گئے ھیں ان سے پورا فائدہ اٹھائیں - جس تربیت کی بنیاد بچوں کے گونا گوں معاشری تجربات پر نہ رکھی جائے گی اس کا اثر بہت جلد زائل ھوجائیگا اور اس سے آیندہ زندگی کے معاملات میں کام لینا ممکن نہ ھوگا - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اخلاق اور معاشرت کے قریبی تعلق سے بحث کرتے ھوئے لکھتے ھیں:—

" اخلاقی تربیت کے متعلق ہمارے جو تصورات اب تک رہے ہیں وہ سب بہت تنگ اور محدود تھے اور ان کی بنا زیادہ تر رسم و دستور پر تھی اور ان کا تعلق محض معاشرت کی حالت مرض سے تھا - ہم نے اخلاق کے مفہوم کو چند مخصوص اعمال کے ساتھ وابستہ کردیا ہے جن کو ہم " نیکیاں " کہتے ہیں اور انہیں باقی تمام مشاغل اور کاروبار سے بالکل علحدہ سمجھتے ہیں - یعنی اخلاقی اعمال ' معاشری ماحول سے جدا کرکے دیکھے جاتے ہیں ..حالانکہ درحقیقت انسانی زندگی میں سوائے اسکے اور کوئی اخلاقی محرکات اور اخلاقی قوتیں نہیں ہیں کہ انسان میں معاشری عقل ہو' یعنی معاشری معاملات اور حالات کا مشاہدہ کرنے اور ان کو سمجھنے کی قابلیت ' اور معاشری قوت ہو' یعنی ضبط نفس کی تربیت یافتہ صلاحیتیں جو معاشری اعراض و مقاصد کے حاصل کرنے میں استعمال ہوسکیں " - [۱] -

لیکن مدرسے کو اثر آفریں اخلاقی ماحول بنانے کے لئے ایک شرط نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا اور بیرونی دنیا کا تعلق برابر قائم رہے تاکہ وہ ایک قدرتی ماحول کی شکل اختیار کرے نہ کہ ایک بالکل مصنوعی ماحول کی جس میں بچے گرم خانے کے پودوں کی طرح نشو و نما پائیں - مدرسہ ایک ادارہ ہے جس کو معاشرے نے اپنی حیات اجتماعی کی بقا اور ترقی کے لئے قائم کیا ہے تاکہ جن اصولوں اور قدروں کو وہ عزیز رکھتی ہے اور اہم سمجھتا ہے وہ ایک نسل سے دوسری نسل

---

[۱] Educational Essays صفحہ ۵۷ - ۵۸ -

تک منتقل کی جائیں - اسی وجہ سے مدرسے پر بہت بڑی اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے - جس سے وہ اس وقت تک عہد برآ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اندرونی تنظیم انہیں اصولوں کے ماتحت نہ ہو جو بیرونی دنیا میں کار فرما ہیں - اسے اپنے نوعمر طلبہ میں ایسے معاشری عادات اور جذبات پیدا کرنی چاہئیں کہ جب وہ اس چھوتے سے دائرے سے باہر نکل کر معاشرے کی زندگی کے وسیع میدان میں قدم رکھیں تو انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں - جہاں کے دستور و قوانین بالکل مختلف ہیں - اس سے یہ مراد نہیں کہ مدرسے میں معاشری زندگی کے خراب عناصر کو بھی جگہ دیجائے مثلاً افراد اور جماعتوں کی باہمی نزاع اور مسابقت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش کو جس کا آج کل دور دورہ ہے - اس لئے کہ جیسا ہم کتاب کے آغاز ہی میں بتا چکے ہیں مدرسے معاشرے کا ایک چھوٹا سا نمونہ تو ضرور ہے لیکن ایک عمدہ اور منتخب نمونہ ہے - لہذا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو بہترین معاشری حالات بیرونی دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ مدرسے میں پیدا کریں - اگر ہمارے مدرسے زندگی کی کشمکش اور اس کے رسم و آئین سے بے تعلق اور نا واقف رہیں گے ' جیسے وہ آجکل بالعموم رہتے ہیں ' تو نہ ان میں بچوں کی مکمل ذہنی تربیت ہوسکے گی نہ اخلاقی - ان کے پیش نظر جو مقاصد ہیں ان کا مطلب اور مفہوم واضح نہیں ہوسکے گا کیونکہ بچوں میں ہم جن قوتوں کو نشو و نما دینا چاہتے ہیں ان کو آیندہ معاشری زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونا ہے - اگر ان قوتوں کی نشو و نما ایک مصنوعی ماحول میں ہو اور ان میں اور زندگی کے واقعی مشاغل میں ربط نہ پیدا کیا جائے تو ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ مدرسے کی تربیت اس

کے باہر بھی کام آئیگی ؟ - اس لئے مدرسے کے مشاغل کی اخلاقی قدر کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں معاشرے کے مشاغل کو معیار قرار دینا چاہئے - اور انہیں کو پیش نظر رکھہ کر نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کا تعین کرنا چاہئے - یعنی مدرسے کو ایک زندہ معاشری ادارہ بنانا چاہئے جس میں مفید عادتیں اور رجحانات تربیت پائیں - جس طرح تیرنا سیکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ آدمی پانی میں کود پڑے اور ہاتھہ پاؤں مارے اسی طرح اخلاقی سیرت کی تعمیر بھی صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ گھر میں اور مدرسے میں بچہ ایسے کاموں میں مشغول رہے جو اخلاقی اور عمرانی اہمیت رکھتے ہوں - نہ تیرنا ہوا میں تیراکی کے کرتب دکھانے اور اس کے گُر یاد کرنے سے آتا ہے نہ اخلاقی سیرت کی تکمیل اس زبانی اور نظری تعلیم سے ہو سکتی ہے - جو طلبہ کی روز مرہ کی زندگی سے بالکل بے تعلق اور بے ربط ہو - " مدرسہ اس وقت تک طلبہ کو معاشری زندگی کے لئے تیار نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنے گرد و پیش کے خاص خاص اہم ترین معاشری حالات کا نمونہ اپنے اندر مہیا نہ کرلے " کیونکہ کسی کام کے لئے تیاری کا موثر ذریعہ یہی ہے کہ اس کام میں عملاً شرکت کی جائے - اس لئے مدرسہ جدید کا تمام نظام اس طرح مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے طلبہ کے محرکات عمل معاشری ہوں اور ان کے پڑھنے ، لکھنے ، کھیلنے ، کودنے غرض تمام مشاغل میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کا وہی اصول کارفرما ہو جس پر تمدنی زندگی کا دارومدار ہے -

ہم اس بات پر بار بار زور دے چکے ہیں کہ تعلیم کے ہر شعبے میں ہمیں اس وحدت کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو طلبہ کے نفس کی خصوصیت ہے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے مربوط اور سابقہ رکھتی ہے - ہم ان کی شخصیت کو عملاً دماغی ، جسمانی ، معاشری اور اخلاقی شعبوں میں تقسیم نہیں کرسکتے - وہ

ہر کام اور ہربات میں اپنی پوری شخصیت کا اظہار کرتا ہے گو یہ ممکن ہے کہ ایک خاص وقت میں اس کا کوئی ایک پہلو مثلاً عقلی یا اخلاقی پہلو زیادہ نمایاں ہو اور باقی سب پوری طرح ظاہر نہ ہوں - اس لئے اس کی شخصیت کی مکمل ' متناسب اور ہم آہنگ تربیت اس وقت ہو سکتی ہے جب اسکے ماحول کے تمام اثرات کا رجحان ایک ہی ہو ' جب مدرسہ اور گھر دونوں اس کو ایک ہی معیار اخلاق کے مطابق تعلیم دیں اور تعلیمی زندگی کا ہر پہلو ' مطالعہ ' کھیل ' نصاب تعلیم ' ضبط و تادیب اپنی اپنی جگہہ پر اس کی سیرت کی صحیح تشکیل میں حصہ لے - مدرسے کے اس مجموعی نظام اور طلبہ کی معاشری زندگی کا اثر ان کی سیرت پر نہایت زبردست اور دیر پا ہوتا ہے - بشرطیکہ اس کے تمام عناصر یعنی اُستادوں کی سیرت اور شخصیت ان کا طرز تعلیم مدرسے کے تعلیمی مقاصد ان کی عام فضا یہ سب چیزیں بچوں کی اخلاقی تربیت میں مدد دیں اور ان کی ذہنی تعلیم ان کی روز مرہ کی زندگی کا جزو بنادی جائے ' اس سے اس طرح علحدہ نہ رکھی جائے جیسے اسے اخلاقی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں - ہم ابھی یہ بحث کریں گے کہ ان تمام عناصر کو اخلاقی تربیت میں کہاں تک دخل ہے - لیکن اس بحث کی ضرورت اسی وقت سمجھہ میں آسکتی ہے جب ہم اخلاق کے مذکورہ بالا مفہوم ذہن میں رکھیں - اخلاق کا اطلاق ان تمام کاموں اور باتوں پر ہوتا ہے جو ہم روز کرتے رہتے ہیں - جس طرح معاشری زندگی میں ایک بالغ آدمی کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں بچہ کی مختلف حیثیتیں ہیں - اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ ان تمام حیثیتوں میں اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھہ اصول اخلاق کے مطابق ادا کرے تو نہ صرف اسکے جذبات کی تربیت ضروری

ہے بلکہ اس کے جسم اور دماغ اور عادات سب کی نشو و نما ایسی ہم آہنگی کے ساتھہ کرنی چاھئے کہ وہ اس کی زندگی کے انتہائی اخلاقی مقصد میں معین ہوں - اس لحاظ سے ایک طالب علم کو تاریخ ' ادب یا سائنس کی مناسب تعلیم دینا ' اس کی طبیعت میں فنون لطیفہ کا ذوق پیدا کرنا ' اسے علمی تحقیقات اور اختراع کا شوق دلانا اور اس کے طریقے سکھانا ' مادری زبان یا غیر زبانیں پڑھانا جن کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے خیالات اور جذبات خود سمجھہ سکے اور اپنے خیالات دوسروں کو سمجھا سکے ' اس کی جسمانی نگہداشت کا اہتمام کرنا ' اس کے آنکہ اور ہاتھہ کی اس طرح تربیت کرنا کہ وہ اپنے اندرونی جذبات اور میلانات کو کسی مرئی شکل میں ظاہر کرسکے ' اس کو محنت ' کوشش اور امداد باھمی کی عادتیں سکھانا ' یہ سب وسیع معنی میں اخلاقی تربیت کے اجزا ہیں بشرطیکہ بچہ ان تمام صلاحیتوں کو اس طرح استعمال کرے کہ ان سے نہ صرف اسکی ذات کو فائدہ پہنچے بلکہ عمرانی مقاصد میں بھی امداد ملے - اگر مدرسہ اپنے ہر کام میں اخلاقی مقصد کو مقدم رکھے گا تو وہ طلبہ کی شخصیت کو مستقل طور پر جیسا چاھئے متاثر کرسکے گا -

باب سوم

عقلی اور اخلاقی تربیت کا تعلق

عقل اور اخلاق کا تعلق

مدرسے کی اخلاقی تنظیم کے معاملے میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم،عقل اور اخلاق میں کیا تعلق ہے اور عقلی تربیت کس طرح اخلاقی تربیت میں معین ہو سکتی ہے - اس مسئلے میں ارباب فکر کے درمیان اختلاف رہا ہے - مثلاً افلاطون ' کانٹ وغیرہ کا خیال ہے کہ عقل ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی بصیرت پیدا ہوتی ہے اور عقل ہی اخلاقی افعال کی محرک ہوتی ہے - بر خلاف اسکے بعض حکما کا خیال ہے کہ انسان عقل کی بھول بھلیاں میں پڑ کر اکثر سیدھے راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور اس قوت کو دوسروں کے نقصان اور تخریب کے لئے استعمال کرتا ہے - بعض نے عقل اور وجدان یا عقل اور عشق کو متضاد ٹھہرا کر انسان کو فریب خرد سے متنبہ کیا ہے - چنانچہ منجملہ اور بہت سے مشرقی شعراء اور فلسفیوں کے اقبال نے بھی اپنے کلام میں جا بجا اس مضمون کو ادا کیا ہے نقش فرنگ [۱] میں " پیام " کے عنوان سے وہ دانایان فرنگ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں :—

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بجگرمی زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است

---

[۱] " پیام مشرق " کا ایک حصہ -

چشم جز رنگ گل ولالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است
آتش اندوختۂ دل زکف انداختۂ
آہ زاں نقد گرانمایہ کہ درباختۂ !

علاوہ اِن فلسفیانہ خیالات کے عام لوگوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ عقل اور اخلاق ایک دوسرے کی ضد نہیں تو کم از کم ایک دوسرے سے بے تعلق ضرور ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ روز مرہ کے معاملات میں دانشمندی اور تدبر کا تقاضا کچھہ اور ہوتا ہے اور اخلاق کا کچھہ اور کم از کم نظری طور پر وہ اخلاق کے حکم کو عقل کے مشورے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں - ہمارے ملک میں عقل اور اخلاق کی یہ تقسیم اور تفریق بہت عام ہے - ہم لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ فلاں شخص بے وقوف تو ہے مگر نیک بہت ہے - یا اس کا دل تو بہت اچھا لیکن دماغ کمزور ہے اور بالعموم اس قسم کے جملے تعریف کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں - یہاں نیکی اور دل کا تعلق اخلاق سے فرض کیا گیا ہے - اور دانشمندی اور دماغ کا تعلق عقل سے ' اور اگر ایک شخص کے اخلاق میں کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو تو اس کے بیوقوف یا سادہ لوح ہونے میں چنداں نقصان نہیں سمجھا جاتا - ہم نے انسانی شخصیت کی تہ میں جس وحدت کو کار فرما تسلیم کیا ہے اس کے لحاظ سے ہم اس تضاد کو صحیح نہیں سمجھہ سکتے - اگر بالفرض ہم اس " بیوقوف لیکن نیک " شخص کی نیک نیتی کے معترف بھی ہوں تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا آدمی اپنے نیک ارادوں کو عمل میں نہیں لاسکتا کیونکہ ارادے کو فعل میں لانے

کے لئے عقل اور علم درکار ہیں جو اس میں موجود نہیں - اول تو اس کے لئے یہی بہت مشکل ہے کہ زندگی کے پیچ در پیچ معاملات میں صحیح رائے قائم کرسکے اور سمجھہ سکے کہ کس موقع پر کونسا طریق عمل نیک اور " اخلاق " کے مطابق ہے اور کونسا اس کے منافی - دوسرے اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ کسی خاص موقع پر وہ یہ سمجھہ سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاهئے تو اس میں وہ مصلحت بینی ' دور اندیشی اور مشکلات کو حسن تدبیر سے دور کرنے کی قابلیت کہاں سے آئے گی جو اخلاقی فعال کے لئے ناگریز ہے - اس لئے جس شخص کے افعال و اعمال علم و عقل کی هدایت سے محروم هوں گے وہ صحیح معنی میں اخلاقی زندگی بسر نہیں کرسکتا - یہ ممکن ہے کہ وہ ایک مشین کے پرزے کی طرح دوسروں کے اشارے پر چلے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرے اور اس کے هاتھہ سے " اچھے " کام عمل میں آئیں لیکن اس قسم کے افعال کی وہ اخلاقی قدر نہیں هوسکتی جو ایک سمجھدار اور معاملہ فہم آدمی کے کاموں کی هوتی ہے جس کے دل میں ذمہ‌داری کا احساس ہے اور جس کے اعمال کی محرک اس کی اپنی تربیت یافتہ ذات ہے - علاوہ بریں زندگی میں جدت اور تنوع کی کارفرمائی ہے - اس میں آئے دن نئے مسائل اور نئے مواقع پیش آتے رهتے هیں - یہاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کسی ایک معمول کا دهراتے رهنا هرگز کافی نہیں هوسکتا - اسی لئے اور بھی عقل کی ضرورت ہے کہ وہ هر نئی گتھی کو سلجھاتی رہے - اگر همارے مشین نما " نیک آدمی " کو کوئی ایسا نیا موقع پیش آجائے جہاں وہ اپنے مقررہ طریقہ عمل کو کام میں نہ لاسکے تو وہ بالکل بے بس هوکر رہ جائے گا اور ممکن ہے وہ کوئی بہت خطر ناک غلطی کر بیٹھے - اسی لئے کہا گیا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے -

علم اور اخلاق کے اس لازمی رشتے پر جس کا هم نے ذکر کیا هے ایک اعتراض عام طور پر کیا جاتا هے - کہا جاتا هے کہ علم بجائے خود حسن عمل کے لئے کافی نہیں - تجربہ اس بات کی شہادت دیتا هے کہ بہت سے لوگوں کو معلوم هوتا هے کہ فلاں بات اچھی هے اور فلاں بات بری هے - لیکن وہ اس علم پر عمل نہیں کرتے اور اچھی باتوں کو چھوڑ کر بری باتوں کی طرف راغب هوتے هیں - لہذا ان کو "جاننے" سے کیا فائدہ ؟ یہ وهی اعتراض هے جو ارسطو نے سقراط کے اس مشہور قول پر کیا تھا کہ علم " اور خیر ایک هی چیز هے اور کوئی شخص جان بوجھ کر شر کا مرتکب نہیں هوتا بلکہ انجان پن کی وجہ سے ایسا کرتا هے - بادی‌النظر میں سقراط کا یہ خیال بالکل غلط معلوم هوتا هے کیونکہ هم آئے دن یہ دیکھتے هیں کہ لوگ باوجود خیر کا عام هونے کے شر کے مرتکب هوتے هیں - لیکن یہ اعتراض در اصل علم کے غلط مفہوم پر مبنی هے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاق کے نظریوں سے بحث کرتے هوئے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا هے اور بتایا هے کہ " علم " سے سقراط کی مراد سطحی واقفیت نہیں جو دوسروں کی وساطت سے حاصل هو اور ذهن پر محض ایک بار هوکر رہ جائے - اس کی رائے میں " نظری طور پر خیر کا مفہوم سمجھنا (یعنی اس کا حقیقی علم حاصل کرنا) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان سالہا سال ضبط نفس اور عمل کی منزلوں میں سے نہ گزر چکا هو - خیر کا علم ایسی چیز نہیں جو کتابوں سے یا دوسرے لوگوں سے هاتھ آسکے - وہ طویل اور مسلسل تربیت کے بعد نصیب هوتا هے اور زندگی کے پختہ کارانہ تجربات کا ماحصل هے " [1]

---

[1] Democracy and Education صفحہ ۳۱۲ -

بات یہ ہے کہ "علم" کا ایک لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے - اس کے ایک معنی تو وہ ہیں جو افلاطون کے پیش نظر تھے - یعنی وہ مضبوط اور راسخ عقیدہ جو ذاتی تجربے اور تنقید کے بعد حاصل ہو اور انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے - یہ علم کا حقیقی اور گہرا مفہوم ہے - دوسرے معنی وہ ہیں جو بالعموم لوگوں میں اور بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں بھی رائج ہیں یعنی وہ سطحی واقفیت جو دوسروں کے واسطہ سے حاصل ہوجائے ' جس میں ہمیں ذاتی کاوش نہ کرنی پڑے اور ہمارے ذاتی تجربے اور مشاہدہ کو دخل نہ ہو - اگر علم سے ہماری مراد یہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر ہماری سیرت اور ہمارے طرز عمل پر یا تو بالکل نہ ہوگا یا اتنا کم کہ نہ ہونے کے برابر ہو - مدرسے کے طلبہ جو باتیں کتابوں میں پڑھ کر یا استادوں سے سن کر یاد کر لیتے ہیں ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے ' اور اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتا ' کہ وہ ضرورت کے وقت ان باتوں کو دھرا دیں - ان کی وجہ سے ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوسکتا - علم کا یہ مفہوم صریحاً بہت ناقص اور محدود ہے اور اُستاد کو ہرگز اس قسم کا علم سکھانے پر قناعت نہیں کرنی چاہئے - وہ ہرگز یہ توقع نہیں رکھہ سکتا ہے کہ اس "علم" کو اخلاقی تربیت میں ذرا بھی دخل ہوگا - تعجب یہ ہے کہ ایک طرف ہم تعمیر سیرت کو تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف تعلیم کے عقلی پہلو کو جس میں مدرسے کا بیشتر وقت صرف ہوتا ہے ہم نے ایسے غلط اصولوں پر مبنی کیا ہے کہ اس سے اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل میں کوئی مدد ملتی - اس دوئی کی وجہ سے اخلاقی تعلیم بالکل بے معنی اور بے اثر ہوکر رہ جاتی ہے - مدرسے کا معمول اپنی بندھی تکی چال چلتا رہتا ہے

اور اس کو اخلاقی تربیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا البتہ بعض خاص موقعوں پر اُستاد اپنے طلبہ کو اخلاق اور فرائض کے متعلق چند باتیں بتا دیتے ہیں جن کو وہ کم و بیش بددلی کے ساتھ سنتے ہیں اور ضرورت ہو تو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں - ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں وہ اُستادوں یا بزرگوں یا معاشرے کی خاطر ان باتوں پر ایک حد تک عمل بھی کریں - لیکن اس عمل کا محرک ان کی عقل یا ان کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خارجی اثر ہوتا ہے - کبھی صورت حال اس سے بھی بد تر ہوجاتی ہے یعنی اخلاقی ہدایتیں جبراً ان در عائد کی جاتی ہیں جن کو وہ بغیر سمجھے بوجھے محض خوف کی وجہ سے قبول کرلیتے ہیں - اس حالت میں بھی ان کے عمل کی ذمہ‌داری دوسرے لوگوں پر ہے - جب کبھی رائے عامہ کا دباؤ یا اُستاد کا اندیشہ دور ہوجاتا ہے تو اس کا اثر بہت خراب پڑتا ہے یعنی انسان کا اخلاقی توازن بالکل بگڑ جاتا ہے - چونکہ خود اس کے نفس میں کسی قسم کا اخلاقی ضبط نہیں ہوتا اور بیرونی اثرات جو اس کو ایک حد تک روکے ہوئے تھے ہٹ جاتے ہیں اس لئے وہ موقع پاتے ہی کھل کھیلتا ہے اور اخلاقی اصول اور قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات اور خارجی تحریصات کا غلام ہوکر رہ جاتا ہے - اس کے علم اور اخلاق کے درمیان کوئی ایسا مضبوط اور مستحکم رابطہ قائم نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذاتی ہدایت کی ذمہ‌داری اپنے سر لے سکے - یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب مدرسے کے تعلیمی نظام کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ وہاں بچے جو کچھ سیکھیں ' جو علم حاصل کریں اس کا اثر براہ راست ان کے طرز عمل پر پڑے - شوق اس کا محرک ہو اور تجربہ اور مشاہدہ اس کی بنیاد ' اور اس طرح وہ عقیدے کی سی پختگی حاصل کرے اور خود بخود ہماری طبیعت میں اور ہمارے

کاموں میں ظاہر ہو - روز مرہ کی زندگی میں ہم ہر وقت اس علم کو استعمال کرتے ہیں جو اس درجہ ہماری طبیعت اور سیرت کا جزو ہوگیا ہے کہ اسے نظر انداز کرنے کا خیال بھی ہمیں کبھی نہیں آسکتا - اس کی مثالیں ہر وقت ہمارے سامنے ہیں -

"جب کبھی کوئی شخص بجائے جلتے ہوئے چولھے پر بیٹھنے کے کرسی پر بیٹھتا ہے یا بارش میں چھتری لیکر نکلتا ہے یا بیماری میں ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہے یا ان ہزاروں کاموں میں سے جو اس کا روز مرہ کا معمول ہیں کوئی کام کرتا ہے تو وہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ علم ایک خاص حالت کو پہنچ کر خود بخود عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے" - [۱]

علم کی یہ خاص حالت اسی وقت ہوسکتی ہے جب انسان اس کو اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ حاصل کرے اور وہ اس طرح اس کی طبیعت میں رچ بچ جائے کہ اس کو بھولنا یا اس کی طرف سے بے پروائی برتنا ممکن ہی نہ ہو بلکہ استعمال کے وقت اس کو شعوری طریقے پر سوچنے کی ضرورت بھی نہ پڑے - یہی اصول اخلاق پر ، جو ہماری زندگی کی رہنمائی کرتا ہے ، صادق آتا ہے اگرچہ اس کے حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں زیادہ مشکلات ہیں اور زیادہ عقلمندی کی ضرورت ہے - جب ہم خیر اور اخلاق کا مفہوم اور اپنے فرائض کی ادائگی کا سبق گھر کی عملی درسگاہ میں یا مدرسے کے منظم ماحول میں ، یا بیرونی دنیا کی کشمکش میں سیکھتے ہیں اور خود ہمارے تجربات اور مشاہدات ہمارے معلم ہوتے ہیں تو یہ چیزیں ہمارے فلسفہ زندگی

[۱] Democracy and Education صفحہ ۲۱۲ -

کا جزو بن جاتی ہیں اور ہمارے محرکات عمل میں شامل ہوجاتی ہیں - یہاں علم و عمل ، عقل و اِخلاق کی وہ تفریق مٹ جاتی ہے جس کی وجہ سے آج کل ہمارے مدرسوں کی تعلیم اس درجہ ناقص ہوگئی ہے -

علم و اخلاق کی اس بحث سے مدرسے کی تنظیم کے متعلق کئی قابل قدر نتائج نکلتے ہیں - اگر ہم ان دونوں کے درمیان یہ رشتہ تسلیم کریں تو اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے کو ایک عمرانی جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہئے جس کے ہر شعبے میں معاشری اصول اور محرکات کی کار فرمائی ہو یعنی بچے ایسے مشاغل میں مصروف ہوں جو ایک دوسرے کی مدد سے تکمیل کو پہنچائے جائیں اور جن کی بدولت وہ معاشری معاملات کو سمجھنا اور اس میں دلچسپی لینا سیکھیں - وہ ایک دوسرے کے ساتھہ مل کر کام کریں ، کھیلیں ، کودیں ، کھائیں ، پئیں اور مختلف قسم کی انجمنیں بناکر فرصت کے اوقات میں اپنے اپنے پسندیدہ مشاغل سے لطف اور فائدہ اٹھائیں - اور اس طرح ان عمرانی اور اخلاقی اصولوں کی اہمیت اور مفہوم کو سمجھیں جن کا ذکر وہ کتابوں میں پڑھتے ہیں یا اُستادوں سے سنتے ہیں - اس تبدیلی سے مدرسے کا وہ پرانہ مفہوم قائم نہیں رہیگا جس کے مطابق یہ محض ایک " جائے درس " سمجھا جاتا ہے جہاں بچے لکھنے پڑھنے آتے ہیں جس کو ان کی جبلتوں اور فطری دلچسپیوں اور بیرونی دنیا سے کوئی سروکار نہیں اس کے بجائے ہم مدرسے کو جیسا کہ ہم وضاحت کے ساتھہ بتا چکے ہیں ، چھوٹے پیمانے پر جماعتی زندگی کا ایک نمونہ بنانا چاہتے ہیں جہاں طلبہ مشاہدات اور تجربات سے مالا مال اور راحت اور مسرت سے معمور زندگی بسر کریں جس میں ان کی مخصوص جبلتوں کو اظہار اور نشو و نما کا موقع ملے اور وہ اپنی ضروریات اور خواہشات

کے مطابق تحصیل علم میں ترقی کرتے رهیں - اس مدرسے میں عمل پر ' زندگی پر ' فعالیت پر زور دیا جائیگا اور علم اس طرح سکھایا جائیگا کہ بچے اس کی مدد سے ان مسائل کو حل کرسکیں جو اِن کے پسندیدہ مشاغل کے دوران میں پیدا هوتے هیں - اسی وجہ سے جدید تعلیمی تحریکوں کی کوشش یہ هے کہ نصاب تعلیم میں بجائے غیر مربوط اور مجرد اسباق کے مختلف قسم کے مسلسل عملی مشاغل داخل کئے جائیں - ذهنی تربیت کے نقطۂ نظر سے هم ان کی اهمیت کو واضح کر چکے هیں لیکن اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بھی وہ بہت ضروری هیں - ان مشاغل کے دوران میں بچے جو تخلیقی کوشش کریں گے اس میں ان کو نہ صرف جسم اور دماغ کی هم آهنگ تربیت کے مواقع ملیں گے بلکہ مدرسے کی ساری فضا میں اشتراک عمل اور عمرانی زندگی کے اصولوں کی کار فرمائی هوگی - بہت سی جدید تعلیمی تحریکیں مثلاً نصاب میں دستکاری اور صنعت و حرفت کے عناصر کا شامل کرنا ' سائنس میں عملی کام کی اهمیت پر زور دینا ' طلبہ میں حکومت خود اختیاری کا اجرا ان سب میں یہ مقصد مشترک هے کہ طلبہ کو معاشری ضبط اور تربیت حاصل هو جو اخلاقی تربیت کی بنیاد هے -

یہ بھی ممکن هے کے مدرسے کے ماحول میں امداد باهمی اور اشتراک عملی کے مواقع مہیا هوں اور بچے مل جل کر کھیلیں ' کام کریں ' رهیں سہیں ' اور آپس میں همدردی اور دوستی کا برتاؤ کریں لیکن ان کی یہ عادتیں اور صلاحیتیں ایک مخصوص اور محدود ماحول کے ساتھہ اس طرح وابستہ هوجائیں کہ جب وہ مدرسہ سے باهر نکل کر زندگی کے مشاغل میں شریک هوں تو ان صفات کا مناسب حال استعمال نہ کرسکیں اور ان اصولوں کو سب لوگوں کے ساتھہ نبھانے میں کامیاب

نہ ہوں یہ اندیشہ ایسی حالت میں زیادہ ہوتا ہے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں کوئی زندہ رابطہ نہ ہو اور طالب علم تمدنی زندگی کے مسائل اور محرکات سے بے تعلق ہو کر مدرسے میں بالکل قلعہ بند ہوجائے جہاں نہ باہر کے اثرات پہنچ سکیں نہ باہر کے لوگوں کے ساتھہ ہمدردی اور اتحاد اغراض و مقاصد پیدا ہوسکے - جن مدرسوں میں تاریخی حالات کی وجہ سے خاص رسوم و روایات قائم ہو جاتی ہیں وہاں یہ بے تعلقی بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے - اس کی ایک نہایت واضح مثال انگلستان کے پبلک اسکولوں میں ملتی ہے - ان اسکولوں کی محدود چار دیواری میں ایک خاص قسم کی فضا اور روایات پیدا ہوگئی ہیں جن کی بدولت وہ نہایت کامیابی کے ساتھہ ان عادات و خصوصیات کو نشو و نما دیتے ہیں جو ان کے نزدیک قابل قدر ہیں - اور اپنے طلبہ میں ایک مخصوص سیرت کی تشکیل کرتے ہیں - لیکن ان کا نقطۂ نظر اور تخیل دونوں تنگ ہیں - اس وجہ سے ان کی تربیت ناقص اور نامکمل رہتی ہے - ان میں باہمی ہمدردی یک جہتی اور تعاون کی جو صفات پرورش پاتی ہیں وہ اپنی جماعت اور اپنے طبقہ کے لوگوں تک محدود ہیں - ان کے دائرے میں خود اپنی قوم کے کل افراد تک شامل نہیں ہوتے - ان میں ایک " پبلک اسکول کی ذہنیت " پیدا ہو جاتی ہے جو قوم کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتی ہے - ایک وہ جس نے ان اسکولوں میں تعلیم پائی ہے دوسرا وہ جو اس شرف سے محروم رہا ہے - وہ موخرالذکر طبقے کے لوگوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اپنے آگے حقیر جانتے ہیں اور معاشری معاملات میں انہیں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے - ظاہر ہے کہ جمہوری معاشرے میں اس قسم کی سیرت قوم کے لئے مفید نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اُس تفریق کو اور مستحکم بناتی ہے

جس کو دور کرنا جمہوریت کا اولین فرض ہے - ہمارے ملک میں یہ تفریق کسی قدر مختلف صورت میں پائی جاتی ہے - ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگونکی ہے جنہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان اور آداب معاشرت سیکھہ کر گویا ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن اختیار کر لیا ہے - یہ لوگ خود کو باقی تمام ابنائے وطن سے ' جن کو یہ تعلیم یا کسی طرح کی تعلیم بھی نصیب نہیں ہوئی ' بالکل مختلف اور ممتاز سمجھتے ہیں ان کا کام اور تفریح ' ان کا طرز خیال اور طرز معاشرت ' ان کے اعراض و مقاصد غرض سب چیزیں عام لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہیں - تعلیم یافتہ طبقے اور جمہور کی یہ باہمی اجنبیت ملک و قوم کے اخلاقی ' معاشری اور سیاسی مفاد کے لئے بہت مضر اور خطرناک ہے - اگر چہ گزشتہ بیس سال میں زیادہ تر سیاسی وجوہ سے اس میں مقابلتاً کمی واقع ہوئی ہے لیکن اب بھی کالجوں اور اسکولوں کے تعلیم یافتہ لوگوں اور ملک کی بے شمار دہاتی آبادی کے درمیان ایک سد سکندری ہے جس کو دور کرنا قومیت کی نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ہے - علاوہ اس کے ہم کسی ایسے نظام اخلاق کو مکمل نہیں مان سکتے جس کا دائرہ ایک خاص جماعت یا طبقہ تک محدود ہو کیونکہ اخلاق کی بنیاد کسی امتیازی خصوصیت مثلاً رنگ یا نسل یا وجاہت ظاہری یا تعلیم یا مالی اور معاشری حیثیت پر نہیں رکھی جاتی بلکہ انسانیت کے اس عنصر پر قائم ہے جو تمام بنی، نوع انسان میں مشترک ہے حقیقی اخلاق اور سچی تہذیب کی پہچان صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کی سیرت میں اخلاق کے اصول محض ظاہری شائستگی اور آداب محفل کی سطح پر نہیں رہتے بلکہ تہ تک اُتر جاتے ہیں ان کا خلق اور ہمدردی اور

باران رحمت کی طرح ہر شخص کے لئے ہوتا ھے - اس میں امیر اور غریب ، جاھل اور عالم کا امتیاز نہیں ہوتا - اخلاق طبیعت کا ایک خاصہ ھے جو مشک کی خوشبو کی مانند ہرجگہ اور ہر موقع پر ظاہر ہوکر رہتا ھے - ہم اپنے مدرسوں میں اس اخلاق کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس کے دائرے میں تمام عالم انسانی آجائے - یہ آرزو اُسی وقت پوری ہو سکتی ھے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں اچھی طرح ربط ضبط پیدا ہو جائے اور ایک طرف مدرسے میں عمرانی زندگی کے بہترین عناصر اور مشاغل مہیا ہوں اور دوسری طرف طالب علم اپنی تعلیم و تربیت کے نتائج کو بیرونی زندگی میں استعمال کرے اور دیکھے کہ انصاف ، تقسیم عمل ، امداد باھمی ، ادائے فرض ، راست بازی ، معاشری وفاداری کے اصول نہ صرف مدرسے کی زندگی میں ضروری ہیں بلکہ دنیا کے کارو بار کو کامیابی اور عمدگی کے ساتھہ چلانے کے لئے بھی ناگزیر ہیں اور تمام نظام تمدن میں ان کی کار فرمائی ھے اور ہونی چاہئے - لہذا اخلاقی تربیت کے لئے لازم ھے کہ ہم مدرسہ جدید کے نصاب کو معاشری ضرورت اور مقاصد کے مطابق تربیت دیں اور اس کے طریقہ تعلیم کو عمرانی زندگی کے طریقہ کار کے ساتھہ ہم آہنگ بنائیں تا کہ طلبہ تمدنی زندگی کے اخلاقی اصول عملی طور پر سیکھہ لیں -

نصاب تعلیم کی اہمیت

مدرسے کا نصاب اخلاقی تربیت میں کیونکر معین ہوسکتا ھے اور اپنے طلبہ میں معاشری صلاحیت کس طرح پیدا کر سکتا ھے ؟ نصاب تعلیم کی بحث میں ہم بتا چکے ہیں کہ نصاب بنانے والوں کو معاشری زندگی کے مختلف شعبوں سے ان بہترین اور اہم ترین عناصر کا انتخاب کرنا چاہئے جو اس کی مستقل اقدار و مقاصد کے حامل

هوں تاکہ ان کے مطالعہ سے طالب علم کے ذہن میں نظام تمدن کو سمجھنے کی قابلیت اور بصیرت پیدا ہو اور وہ اپنی سیرت کو اس کے ساتھہ ہم آہنگ بنا سکے - اگر نصاب کے تمام مضامین کا مطالعہ محض اس نظر سے کیا جائے کہ ان سے معلومات میں تھوڑا بہت اضافہ ہو اور امتحان میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ان کی کوئی خاص اخلاقی یا عمرانی اہمیت نہ ہوگی - برخلاف اس کے اگر ان کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان سے طلبہ کو معاشری زندگی کے اصول و اساس سے واقفیت ہو اور بہتر زندگی بسر کرنے میں مدد ملے تو ان کی اخلاقی قدر میں کوئی شبہ نہیں - اس کی تشریح کے لئے ہمیں درسی مضامین کی نوعیت کے متعلق اس تمام بحث کا اعادہ کرنا پڑیگا جو ہم ایک دوسرے سلسلے میں اس سے پہلے کرچکے ہیں - اس کا تو یہاں موقعہ نہیں - لیکن ہم اخلاقی تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے بعض اہم درسی مضامین کی تنظیم و ترتیب میں کیا تبدیلی لازمی آئیگی -

سب سے پہلے تاریخ کو لیجئے - اگر تاریخ محض پرانے واقعات اور بھولے بسرے افسانوں کا مجموعہ سمجھہ کر پڑھی اور پڑھائی جائے ' جیسا بالعموم ہمارے مدارس میں ہوتا ہے تو اس سے نہ عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں - لیکن فرض کیجئے ہم تاریخ کی تعلیم میں ارتقائی نقطۂ نظر اختیار کریں اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالت پر روشنی پڑے تو تاریخ نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے گی - معاشری زندگی کے تمام شعبوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان کی ابتدا بہت سادہ اور محدود ہوتی ہے اور وہ

رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہوتے جاتے ہیں - تاریخ کا فرض یہ ہے کہ وہ اس عمل ارتقا کی تشریح کرے اور طلبا کو یہ سمجھائے کہ انسانی جدو جہد سے تمدن کے ہر شعبہ میں کس طرح ترقی ہوئی ہے - اگر طلبہ اس کا مطالعہ سمجھہ بوجھہ کر اور صحیح نقطۂ نظر سے کریں گے تو وہ انسانی ارتقاء کی نوعیت ، اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے لگیں گے - اور وہ اپنے عمرانی فرائض کو عمدگی سے پورا کریں گے اور اپنے حقوق سے اچھی طرح فائدہ اٹھائیں گے - نصاب تاریخ کے انتخاب میں جن امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ ہم بیان کرچکے ہیں - ان کے علاوہ ہمیں اس مضمون کی تعلیم میں انسانی معاشرت کی ارتقاء کے بعض خاص پہلو نمایاں کرنے پڑیں گے - مثلاً ابتدائی زمانے کے وحشیوں کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوگی کہ اول اول انسان اور فطرت کس طرح ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے اور کس طرح رفتہ رفتہ انسان نے فطرت کی طاقتوں کو مطیع کرکے ان کو بجائے دشمن کے دوست بنا لیا - قدیم آریوں کی زندگی کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ انہوں نے کس طرح اپنی مخصوص ضروریات پوری کرنے کے لئے متمدن زندگی کے وہ ادارے قائم کئے جو آج زیادہ مکمل شکل میں موجود ہیں - اسي طرح مختلف قوموں کي تاریخ در اصل مختلف انسانی کمالت کي ارتقاء اور کامیابی کی داستان ہے - تاریخ روما کا مطالعہ سیاست اور ملک گیري کے کمال کا تاریخ یونان کا مطالعہ علوم و فنون لطیفہ کی ترقي و نشو و نما کا ، سلطنت مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ آئین سلطنت کی تنظیم اور فن تعمیر کی تکمیل کا مطالعہ ہے - بحیثیت مجموعی علم تاریخ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ موجودہ تمدن کے رنگا رنگ تارو پود کے ملنے سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا ، وہ کون سے محرکات تھے جو مختلف ایجادوں ،

دریافتوں اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے اور ان چیزوں نے کس طرح
زندگی کے نئے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی - طالب علم کے دل میں اس
عظیم‌الشان ارتقاء کا احساس پیدا ہوتا اور اس کا معاشری معاملات اور
مسائل کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت
رکھتا ہے -

اسی طرح جغرافیہ چند اصطلاحوں اور ناموں کا مجموعہ نہیں
بلکہ انسانی معاملات اور ان کی باہمی وابستگی کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ
ہے بشرطیکہ اس کے مطالعے میں معاشری اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے -
تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے -
فرق یہ ہے کہ تاریخ انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے یعنی
اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ گذشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن
میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جغرافیہ انسان اور اس کے طبیعی
ماحول تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نشو و نما
کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے - بہر حال دونوں کو انسانی
زندگی کے مختلف پہلؤں سے سرو کار ہے - جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت
یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھاتا
ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں
اور کس طرح اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح و ترقی کے لئے
لوگوں کا باہمی تعامل ضروری ہے اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت ،
صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے - اسی کے ساتھ
جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور اس طرح
طالب علم کی عمرانی تربیت میں مدد دیتا ہے -

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ادب کی تعلیم صحیح اصول پر

مرتب کی جائے تو وہ اخلاقی تربیت کا کس قدر موثر ذریعہ بن جائیگی - ادب انسانی خیالات اور جذبات انسانی آرزؤں اور اُمنگوں ' انسانی کامیابیوں اور نا کامیابیوں کا ترجمان ہے اور انسان کے قلب و روح کی واردات اور جد و جہد کا آئینہ دار - اس کے ذریعے سے ہم نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات حاصل کرتے ہیں (یہ تو ادب کا سب سے ادنیٰ فائدہ ہے) بلکہ قدیم اور جدید خیالات اور جذبات ' اور دنیا کے بہترین ارباب فکر کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں - اس کے مطالعے سے ہماری نظر زیادہ وسیع ' ہماری ہمدردی زیادہ عام ' ہماری قدر شناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے - اعلیٰ ترین ادب ہمیں نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے ' نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گزشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کا جوہر ہیں نشو و نما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے - وہ ہمیں براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر ہمارے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے - جن تصانیف میں پند و نصیحت کا رنگ غالب آجاتا ہے اور مصنف اپنے فن لطیف کے اصول کو نظرانداز کرکے عمداً اخلاقی تعلیم کی کوشش کرتا ہے ان کا ادبی معیار بالعموم زیادہ بلند نہیں ہوتا - ناولوں ' ناٹکوں اور افسانوں میں بھی جب کبھی خیالات و عقائد کی تبلیغ کی خواہش آرٹ پر غالب آجاتی ہے تو ان کا اثر جاتا رہتا ہے - اس لئے ادب عالیہ کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقہ پر طالب علم کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کر جائے - جس شخص

میں ادب کا صحیح ذوق ہوتا ہے اسے ہمیشہ ایک اعلیٰ درجہ کا مضمون یانظم یا افسانہ پڑھکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں ایک نئی وسعت اور گہرائی اور اس کے احساسات میں تیزی اور شدت پیدا ہوگئی ہے - اکثر لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب وہ کوئی ایسی چیز پڑھتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگے تو کم از کم عارضی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نفس سے بہت سے ادنیٰ جذبات اور تعصبات دور ہوگئے ہیں اور طبیعت میں گداز اور نرمی اور محبت پیدا ہوگئی ہے - گویا بقول ارسطو کے ان کا روحانی تنقیہ [۱] ہوگیا ہے - لہذا ایک صاحب نظر اور صاحب دل معلم کے ہاتھہ میں ادب کی تعلیم تربیت اخلاق کا ایک نہایت اہم اور موثر ذریعہ بن جاتی ہے - بشرطیکہ اس کی غرض محض زبان سکھانا اور الفاظ کی مشق کرانا نہ ہو بلکہ اس میں انسانی جذبات اور تجربات کے مطالعہ پر زور دیا جائے اور اس کی وساطت سے طلبہ کو بنی نوع انسان کے بہترین خیالات اور احساسات میں شرکت کا موقع ملے -

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادی مفاد کے حصول اور صنعت و حرفت کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے در اصل اس زمانے میں اخلاقی اور عمرانی تربیت کا جزو لازم ہوگئی ہے کیونکہ اس کی مدد سے ہم موجودہ تمدن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعے سے ہم فطرت کی طاقتوں کو تسخیر کرکے انہیں اپنے مقاصد کے لئے کام میں لاتے ہیں - سائنس کے مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی علمی

---

[۱] Catharsis -

تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکائے کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کرسکتی - علاوہ بریں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہے اور اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے - وہ قدیم زمانے کے وحشیوں کی طرح جن کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ماحول کے تمام مظاہر ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں ، ہمت شکن توہمات اور خطرات کا غلام نہیں ہے - سائنس کی مدد سے انسان نے اپنے گذشتہ تجربات کو منظم کرکے انہیں آئندہ کی ترقی کا ذریعہ بنا لیا ہے اور اس خوف سے جو اس کے دل پر طاری تھا رہائی حاصل کرکے اپنے لئے آگے بڑھنے کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں - اگر سائنس اس طرح انسانی تجربات کی تنظیم کرکے ان سے مفید نتائج نہ نکالتی تو یہ تجربات یا تو بالکل اکارت جاتے یا انسان کے دماغ کے لئے ایک بوجھ بن کر رہ جاتے - جن لوگوں پر سائنس کے مخصوص منہاج و نقطہ نظر کا اثر نہیں پڑا وہ یا تو عادت اور روایات کے مطابق عمل کرتے ہیں یا تقدیر پر بھروسا کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں - ان میں معاملے کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور اس کے موافق اور مخالف دلائل کو تولنے کی قابلیت نہیں ہوتی - اور وہ اپنے افعال کی ذہنی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے - ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کے لوگ کبھی زیادہ ترقی نہیں کرسکتے اور خصوصاً اس زمانے میں جو حرکت اور تبدیلی کا زمانہ ہے وہ علمی اور معاشری ترقی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے - ہندوستان میں اس قسم کے لوگ بہت ہیں جو قسمت پر شاکر رہنا پسند کرتے ہیں اور جدو جہد کے قائل نہیں - قومی سیرت کی تشکیل کا تقاضا یہ

ہے کہ اس ذہنی کیفیت میں انقلاب پیدا کیا جائے - اس کا بہترین طریقہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یہی ہے کہ مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو معقول حصہ ملے اور طلبہ صحیح طریقے پر اس کا مطالعہ کریں تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھ شریک ہو سکیں جن کی بنیاد سائنس کے علم پر ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) لکھتے ہیں :

" نصاب تعلیم میں بھی سائنس کا کام وہی ہے جو اس نے نسل انسانی کے لئے انجام دیا ہے یعنی تجربے کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راہیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو - اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ہوا ہے نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع معنی دیدئے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آسکتے ہیں اور انجام کار فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے " [۱]

ہم نے اخلاق کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کے مطابق سائنس سے عمرانی برکات کے علاوہ اخلاقی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ اس عقیدے سے بڑھ کر کون سی اخلاقی صفت ہو سکتی ہے کہ انسانی ترقی اور اصلاح خود انسان ہی کی کوشش سے ممکن ہے اور یہ کوشش صرف باہمی اشتراک عمل کے ذریعے کامیاب ہوسکتی ہے؟ اس عقیدے کے طفیل میں انسان عاجزانہ تقدیر پرستی سے نجات پاکر نظام عالم میں اپنی اہمیت اور اپنے فرائض کو پہچانتا ہے اور یہی خودشناسی خدا شناسی کی سیڑھی ہے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

[۱] Democracy and Education -''

سائنس قدرت کی کار سازی کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتی ہے اور دنیا کے لاتعداد اور بظاہر متضاد مظاہر میں قانون الٰہی کی حکومت کا ایسا بین ثبوت دیتی ہے کہ اگر ہم عقیدت اور احترام کے ساتھہ چشم بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں بلاواسطہ معرفت الٰہی کی منزل پر پہنچا دیتی ہے - [۱] اگر گنجائش ہوتی تو ہم نصاب کے باقی مضامین سے بحث کرکے دکھا سکتے تھے کہ اخلاقی تربیت میں ان کا کیا حصہ ہے - بہر حال ان سب کی تنظیم میں شرط مشترک یہی ہے کہ ان کی تعلیم صحیح طریقہ پر دی جائے - حساب جیسا خشک اور بظاہر بے روح مضمون بھی ' جس کا بادی‌النظر میں اخلاقی تربیت سے کوئی رشتہ معلوم نہیں ہوتا ' در اصل نہایت اہم اخلاقی اور عمرانی قدروں کا حامل ہے - اس کے ذریعے سے ہم ان تمام معاشری معاملات اور مسائل کو سمجھتے ہیں جو اعداد و مقادیر کی صورت میں ظاہر کئے جاسکتے ہیں - اس کے بغیر اس مادی دنیا میں ہماری بہت سی کوششیں یا تو بالکل ضائع ہو جاتی ہیں یا ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے - زراعت ' تجارت ' صنعت و حرفت ' سائنس کی تحقیقات ' روز مرہ کے کارو بار میں ہمیں برابر حساب کی ضرورت پڑتی ہے اور وہی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور معاشری کارو بار کو ناپنے تولنے اور ان کا صحیح اندازہ کرنے میں کام آتا ہے - دوسری طرف حساب کی تعلیم میں ہمیں ہر ہر قدم پر صحت عمل ' نقد و تنقید اور ذہنی دیانت‌داری کی صفات درکار ہوتی ہیں - کیونکہ یہ ان علوم صحیحہ میں سے ہے جن میں غلطی اور صحت کے مابین کوئی درمیانی

---

[۱] سائنس کے فوائد اور برکات کی مفصل اور مکمل بحث کے لئے سپنسر کی "فلسفۂ تعلیم" کا مطالعہ کرنا چاہئے -

واہ نہیں ہوتی - یہاں طالب علم الفاظ کی گنجلک کے ذریعے نہ اپنے آپ
کو دھوکہ دے سکتا ھے نہ دوسروں کو مغالطے میں ڈال سکتا ھے - لہذا
حساب کی صحیح تعلیم کے ذریعے جو ذھنی صفات اور عادتیں پیدا ہوتی
ھیں وہ اخلاقی تربیت کا جزو بن جاتی ھیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے
کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ھم انتقال قوت اکتسابی [۱] کے غلط نظریہ کو
صحیح مانیں - دست کاری اور فنون لطیفہ کی اھمیت، اور نصاب میں اس
کی قدر و قیمت سے ھم پہلے ھی بحث کر چکے ھیں اور بتا چکے ھیں
کہ وہ نہ صرف طلبہ کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے لئے مفید ھیں
بلکہ اخلاقی تربیت کے لئے بھی ضروری ھیں - ماھرین تعلیم کا اس امر پر
اتفاق ھے کہ بچوں کی شخصیت کی نشو و نما اور تشکیل اس وقت تک
نہیں ھو سکتی جب تک انہیں مسلسل عملی اور تخلیقی مشاغل میں
شرکت کا موقعہ نہ ملے - شرط یہی ھے کہ ان کی تعلیم بالکل رسمی اور
خشک نہ بنا دی جائے کہ بچوں کو سوائے چند کم و بیش مفید قاعدوں
کو سیکھنے کے تخلیقی اظہار کا موقعہ نہ ملے - اس صورت میں نہ
تو ان فنون کے سیکھنے سے بچوں میں معاشری احساس پیدا ھوگا نہ ایسے
تعلیمی طریقے اختیار کئے جاسکیں گے جن میں اشتراک عمل باھمی
ھمدردی اور ذھنی تعاون کی گنجائش ھو - ان میں بھی اسی رشک و خود
غرضی اور باھمی مسابقت کی کار فرمائی ھوگی جو بد قسمتی سے دوسرے
درسی مضامین میں داخل ھوگئی ھے - برخلاف اس کے اگر ان چیزوں کی
تعلیم میں بچوں کے فطری میلانات اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھا جائے ،
فعالیت کے اصول پر زور دیا جائے اور وہ اپنا کام آزادی کی فضا میں کریں
تو ان میں اعتماد ذات ، تعاون عمل اور تخلیقی اظہار کی صفات

- Transfer of Training [۱]

پیدا ہونگی جو معاشري زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہیں -

طریقہ تعلیم اور معاشری تربیت

نصاب کی مندرجہ بالا بحث میں ضمناً طریقۂ تعلیم کی بحث بھی آگئي ہے اور ہم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محض نصاب تعلیم کو باقاعدہ اور معقول طور پر مرتب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمیں وہ تمام علمی اور اخلاقی نتائج حاصل ہوجائیں جن کی تفصیل اوپر کی گئی ہے کیونکہ جو علم کتابوں میں محفوظ ہے وہ ہمارے لئے کوئی اہمیت اور قدر نہیں رکھتا جب تک ہم اس کو اپنے تجربات کی شکل میں تحویل نہ کرلیں اور وہ ہماری زندگی اور عمل کا جزو نہ بن جائے - اس عمل تحویل کا ذریعہ طریقہ تعلیم ہے - اگر وہ بچوں کی فطرت کے موافق ہے ' ان کو عمل کا موقع دیتا ہے ' اس کے اندر جدت پسندی اور ذاتی ذمہ داري کے ساتھہ کام کرنے کی گنجائش ہے تو وہ جو کچھہ سیکھیں گے ان کا جزو طبیعت بن جائے گا اور ان کي سیرت پر اثر ڈالے گا ورنہ ان کی تمام معلومات دماغ پر بار ہوکر رہ جائے گي اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ نہ لیگی - مجھے اپنے ایک پرانے سائنس ماسٹر کا یہ قول اکثر یاد آتا ہے کہ " تم ان چیزوں کو حفظ کر رکھو ' کسی وقت خود بخود کام آئیں گی " - یہ بیچارے طریقۂ تعلیم کی اہمیت اور اثر سے بالکل ناواقف تھے - انہیں یہ خیال کبھی نہیں گزرا تھا کہ جب بغیر چبائے ہوئے جسمانی غذا بھی ہضم نہیں ہوتی تو دماغی غذا کیسے کوئی مفید اثر پیدا کرسکتی ہے اگر وہ بغیر ہضم کئے حافظے میں تھونس لی جائے ؟ ان کی یہ غلطی کوئی غیر معمولي جہالت کی دلیل نہیں بلکہ ایک خاص تعلیمی نقطۂ نظر کی نمائندگی

کرتی ہے جس کي حکومت صدیوں تعلیم کی قلمرو پر رہی ہے اور جس نے نہ جانے کتنے غریب طلبہ کی تعلیمی زندگی برباد کي ہے - اُستادوں کي تمام کوششیں مدتوں اس مقصد کے لئے وقف رهیں کہ طلبہ کسي طرح وہ بے اندازہ معلومات حاصل کرلیں اور یاد کر رکھیں جو وہ اپني سمجھہ کے مطابق ان کے لئے مفید سمجھتے تھے - ان کو اس امر سے بحث نہ تھي کہ ان علوم کی تحصیل کے لئے وہ خود اور ان کے شاگرد کیا طریقے اختیار کرتے هیں - کومینیس (Comenius) اور اس کے هم خیال معلموں کے همہ داني پر مبني نظام تعلیم کا ذکر هم کرچکے هیں - ان لوگوں کا زور تمام تر موضوع پر تھا ' طریقۂ تعلیم پر نہ تھا اور ظاهر ہے کہ علوم کی تعداد اور وسعت اتنی ہے کہ ایسی حالت میں معلم کو طریقۂ تعلیم کی طرف سے خواہ مخواہ بے توجہی کرنی پڑیگی اور تمام ذهنی قوتوں کو نظر انداز کر کے صرف حافظہ سے کام لینا هوگا - مشرقی ملکوں میں بالعموم اور خود همارے ملک میں بھی قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر تھی - اس کا منشا یہ تھا کہ جو طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاهیں وہ مختلف علوم مثلاً فلسفہ ' ریاضی ' طب ' قانون ' اخلاق وغیرہ کی تکمیل کریں - اس نظام کی خرابی اور کمزوری تو ظاهر ہے لیکن هم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس زمانے میں جو لوگ طلب علم کا سچا شوق رکھتے تھے وہ اپنی تعلیم پر اتنی توجہ اور مدت صرف کرتے تھے کہ ان میں سے بعض مستعد اور قابل افراد مختلف علوم میں کمال پیدا کرلیتے تھے - لیکن جیسا هم وضاحت کے ساتھہ بتا چکے هیں جب سائنس اور دوسرے تجربی علوم نے جدید دور ارتقاء میں قدم رکھا تو علوم کی تعداد اور وسعت میں بہت تیزی کے ساتھہ اضافہ هونا شروع هوا اور موجودہ زمانے میں کسی شخص کے

لئے یہ ممکن نہیں کہ تمام علوم کا نو کیا ذکر ھے ان کے دسویں یا سویں حصے پر بھی عبور حاصل کرسکے - علاوہ اس کے یہ زمانہ خصوصی قابلیت کا ھے - علوم بھی پہلے سے بہت زیادہ منظم ہوگئے ھیں اور انکے بہت سے علحدہ شعبے کر دئے گئے ھیں جن میں سے ھر ایک میں کمال پیدا کرنے کے لئے ایک ماھر خصوصی کی ضرورت ھے - موجودہ تمدن کے بہت سے مشاغل ایسے ھیں جن کے لئے مخصوص قابلیت درکار ھے - اس وجہ سے موجودہ حالات میں یہی مناسب ہے کہ ایک شخص ثانوی تعلیم پانے کے بعد جو عام تہذیب کے لئے ناگزیر ھے ' کسی ایک علم یا فن میں مہارت حاصل کرے یا چند ایسے علوم و فنون کا مطالعہ کرے جن میں بہت قریبی تعلق ھے ' بجائے اس کے کہ وہ بہت سے مختلف قسم کے علوم میں سطحی واقفیت پیدا کرے - لیکن نصاب تعلیم کی وسعت محدود کرنا صرف اسی حالت میں جائز ھوسکتا ھے جب طریقۂ تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ طلبہ میں ذھنی آزادی ' اعتماد نفس اور ذاتی مطالعے کی قابلیت پیدا ھو اور وہ آئندہ زندگی میں اپنی ضرورت کے مطابق جس علم کو چاھیں حاصل کرسکیں - یہ صلاحیت معلومات کے اس ذخیرے سے بدرجہا بہتر ھے جن کو انسان ایک دفعہ غیر معمولی محنت اور کوشش کر کے جمع کرے لیکن آگے چل کر اچھی طرح استعمال نہ کرسکے - ذھنی اور اخلاقی اعتبار سے یہ صلاحیت بہت قابل قدر ھے اور اسی وجہ سے موجودہ نظریہ تعلیم میں طریقۂ تعلیم کی اھمیت بہت زیادہ ھوگئی ھے -

ھم نے کتاب کے حصہ اول میں جن سیاسی اور معاشری انقلابات کا ذکر کیا ھے ان کی وجہ سے انسانی سیرت میں فعالی صفات کی اھمیت بہت بڑھگئی ھے - جمہوریت کے اس دور میں انفرادی ترقی اور اجتماعی

زندگی میں کامیابی کے ساتھہ حصہ لینے کے لئے ہمت ' حوصلہ اور قوت اجتہاد کی ضرورت ہے - اگر بچے ذہنی جمود میں مبتلا رہیں اور انہیں دوسروں پر بھروسا کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی عادت پڑ جائے تو وہ کشمکش حیات میں نا کامیاب رہیں گے - جہاں تک مدرسے کے علمی مشاغل کا تعلق ہے فعالی صفات اُنہیں تعلیمی طریقوں کے ذریعے نشو و نما پائیں گی جو طلبہ کی تعمیری اور تخلیقی قوتوں کو اظہار کا موقع دیں تاکہ وہ معلومات کو محض جذب نہ کرلیں بلکہ اسے مختلف طور پر استعمال بھی کریں - فطرت اطفال کا مقتضا بھی یہی ہے ' کیونکہ ان میں قدرتاً یہ خواہش اور بے چینی ہوتی ہے کہ وہ کام کریں ' چیزیں بنائیں اور بقول فروبل (Froebal) کے " جو کچھہ ان کے اندر ہے اسے باہر لائیں " - جس قدر نئے تعلیمی تجربے حال میں ہوئے ہیں ' جن میں سے بعض کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے ' سب میں یہ امر مشترک ہے کہ وہ فعالیت پر زور دیتے ہیں اور طالب علم کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ پر بھروسا کرے ' مشکلات پر قابو پائے ' جسم اور دماغ کی قوتوں سے کام لے کر وسائل اور ذرائع کی تنظیم کرے اور اپنے مقاصد کو تکمیل تک پہنچائے - میڈم مونٹسوری کے طریقۂ تعلیم میں ' طریق ڈالٹن اور گیری اسکیم (Gary Scheme) میں اور دوسرے تعلیمی طریقوں میں جو انفرادی نشو و نما کے اصول پر مبنی ہیں معلم کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچوں کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کرے جس میں ہر نوع کے مشاغل کا امکان ہو ' ہر قسم کے عمل کے محرکات موجود ہوں ' ہر طرح کے ضروری سامان اور آلات فراہم ہوں تاکہ وہ اپنے شوق سے عملی تعلیم حاصل کرسکیں - معلم کی حیثیت ایک دوست اور رہبر کی ہے جو راستہ دکھاتا ہے لیکن اس

راستہ پر چلنا طلبہ پر چھوڑ دیتا ہے - وہ خوف یا لالچ کے ذریعے بچوں
کو زبردستی اپنے ساتھہ نہیں کھینچتا - بلکہ کام کی نوعیت ایسی ہوتی
ہے اور وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود اس کی طرف
کھینچتے ہیں اور اس میں منہمک ہوجاتے ہیں - جوں جوں
انہیں مشاغل میں کامیابی حاصل ہوتی ہے انہیں خوشی کا احساس
ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل میں اضافہ ہو رہا ہے -
کسی مفید کام میں دلچسپی لینا ' اور اس کو پوری توجہ اور محنت
سے کرنا ' اپنی ذات کو کم سے کم کچھہ عرصے کے لئے اس میں کھودینا '
اور ہر منزل کو طے کرنے کے بعد یہ محسوس کرنا کہ ہماری علمی اور
عملی قوتیں بڑہ رہی ہیں ' یہ ایسی صورت حال ہے جس کی اخلاقی
قدر و قیمت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا - کون کہہ سکتا ہے
کہ دنیا میں محض اسی سبب سے کس قدر ملال اور افسردگی ' مایوسی
اور ناکامی پائی جاتی ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کام میں کوئی دلچسپی
نہیں ہوتی جس کو وہ مجبوراً روزی کمانے کے لئے کرتے ہیں ؟ ان کو
زندگی کا حقیقی لطف کبھی میسر نہیں ہوتا - وہ روزانہ کام کے اوقات
میں اپنا آتھہ دس گھنٹہ کا معمول بہت بد دلی کے ساتھہ پورا کرتے
ہیں اور اسکے بعد یا تو اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کسی
اور شغل میں حصہ ہی نہیں لے سکتے ' یا نہایت ادنی
اور سستی تماشا گاہوں میں جاکر چند گھنٹے کے لئے خود فراموشی خرید
لیتے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ روز مرہ کے کام کا اور ان جذبات کا جو اس
کام سے وابستہ ہوں انسان کی تہذیب نفس اور اخلاق پر بہت گہرا اور
پائدار اثر پڑتا ہے - لوگوں کے روحانی اضطراب اور ان کی اخلاقی خرابیوں
کی اصل وجہ یہ نہیں کہ وہ بہت معمولی قسم کے کام کرتے ہیں اور

انھیں اس میں بہت قلیل آمدنی ہوتی ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے کام ان کے لئے نا موزوں ہوتے ہیں اور انھیں ان میں نہ دلچسپی ہوتی ہے نہ ہوسکتی ہے - اگر ایک خاکروب کو بھی اس امر کا سچا اور پورا احساس ہوجائے کہ وہ اپنے روز کے کام سے ایک نہایت اہم معاشری خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کے بغیر نظام معاشرت میں بہت بڑی خرابیاں واقع ہونگی تو اس کے کام کی نوعیت بالکل بدل جائے گی اور اسے خوش دلی ' خلوص اور انہماک کے ساتھہ کرے گا - اگر اس کے ساتھہ ھی اور سب لوگوں میں بھی اس خدمت کی اھمیت کا احساس پیدا ہوجائے تو ان کا رویہ بھی اس کی جانب سے بدل جائیگا اور وہ اس کی اسی قدر عزت کرنے لگیں گے - لیکن جب کوئی شخص کارلائل کے لوہار کی طرح " ہتھوڑے کی ہر چوٹ پر خدا کے دسوں قوانین توڑ ڈالے " تو اس کو اپنے کام میں کوئی مسرت نصیب نہیں ہوسکتی خواہ اس کی آمدنی اور معاشری حیثیت کتنی ہی زیادہ ہو - مدرسے کا ایک نہایت اہم اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے دل میں کام کا ' ہر مفید اور دیانت دارانہ خدمت کا ' احترام پیدا کرے اور ان کی شخصیت اور ان کے درسی اور معاشری مشاغل کے درمیان وہ رشتہ جوڑے جو ایک ہنر مند دستکار یا صناع اور اس کے فن میں ہوتا ہے یعنی کام کی محبت اور عزت اور اس سے قلبی اور روحانی تعلق - اگر مدرسے میں طلبہ کو یہ بات حاصل ہوجائے تو وہ باہر نکل کر عملی زندگی یعنی اپنے کارو بار یا پیشے یا ملازمت میں بھی اسے قائم رکھیں گے - اس مقصد کے حصول کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور ذہنی آزادی پیدا کی جائے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ مدرسے میں ایسے مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو رائج کیا جائے کہ وہ مل جل کر کام کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا سیکھیں اور ان میں معاشری خدمت کا ولولہ

پیدا ہو - لیکن موجودہ صورت حال جس کا مختصر سا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اس کے بالکل برعکس ہے - مدرسوں میں بچوں سے کام لینے کے لئے مختلف قسم کی خارجی تحریصیں استعمال کی جاتی ہیں یعنی امتحان میں پاس ہونے اور نمبر پانے کا لالچ ' اُستاد کا خوف یا لحاظ ' اپنے ساتھیوں کی رقابت وغیرہ - اخلاقی نقطۂ نظر سے اس قسم کے محرکات عمل کو استعمال کرنا نہایت قابل اعتراض ہے - جب بچے سالہا سال تک ان اغراض کی بنا پر کام کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت پر اس کا مجموعی اخلاقی اثر بہت برا پڑیگا - نہ وہ کام کو کام سمجھ کر اس کی قدر کریں گے نہ ان میں کسی قسم کا معاشری احساس یا جذبہ پیدا ہوگا بلکہ تمام عمر اپنے ادائے فرائض کے لئے اسی قسم کے سہاروں کے محتاج رہیں گے - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب خارجی اثرات کارفرما نہ ہوں گے تو یا تو وہ برے راستے پر پڑ جائیں گے یا بالکل نکمے ہوکر رہ جائیں گے اور ان پر جمود اور کاہلی غالب آجائے گی - اس لئے تربیت اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ طلبہ جلد سے جلد ان تحریصوں کے اثر سے آزاد ہوجائیں اور وہ جو کچھ کام مدرسے میں کرتے ہیں اس کی حقیقی قدر کو پہچانیں اور یہ محسوس کریں کہ اس کا ان کی موجودہ اور آئندہ زندگی سے کس قدر قریبی تعلق ہے اور اس کو محنت اور خوش دلی سے انجام دینے سے انہیں نہ صرف اس وقت خوشی اور تقویت حاصل ہوگی بلکہ آگے چل کر بھی وہ بہت مفید ثابت ہوگا - لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر ہر قدم پر ذاتی مفاد کے ساتھ معاشری مفاد بھی مد نظر رہے تا کہ ان میں خود غرضی اور نفس پرستی نہ پیدا ہونے پائے -

طریقہ تعلیم کے اس معاشری پہلو کی اہمیت دو وجوہ سے بہت زیادہ ہے - اول تو یہ وہ پہلو ہے جس سے ہمارے مدرسوں میں بہت زیادہ

غفلت برتی گئی ھے - یعنی نہ تو نصاب کی تربیت میں نہ طریقہ تعلیم کے تعین میں اس کا خیال رکھا گیا ھے کہ بچوں کو اشتراک عمل اور امداد باھمی کے موقع دئے جائیں - دوسرے ھمارے ملک کی سیاسی اور عمرانی حالت کا تقاضا ھے کہ نوخیز نسلوں میں باھمی وابستگی اور اتحاد مقاصد کے اس احساس کو پختہ کیا جائے اور مدرسوں میں اتفاق و یکجہتی کے ساتھہ کام کرنے کی عادت ڈالی جائے - کیا ھمارے مدرسے اپنے موجودہ طریقہ تعلیم کے ذریعے سے یہ تقاضا پورا کر رھے ھیں ؟ ھرگز نہیں - جیسا ھم نے ابھی بتایا ھے وہ طلبہ سے کام لینے کے لئے ان کے ادنیٰ جذبات کو اُبھارتے ھیں - بہت سے اُستاد جو اپنے آپ کو نہایت قابل اور ھوشیار سمجھتے ھیں نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ھیں کہ درسی تعلیم میں طلبہ کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرائیں - ایک بیدار مغز ھیڈ ماسٹر کا مجھے ذاتی تجربہ ھے جس کا تعلیمی اصل اصول یہ ھے کہ ھر اُستاد روزانہ ھر طالب علم کو نمبر دیا کرے تاکہ نمبر حاصل کرنے کی خواھش میں سب طلبہ محنت اور توجہ سے کام کریں ! ان تمام عقلمندیوں کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ خواہ مخواہ طلبہ میں خود غرضی اور نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ھوجاتی ھے اور تقسیم عمل اور تعاون کے ذریعے بڑے بڑے کام انجام دینے کے بجائے وہ سب اپنی اپنی ڈیڑہ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ھیں اور یہ کوشش کرتے ھیں کہ کسی طرح امتحان میں ایک دوسرے پر سبقت لیجائیں اور اُستادوں کی نظر میں سرخ روئی حاصل کریں - گویا انسانی کامیابی کا معیار متحدہ خدمت نہیں بلکہ انفرادی برتری اور باھمی مسابقت ھے ! اُستاد یہ غلطی کرتے ھیں کہ اپنی تعلیم اور طلبہ کی محنت کے نتائج کو بالکل خارجی اور مشینی معیاروں پر جانچتے ھیں - مختلف استعداد اور

طبیعت کے طلبہ میں امتیاز نہیں کرتے اور اُن کی محنت کا اندازہ لگانے میں اور اس کی داد دینے میں وسعت خیال اور همدردی سے کام نہیں لیتے - ان کے نزدیک ذی روح افراد بھی گویا لکڑی کے پیمانے میں ناپے یا لوھے کی ترازو میں تولے جاسکتے هیں - جو طالب علم مروجہ امتحانوں میں اچھا رهتا ہے وہ ان کے نزدیک هر طرح قابل تعریف ہے اور اس کی کامیابی ان کے طریقہ تعلیم کی کامیابی کی دلیل ہے - باقی طلبہ جو امتحانوں میں اچھے نمبر نہیں پاتے نالائق یا سست یا کام چور سمجھہ لئے جاتے هیں - انہیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ممکن ہے اس ناکامی کی وجہ ان کے طرز تعلیم کی خرابی یا طلبہ کا اختلاف طبائع هو - اس کا اثر دونوں قسم کے طلبہ پر بہت برا پڑتا ہے - جو طلبہ امتحانوں کے معیار سے قابل سمجھے جاتے هیں اور ایسی تیاری کرسکتے هیں جس سے خوب نمبر حاصل هوں وہ اپنی جگہہ پر بالکل مطمئن هوجاتے هیں - اُن کو اپنی قابلیت کا غلط اور مبالغہ آمیز گھمنڈ پیدا هوجاتا ہے اور ان کے لئے اور زیادہ محنت کرنے اور قابلیت حاصل کرنے کی کوئی تحریص نہیں رهتی - کسی شخص کو نوعمری هی میں یہ خیال پیدا هوجانا کہ وہ معراج کمال پر پہنچ گیا ہے اس کی ذهنی قوتوں کو بالکل معطل کر دیتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے تیز طالب علم اپنی محدود کامیابی سے پوری طرح مطمئن هوجاتے هیں اور ان کی آئندہ ترقی قطعاً مسدود هو جاتی ہے - بر خلاف اس کے کمزور طلبہ میں یعنی ان طلبہ میں جو امتحان میں نمبر نہیں پاسکتے احساس شکست پیدا هوجاتا ہے - ان کی همت ٹوٹ جاتی ہے ' حوصلہ پست هوجاتا ہے اور کچھہ مقابلے میں نا کامیاب رهنے سے ' کچھہ اُستاد کی دل شکن باتوں سے انہیں یہ یقین هوجاتا ہے کہ ان میں کسی طرح کی قابلیت نہیں - یہ احساس کم مائگی

بھی انسان کے لئے بہت مضر ھے - کیونکہ یہ ترقی کی خواھش اور حوصلے کی بالکل بیخ کنی کردیتا ھے اور طبیعت پر مایوسی اور افسردگی چھا جاتی ھے - یہ خرابیاں تو تمام طلبہ کے لئے مشترک ھیں لیکن اِس نظام تعلیم میں سب سے زیادہ نقصان اُن بچوں کو پہنچتا ھے جو فطرتاً زیادہ زود حس ھوتے ھیں ' جن کا رجحان طبع زیادہ تر غور و فکر کی طرف یا فنون لطیفہ کی طرف ھوتا ھے - وہ مثلاً کسی علمی کتاب یا مضمون کا مطالعہ کر کے اِس کے مطالب کو خوب سمجھہ سکتے ھیں اور تحریر و تقریر میں اس پر بہت اچھی طرح بحث کرسکتے ھیں ' یا کوئی عمدہ نظم پڑھہ کر اِس سے لطف اندوز ھوسکتے ھیں یا مصوری یا دستکاری میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ھیں - مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ امتحانوں میں بھی اچھے رھیں کیونکہ وھاں انہیں اپنے ذوق اور مطالعے کے بہترین نتائج فرصت اور دل جمعی کے ساتھہ پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا - بلکہ کم سے کم وقت میں ایک خاص طرح کی واقفیت کا اظہار کرنا ھوتا ھے جس کا گر ھر شخص کو نہیں آتا - ان کی برتر اور لطیف تر صفات کا نہ کوئی امتحان ھوتا ھے نہ ھو سکتا ھے - گزوں سے ناپنے والا معلم اپنے سطحی پیمانے سے سوائے طول کے اور کچھہ نہیں ناپ سکتا - طبیعت کی شائستگی اور گہرائی ' ذوق حسن ' معاشری احساس قیادت کی قابلیت ' اور اس قسم کی تمام اعلیٰ صفات کو نظر انداز کر دیتا ھے اور ایسے طلبہ کی قدر کرتا ھے جن کو وہ نمائشی اور سطحی لیاقت ھوتی ھے جس کا اندازہ ان امتحانوں کے ذریعے آسانی سے ممکن ھے - اسے یہ معلوم نہیں کہ انسان کی روح راز سربستہ ھے اور کیا عجب ھے کہ جس وقت طالب علم کی قوتیں بظاھر خوابیدہ معلوم ھوتی ھوں اور وہ اپنے درسی

مشاغل اور معمول کی طرف سے بے توجہي برتتا ہو ' بقول برگسان (Bergson) کے " وہ اپنی هستي کی گہرائیوں میں ایک نئي شخصیت کی تشکیل میں مشغول ہو" ایسی شخصیت کے معلم کو خاص طور پر احترام کرنا چاهئے - کیونکہ علمي اور تخلیقی کاموں کے لئے عموماً اُنہیں صفات کی ضرورت ھے جو امتحانوں کی کسوتی پر نہیں کسی جاسکتیں - تجارتی اور اقتصادی معاملات میں یقیناً مقابلے اور مسابقت کی بہت گنجائش ھے لیکن علمی مشاغل اور فنون لطیفہ کی خصوصیت یہ ھے کہ ان میں اشتراک احساس اور اشتراک عمل کا قانون کارفرما ھے - اس لئے مدرسے میں همیں تمام درسی مشاغل کی تنظیم اسی قانون کے مطابق کرنی چاهئے اور ان مشاغل کو بچوں کے سامنے ایسے انداز میں پیش کرنا چاهئے کہ اُنہیں ان سے وهي خوشی حاصل ہو جو ایک محقق یا صناع کو اپنے کام سے ہوتی ھے - وہ خوشی نہیں جو محض عارضی تفریح کے مرادف ھے بلکہ وہ جو شوق اور انہماک کے ساتھ کام کرنے سے پیدا ہوتی ھے - مدرسے میں دست کاري اور عملی مشاغل رائج کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ھے کہ ان میں اجتماعی مقاصد کے لئے کوشش کرنے کا موقع ملتا ھے اور طلبہ میں معاشری اتحاد اور یک جہتی کا احساس پیدا ہوتا ھے - بقول پروفیسر ڈیوئی کے :—

" هر ایسے طریقہ عمل کو مدرسے میں رائج کرنے سے ' جو بچے کے عملی رجحانات کو اُبھارے اور اس کی قوت تعمیر و تخلیق کی تربیت کرے ' ایسے مواقع پیدا ہوتے ہیں کہ اسکے اخلاقي احساس کا مرکز ذاتی اور خود غرضانہ مشاغل سے ہٹاکر معاشري خدمت کي طرف منتقل کر دیا جائے " [۱]

[۱] Educational Essays صفحہ ۳۱ -

لیکن اگر مدرسے کو محض رسمی درس کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو ' اور سیکھنے اور کرنے ' علم و عمل میں ربط قائم نہ کیا جائے تو سیرت کی تشکیل اور علم کی تحصیل میں کوئی تعلق پیدا نہ ہوگا اور اس کی وجہ سے دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہہ پر ناقص رہ جائیں گی اسی سبب سے اکثر ماہرین تعلیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دست کاری کو نصاب میں محض ایک جداگانہ مضمون کے طور پر داخل کرنا کافی نہیں بلکہ اس کو تمام مضامین نصاب میں ذریعہ تعلیم بنانا چاہئے - اگر معلم طریقہ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کریں اور مدرسے کے نصاب اور مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو اس طرح منظم کریں کہ طلبہ میں مذکورہ بالا صفات پیدا ہوں تو تعلیم میں ایک انقلاب عظیم ہوجائے گا - مدرسے کی اخلاقی تربیت محض حلقہ درس اور اوقات تعلیم تک محدود نہ رہے گی بلکہ وہ ہر وقت اور ہر کام کے ذریعہ اس کام کو انجام دیگا - اس حالت میں طلبہ کے تمام مشاغل کی ایک اخلاقی اہمیت ہوگی اور ان سے ان کو اخلاقی سیرت کی تشکیل میں مدد ملے گی - تحصیل علم میں صحیح طریقہ عمل اختیار کرنے کی بدولت جو صفات طلبہ میں نشو و نما پاتی ہیں وہ محض علمی اور ذہنی اعتبار سے نہیں بلکہ اخلاقی اور عمرانی لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر ہیں - معاملات پر غیر جانبداری اور بے تعصبی سے غور کرنا ' کام میں خلوص اور انہماک ' وسعت نظر ' استقلال اور حوصلہ ' اجتماع توجہہ ' اعتماد ذات ' احساس و ذمہ داری ' یہ تمام چیزیں اخلاقی سیرت کا جزو لازم ہیں - جس شخص میں یہ صفات پائی جائیں گی وہ ہر کام کو ' خواہ اس کا تعلق کسی شعبہ زندگی سے ہو ' ایمانداری اور قابلیت کے ساتھہ انجام دیگا -

باب چہارم

ضبط و تادیب کا نظریہ جدید

طلبہ کی سیرت کی تشکیل میں مدرسے کے قواعد اور قوانین اور ضبط و تادیب کو بھی بہت کچھہ دخل ھے - طریقۂ تعلیم کی بحث میں ھم نے بتایا ھے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور امداد باھمی کی عادت ڈالنی ضروري ھے - اور اگر یہ صحیح اصولوں پر مرتب کیا جائے تو درس اور تدریس کے ضمن میں ان صفات کي نشو و نما خود بخود ھو جائگی - لیکن ان صفات کی ضرورت علاوہ علمی کاموں کے زندگی کے دوسرے تعلقات اور فرائض میں بھي پڑتی ھے مثلاً معاشی مشاغل میں ' عمرانی فرائض کی ادائگی میں اور ھر قسم کی ذاتی مشکلات سے عہدہ برآ ھونے میں - معلم کو یہ بھی سوچنا چاھئے کہ اِن فرائض کے لئے طلبہ کو کس طرح تیار کرے - جب بہت سے ھم عمر اور ھم مقصد بچے ایک مدرسے میں جمع ھوتے ھیں ' ساتھہ لکھتے پڑھتے ھیں ' اٹھتے بیٹھتے ھیں ' کھاتے پیتے ھیں ' کھیلتے کودتے ھیں تو ان میں علاوہ علمی تعلقات کے بہت سے معاشری تعلقات بھی پیدا ھوتے ھیں - انھیں آپس میں دوستی ھوجاتی ھے ' جن مقاصد میں انھیں مشترک طور پر دلچسپی ھوتی ھے ان کے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد سے کوشش کرتے ھیں ' کلب اور انجمنیں بناتے ھیں ' انفرادی آزادی کو بر قرار رکھنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے کے لئے قاعدے بناتے ھیں تاکہ ھر فرد اور ھر گروہ اپنا اپنا کام بغیر خارجی مداخلت کے کرسکے خواہ اس کا تعلق درسي مشاغل سے ھو یا فرصت کے اوقات کي تخلیق و تعمیر سے - اس

طرح رفتہ رفتہ مدرسے میں معاشری روایات قائم ھوجاتی ھیں اور عمل کے اخلاقی معیار بن جاتے ھیں - اس میں ایک خاص "فضا" پیدا ھوجاتی ھے جس سے تمام طلبہ خود بخود متاثر ھوتے ھیں ھر نیا طالب علم بہت جلد ان روایات کو اور رائے عامہ کے احکام کو قبول کرلیتا ھے - اس قسم کی معاشری زندگی اور اس کے اثرات مدرسوں میں ھمیشہ سے چلے آتے ھیں لیکن اس کی اھمیت پوری طرح ابھی تک نہیں سمجھی گئی - البتہ جدید نظریۂ تعلیم نے اس کو مدرسے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر مانا ھے اور اس بات کی تاکید کی ھے کہ معلموں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاھئیے - مدت تک استادوں نے طلبہ کے باھمی میل جول کی طرف سے یا تو بالکل بے اعتنائی برتی یا اس کو قابل اعتراض جان کر روکا کیونکہ وہ تو درسی تعلیم کے علاوہ ھر چیز کو مدرسے کے مقصد کے خلاف سمجھتے تھے - لیکن باوجود اس کے بچے اکثر اپنی فطرت کے مقتضا سے مجبور ھوکر مدرسوں میں معاشری زندگی کی بنیاد ڈال لیتے ھیں اور کھیلوں میں بالخصوص اس کا اظہار ھوتا ھے - مگر ھمارے معلموں نے اب تک اس کی باقاعدہ تنظیم کرکے اس سے اخلاقی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی - یورپ کے بعض ملکوں مثلاً انگلستان، سوئٹزر لینڈ اور جرمنی میں اور امریکہ کے بہت سے مدرسوں میں طلبہ کی اجتماعی زندگی کا باقاعدہ مطالعہ کیا گیا ھے اور اس کے نفسی اور معاشری پہلوؤں پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ھیں جن کے مطالعے سے ھر سمجھدار آدمی کے تجربے کی تصدیق ھوجاتی ھے کہ اس کے ان تعلقات کا طلبہ کی سیرت پر نہایت گہرا اثر ہوتا ھے اور اگر ان کو مناسب اصولوں پر منظم کیا جائے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے تو معلم غیر محسوس طریقے پر طلبہ کی سیرت کو بہتر بنا

سانچوں میں ڈھال سکتا ھے اور اپنی طرف سے خواہ مخواہ دخل در معقولات کئے بغیر معاشری ضبط و تادیب سے کام لے سکتا ھے جس کی مداخلت کو بچے اور نوجوان خوشی سے قبول کرتے ھیں -

ماھرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ھے کہ مدرسے کے ماحول میں معاشرہ خود افراد کی تربیت میں بہت دخل رکھتا ھے لیکن اس سے پورا فائدہ اس وقت اٹھایا جاسکتا ھے جب معاشری زندگی کی تنظیم خود طلبہ کے ھاتھہ میں ھو اور اسکول کی حکومت اور ضبط و نظم کی بنیاد ان کے معاشری احساس پر رکھی جائے - بالفاظ دیگر ان میں حکومت خود اختیاری قائم کی جائے اور اس چھوٹی سی ریاست کا انتظام ' اور باھمی معاملات اور اختلافات کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام انھیں کے سپرد کردیا جائے - جب تک انھیں معاشری معاملات میں آزادی عمل حاصل نہ ھوگی وہ باھمی مشورے اور اتفاق رائے سے زندگی کے مسائل کو طے کرنا اور اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق حاصل کرنا نہیں سیکھیں گے ' اور نہ ان میں اعتماد ذات پیدا ھوگا نہ باھمی مراعات و مفاھمت کی عادت ' جس پر تمدنی زندگی کا انحصار ھے - خصوصاً موجودہ زمانے کا جمہوری نظام ایسے افراد کا طالب ھے جن میں اعتماد ذات کے ساتھہ دوسروں پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت بھی ھو ' جن میں اجتماعی اتحاد اور شہریت کے فرائض کا پورا احساس ھو ' جو موقع پر قیادت کا کام انجام دے سکیں اور ضرورت کے وقت خلوص اور وفاداری کے ساتھہ اپنے قائد کی اطاعت کرنے کو تیار ھوں - ھماری تعلیم گاھیں ' جمہوری شہریت کے لئے موزوں افراد اسی حالت میں پیدا کرسکتی ھیں جب ان کی اندرونی تنظیم خود مختار جماعتوں کی سی ھو اور اس کے طلبہ کو ذمہ دارانہ طریقہ پر انتظامی فرائض ادا کرنے

کا موقع ملے - جن مدارس میں حکومت خود اختیاری کا تجربہ کیا گیا ہے اور مطالعہ کے کمروں، کھیل کے میدانوں اور دارالاقامہ میں طلبہ کو آزادی کے ساتھہ ساتھہ ذمہ داریاں بھی دی گئی ہیں وہاں بالعموم بہت عمدہ نتائج حاصل ہوئے ہیں اور ان کے طلبہ نے اعتماد ذات، قوت عمل اور معاشری رواداری کا ثبوت دیا ہے - ان مدرسوں کے معلموں کو اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ہر وقت جاسوس کی طرح اپنے شاگردوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی ٹوہ میں رہیں اور نکتہ چینی اور عیب جوئی کا ناگوار فرض ادا کرتے رہیں جس کی وجہ سے اکثر اُستادوں اور شاگردوں کے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں - وہاں ضبط و تادیب کے فرائض طلبہ خود انجام دے لیتے ہیں - معلموں کو اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت سے اس چھوٹے سے معاشرے کی عام فضا پر عمدہ اثر ڈالیں - اس کے افراد فرائض اور ذمہ داریوں کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی اپنے کام میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ خود اس سے باز پرس کرتے ہیں اور اس کے لئے سزا تجویز کرتے ہیں - علاوہ بریں اس انتظام میں ان طلبہ کو قیادت اور سرداری کے فرائض انجام دینے کا موقع ملتا ہے جو فطرتاً اس کے اہل ہوتے ہیں اور باقی سب مل جل کر احکام کی تعمیل کرنا سیکھتے ہیں -

حکومت خود اختیاری کے تجربات صرف عام مدارس ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ بعض ماہرین نفسیات اور معلموں نے انہیں نو عمر مجرموں کی اصلاح اور تعلیم میں بھی استعمال کر کے دیکھا اور بہت کامیاب پایا - ان کی تجویز یہ تھی کہ ان مجرموں کو جو بالعموم شہروں کی خراب اور گمراہ کرنے والے ماحول ہی میں بگڑتے ہیں وہاں سے نکال کر ایسی جگہ منتقل کیا جائے جہاں ان کو آزادی کی فضا

ملے اور خود اپنی زندگی نئے سرے سے تنظیم کرنے کا موقع حاصل ہو - چنانچہ یہی ہوا اور یہ نوجوان اور بچے ان اصلاحی مدارس یا بستیوں میں رکھے گئے جہاں حکومت خود اختیاری کے اصولوں کی کار فرمائی تھی - یہ لوگ خود قانون بناتے تھے اور تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو آپس میں تقسیم کر لیتے تھے - ان پر کوئی بیرونی تعزیر عائد نہیں کی جاتی تھی بلکہ جو افراد جماعت کے قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے جماعت ان کو خود ہی سزا دے لیتی تھی - ان پر ایک بہت بڑا اصلاحی اثر یہ ڈالا گیا کہ ان کے لئے خود اپنی محنت سے روزی کمانا لازم کر دیا گیا اور اس طرح انہیں با قاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت پڑی جو اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر سے بہترین چیز ہے - جو اراکین جماعت ابتدأ میں چند روز یا چند ہفتے تک اپنی پرانی عادتوں کی وجہ سے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے ان کے لئے کوئی جسمانی سزا مقرر نہیں تھی لیکن انہیں اپنے ساتھیوں کی خیرات پر گزارہ کرنا پڑتا تھا جس سے زیادہ تکلیف دہ اور شرمناک محتاجی اور کیا ہوسکتی ہے ؟ چنانچہ اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا تھا کہ وہ خود ہی کام کرنا شروع کر دیتے تھے اور جماعت کے فرائض میں شریک ہوجاتے تھے - اس طرح اکثر نوجوانوں کے مجرمانہ رجحانات کی اصلاح بہت جلد ہوگئی اور ان میں وہ عادتیں پختہ ہونے لگیں جو کامیاب اور مفید شہری بننے کے لئے ضروری ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو محنت اور باقاعدہ کام کرنے کی ذمہ داری سے ان کی طبیعت کی اصلاح ہوتی اور دوسری طرف ان کی بہت سی عملی صلاحیتیں اور مفید حوصلے جن کو واقعات اور حالات نے دبا رکھا تھا اور اس وجہ سے ان کے نفس میں ایک مستقل اور مسلسل کشمکش رہتی تھی اب مناسب صورتوں میں ظاہر ہونے لگتے - آزادی اور ذمہ داری کی اس نئی فضا میں آنے والے افراد

کو یہ محسوس ہوا کہ اب وہ کسي بیرونی اور خارجی طاقت سے برسرپیکار نہیں جو ان کی مخالفت پر آمادہ ہے بلکہ اپنے ہی ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھہ زندگي بسر کر رہے ہیں جو کچھہ عرصہ پہلے انہیں کی طرح معاشرے اور اس کے قوانین سے باغي تھے لیکن اب اس جماعت کے ذمہ دار اراکین بن گئے ہیں جو خود قانون وضع کرتے ہیں اور خود ہی اسے نافذ کرتے ہیں - اس لئے اس قانون کي مخالفت میں نہ انہیں کوئی لطف آتا ہے نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے - لہذا رفتہ رفتہ جماعتی زندگی کے اصول اور قوانین کو قبول کرکے بقول شخصے " جنگل کے چور ہی جنگل کے محافظ بن جاتے ہیں " اور کچھہ عرصہ کے بعد اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ان کي اصلاحی بستیوں سے نکل کر معاشرے کی طبعی زندگي میں بحیثیت ذمہ دار شہریوں کے حصہ لے سکیں - اگر یہ لوگ ایسی فضا میں نہ رکھے جاتے جو اخلاقی تربیت کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے تو وہ بھی معمولي مجرموں کی طرح جیل خانوں میں رہ کر مختلف قسم کي سزائیں اور معاشرے کی مخالفت برداشت کرکے عادی جرائم پیشہ بن جاتے اور تمام عمر معاشري اور اخلاقی قوانین کے خلاف ورزي کرتے رہتے - ان تجربوں کی نہایت دل چسپ اور سبق آموز تفصیل بہت سی جدید تعلیمی تصانیف میں بیان کی گئی ہے جن میں سے ہومر لین (Homer Lane) کي کتاب " Little Commonwealth " اور امریکہ کی ایک اصلاحی بستی "George Junior Republic" کے حالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اس کے نفسیاتی پہلو سے سرل برٹ (Cyril Burt) نے جو ایک انگریز عالم نفسیات ہیں اپنی مستند اور قابل قدر کتاب "The Young Delinquent" (نو عمر مجرم) میں بحث کي ہے - علمی تحقیق اور عملی تجربات دونوں اس امر پر

متفق ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے طریقے اور تجربات صرف انہیں طلبہ کے لئے مفید نہیں جو بعض خارجی یا خلقی اسباب کی وجہ سے دماغی کمزوریوں اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہیں بلکہ مدرسوں کے معمولی طلبہ کے لئے بھی ' جن کی دماغی اور اخلاقی حالت طبعی ہے ' اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کار آمد ہیں ' کیونکہ ان طلبہ کو سابقہ خرابیوں اور کمزوریوں کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی بلکہ شروع ہی سے آزادی کی فضا میں ان کی تربیت کی صحیح بنیاد پڑجاتی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری میں اخلاقی اصول و قوانین کی پابندی کرنا سیکھہ لیتے ہیں -

ہم نے حکومت خود اختیاری کے جو اصلاحی ارر طبعی فوائد بیان کئے ہیں ان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اور بہت سی ایسی عملی مشکلات سے بحث نہیں کی جو اس کے دوران میں پیدا ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس تجربے کو کامیاب نہیں ہونے دیتیں - لیکن ہم نے اپنی بحث قصداً اصولوں تک محدود رکھی ہے اور جہاں تک اس اصول کا تعلق ہے جس پر حکومت خود اختیاری کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کی صحت اور مقبولیت میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں گو اسے عمل میں لانے کے لئے بہت کچھہ احتیاط اور دیکھہ بھال کی ضرورت ہے - ضبط و انضباط کا یہ نیا نظریہ جو آزادی اور ذمہ داری کے ستونوں پر قائم ہے اور دونوں کو برابر اہمیت دیتا ہے ادب و تادیب کے پرانے اصولوں سے بہت مختلف ہے - اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہمیں پھر ایک بار اس غلط نفسی عقیدے کی تردید کرنا چاہئے جس کا ہم نے اس حصہ کے باب اول میں ذکر کیا ہے اور جس کی وجہ سے اخلاق کے مفہوم کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں - اکثر زبانوں

میں ' زیادہ تر مذہب کی تعلیم کی وجہ سے ' یہ خیال رائج رہا ہے کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے اور بہت کچھہ مشکلیں اور تکلیفیں اتھانے ' اور اپنے نفس کو مارنے کے بعد ' وہ ایک حد تک خیر کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے - مذہب عیسوی کے نطریہ اخلاق و نجات کی بنیاد اسی عقیدے پر رکھی گئی ہے اور جہاں کہیں رہبانیت اور ریاضت کی تعلیم دی گئی ہے وہاں کسی نہ کسی شکل میں اسی خیال کی کار فرمائی پائی جاتی ہے - اس نظریہ کے مطابق انسان کے نفس میں قوت ارادی اور خواہشات کے درمیان ہمیشہ جنگ رہتی ہے - خواہشات اس کو برائی اور بدی کی جانب لے جاتے ہیں اور قوت ارادی کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو جبراً اس راہ پر چلنے سے روکے - گویا وہ ایک مستقل اور قائم بالذات قوت ہے جس کو فطری خواہشات اور میلانات سے کوئی اندرونی تعلق نہیں سوائے اس بیرونی تعلق کے کہ ان کی مخالفت اور روک تھام کرے - یہ قوت ارادی " ضمیر " کہلاتی ہے اور انسان کا دل ایک " رزم گاہ خیر و شر " سمجھا جاتا ہے - یہاں " شر " کے معنی ہیں انسان کے جبلی میلانات اور " خیر " نام ہے اس قوت ارادی یا ضمیر کا جو اسے نیکی کی طرف کھینچتا ہے - اس نقطۂ نظر کے مطابق سوائے خاص خاص لوگوں کے جو غیر معمولی اخلاقی قوت اور روحانیت رکھتے ہیں اور کوئی شخص ان بری خواہشات کو پوری طرح زیر نہیں کر سکتا - البتہ تادیب نفس کے ذریعہ ایک حد تک انہیں قابو میں رکھہ سکتا ہے ' جس طرح معاشری زندگی میں پولیس مجرموں کا خاتمہ نہیں کر سکتی لیکن ان کو تھوڑا بہت دبائے رکھتی ہے -

فطرت انسانی کی اس تفسیر نے تعلیم اور تادیب کے نظام پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے - اس کی رو سے نہ صرف بالغین کی بلکہ بچوں

کی فطرت بھی قدرتاً شر کی طرف مائل ھے اور اس کی اصلاح کا طریقہ یہی ھو سکتا ھے کہ اوائل عمر ھی سے رکاوٹوں ' بندشوں اور سزاؤں سے کام لیا جائے اور بچوں کی فطری میلانات اور خواھشات جو خرابی کی جڑ ھیں ' ابھرنے نہ دی جائیں - ان کی روح کی نجات اسی میں ھے کہ وہ بے چوں و چرا ان تمام قواعد اور احکام کی پا بندی کریں جو والدین اور اُستاد ان پر عائد کرتے ھیں خواہ ان کا مطلب اور فائدہ ان کی سمجھہ میں آئے یا نہ آئے - ھر معاملے میں انہیں اپنی ذاتی خواھشات کو دبانا اور روکنا چاھئے کیونکہ خواھش کی راہ پر چلنا شیطان کو اس کے کام میں مدد دینا ھے - انگلستان کے مشہور فلسفی جان لاک (John Locke) کا نظریہ تعلیم و تادیب بہت کچھہ اس خیال کی نمائندگی کرتا ھے - اس کا تعلیمي اصول یہ تھا کہ :—

" بچے کی روح کو ھلاکت سے بچانے کے لئے اس کی خودی کو پامال کرو "

لیکن صدیوں کے تجربے نےاس بات کو واضح کردیا ھے کہ اگر ضبط و تادیب کی بنیاد محض خارجی خوف اور بیرونی بندشوں پر رکھی جائے گی تو اس کے نتائج بہت خراب ھوں گے - یا تو طلبہ میں عمل کا حوصلہ اور ولولہ بالکل نہیں رھے گا اور وہ اپنی قوت ارادی اور جذبات کو برے کیا اچھے کاموں کے لئے بھي استعمال نہ کرسکیں گے - یا وہ کھلم کھلا ان بندشوں کی مخالفت کریں گے جن کی وجہ سے مدرسے میں استادوں اور شاگردوں میں ھر وقت ایک کشمکش رھے گی جو تعلیم کی کامیابی میں حارج ھوگی ' یا انہیں کھلے بندوں مقابلہ کرنے کي ھمت نہ ھوئی تو ان کی مخالفت درپردہ اور بھی گہري ھو جائے گی یعنی داخلی اور

نفسی کشمکش کی کیفیت اختیار کرے گی جو دماغی اور اخلاقی صحت کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ صورت ہے - حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی دماغی اور اخلاقی صحت اور مدرسے کا ضبط و انتظام اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب طلبہ اپنے کام میں دلچسپی لیں ' مدرسے کے قانون کو سمجھ کر اس کا احترام کریں ' خود اس کے بنانے میں شریک ہوں اور اس کی پابندی کرنے اور کرانے کو اپنا ذاتی فرض تصور کریں - برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) ضبط کے اس مفہوم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

" جب طلبہ ان کاموں میں مشغول ہوتے ہیں جو ان کو خود مرغوب ہیں تو بیرونی ضبط و تادیب کی ضرورت ہی نہیں پڑتی - چند سیدھے سادھے قاعدے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں کافی ہیں مثلاً یہ کہ کوئی بچہ دوسرے بچوں کے کام میں مداخلت نہ کرے ' ایک وقت میں ایک سے زیادہ اپریٹس (apparatus) استعمال نہ کرے وغیرہ وغیرہ - وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ قاعدے مناسب اور قرین عقل ہیں اس لئے ان کی پابندی میں دقت نہیں ہوتی - اس طرح بچے میں ضبط نفس پیدا ہوتا ہے جو دو چیزوں پر مشتمل ہے ' ایک تو کسی حد تک اچھی عادتوں پر دوسرے اس احساس پر جو عملی مثالوں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے ' کہ بعض اوقات انجام کار فائدہ اسی میں ہے کہ آیندہ نفع کے لئے موجودہ خواہش روک لی جائے - لوگوں کو ہمیشہ سے یہ بات معلوم ہے کہ کھیلوں میں اس قسم کا ضبط نفس آسانی

سے حاصل ہوتا ہے - لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ تحصیل علم بھی اتنی دلچسپ بنائی جاسکتی ہے کہ اس میں وہی محرکات عمل کار فرما ہوں جو کھیلوں میں ہیں..........اس کا اصل اصول بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی ضبط بیرونی جبر اور دباؤ کے مرادف نہیں بلکہ ان ذہنی عادتوں پر منحصر ہے جن کی وجہ سے بچہ خود بخود برے اور ناپسندیدہ کاموں کے بجائے اچھے اور پسندیدہ کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے "[۱]

اس خیال کے خلاف ایک لازمی رد عمل یہ ہوا کہ بعض معلمین اور مفکروں نے اس کے بالکل برعکس نقطہ نظر اختیار کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ بچہ اوائل عمر میں تمام تر خیر و خوبی کا مجسمہ ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ماحول کے اثر اور اپنے ساتھیوں اور بزرگوں کی بری مثال کا نتیجہ ہیں - روسو نے اس خیال کی نمائندگی کی ہے وہ کہتا ہے کہ :—

" ہر چیز جب خالق فطرت کے ہاتھوں سے نکل کر آتی ہے، اچھی ہوتی ہے لیکن انسان کے ہاتھ میں آکر خراب ہو جاتی ہے - "

انہیں خیالات کو شاعرانہ پیرائے میں ورڈز ورتھ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی نظموں میں جا بجا بیان کیا ہے - بالخصوص

---

[۱] On Education صفحہ ۲۹ -

اس کی مشہور نظم " اوائل عمر میں حیات ابدی کے نشانات " [۱] کا موضوع یہی مسئلہ ہے :—

" ہم بچپن میں آسمان سے جو ہمارا گھر ہے ' اُترتے ہیں اور ہمارے پیچھے پیچھے روحانی عظمت و جلال کے بادل امڈے چلے آتے ہیں "

اس نقطۂ نظر کی رو سے انسان میں کوئی فطری قوتیں ایسی نہیں ہوتیں جو اس کو برائی کی طرف لے جاسکیں - اس کی طبیعت کا میلان سراسر خیر کی جانب ہوتا ہے - اگر معاشرے کے خراب اثرات اس پر نہ پڑیں اور تربیت صحیح اصولوں پر کی جائے تو وہ بہت عمدگی اور آسانی سے ایک مفید شہری اور با اخلاق انسان بن جائیگا - اس سے مدرسے کے ضبط و تادیب کے متعلق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کو اور افراد کو بچوں کی نشو و نما میں کم سے کم مداخلت کرنی چاہئے اور اُنہیں جہاں تک ممکن ہو ان کی فطرت پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ اس کے قوانین کے مطابق تربیت پائیں اور ماحول کے خراب اثرات کی وجہ سے ان کی نفسی اور اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ نہ پیدا ہو - جن معلموں نے روسو (Rousseau) وغیرہ کی پیروی میں اس اصول پر عمل کیا انھوں نے حتی الامکان مدرسوں ' سے سزاؤں بندشوں اور بیرونی قواعد اور ضابطوں کو اُٹھادیا اور طلبہ کو آزادی دیدی کہ وہ ایک وسیع دائرے کے اندر جو چاہے کریں - یعنی اپنی فطرت کے مقتضا کے موافق جن مشاغل کو چاہیں اختیار کریں -

---

Ode on the Intimations of Immortality especially in early [1] childhood.

یہ خیال بہت دل خوش کن معلوم ہوتا ہے اور اکثر نرم مزاج معلموں کے دل کو لگتا ہے ' اور دنیا کے بہت سے مصلحوں اور نوع انسانی کے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے اپنی اصلاحی تجاویز کی بنیاد اسی پر رکھی ہے - لیکن واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خیال بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا وہ خیال کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے - در اصل یہ دونوں نظرئے تصویر کے دو مختلف رخوں کو دکھاتے ہیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے مبالغہ کے ساتھہ اپنے اپنے نقطہ نظر کو ظاہر کرتے ہیں - حقیقت ان دونوں کے وسط میں ہے یعنی ہمیں ایک طرف تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بچے فطرتاً شر کی طرف مائل نہیں اور دوسری طرف یہ ماننا پڑیگا کہ ان میں بعض ایسی جبلتیں ہیں جو غلط راہ پر پڑکر اخلاقی خرابیوں کی شکل اختیار کرسکتی ہیں - بچے کو نہ تو بری جبلتوں کا غلام سمجھنا چاہئے جن کے ہاتھہ وہ اتنا بے بس ہے کہ جب تک ان کو ریاضت اور نفس کشی کے ذریعے زیر نہ کرے نیک نہیں بن سکتا - نہ اس کو ماحول کی قوتوں کے ساتھہ اس حد تک وابستہ تصور کرنا چاہئے کہ اس کی اصلاح اور تخریب دونوں ان پر منحصر ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک خود اپنی سیرت اور اپنے کردار کا خالق ہے ' اور اپنی جبلی قوتوں اور ماحول کے وسائل اور اثرات سے کام لیکر اپنی زندگی کو بنانا اور بگاڑنا اسی کے اختیار میں ہے - موجودہ علم نفسیات اس مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ بچہ کو اوائل عمر میں اخلاقی اعتبار سے نہ اچھا کہہ سکتے ہیں نہ برا - اس کی ابتدائی حرکات ' جو محض اس کی جبلتوں کا سیدھا سادہ اظہار ہیں ' کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں یعنی کسی اخلاقی معیار پر نہیں پرکھی جاسکتیں - اس کی مخصوص اور قوی جبلتیں

بھی مثلاً تجسس ' تعمیر ' اظہار خودی ' نقل وغیرہ اپنی ابتدائی
شکل میں اخلاق سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں - اس لحاظ سے ہم کہ
سکتے ہیں کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں کے جب آبائی توارث کے
خراب اثرات جسمانی اور دماغی کمزوریوں ' اور برے میلانات کی شکل
میں ظاہر ہوں ' بچے اوائل عمر میں خیر و شر سے بری ہوتے ہیں
یعنی ہم ان کے عمل پر کوئی اخلاقی حکم نہیں لگا سکتے ' نہ ان کو
اپنے افعال کا ذمہ دار ٹھیرا سکتے ہیں - لیکن یہ ضرور ہے کہ ان لا اخلاقی
جبلتوں اور رجحانوں میں خیر و شر دونوں کے امکانات پوشیدہ ہیں اور
یہ امر ماحول کے اثرات ' تعلیم ' تربیت اور خود بچے کی اپنی کوشش
پر منحصر ہے کہ یہ آئندہ چل کر کیا رنگ اختیار کریں گے ' آیا
اخلاق حسنہ کی شکل میں ظاہر ہوں گے یا اخلاقی عیوب کی صورت
میں - رسل (Russel) اپنی کتاب میں اس بات کو بہت صاف
اور واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے :—

" حقیقت یہ ہے کہ بچے قطرتاً نہ " اچھے " ہوتے ہیں نہ
" برے " وہ صرف چند اضطراری افعال اور جبلتیں
لے کر پیدا ہوتے ہیں - انھیں کی بنیاد پر ' ماحول
کے اثر سے عادتیں نشو و نما پاتی ہیں جو اچھی بھی
ہوسکتی ہیں اور بری بھی - ان کا اچھا یا برا ہونا
زیادہ تر ماؤں اور کھلائیوں کی عقل پر منحصر ہے کیونکہ
اوائل عمر میں بچوں کی طبیعت بے حد شکل پذیر
ہوتی ہے - اکثر بچوں میں اچھے شہری بننے کی صلاحیت
بھی ہوتی ہے اور مجرم بننے کی بھی - علم نفسیات
کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ میں

چھہ دن بچوں کو زد و کوب کرنے اور ساتویں دن وعظ اور
تلقین کرنے کا دستور اُن کو نیک بنانے کا صحیح طریقہ
نہیں - لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاھئے کہ
اخلاقی تربیت کی کوئی صورت ھی نہیں ھے - کسي
تندرست بچے کو خوش رکھنا مشکل نہیں اور اگر
بچوں کے جسم اور دماغ کی مناسب نگہداشت کی
جائے تو وہ بالعموم خوش رھتے ھیں بچپن میں خوش و
خرم رھنا بہترین قسم کا انسان بننے کے لئے بالکل
لازمي ھے - اگر بچے یہ محسوس کریں گے کہ تعلیم کے
ذریعہ وہ مفید باتیں سیکھہ رھے ھیں تو اُن میں
کاھلی کی وہ عادت پیدا نہ ھوگی جس کو ڈاکٹر آرنلڈ
اخلاقی عیب سمجھتے ھیں - برخلاف اس کے اگر بچے
کو جو علم سکھایا جاتا ھے وہ اسے بےکار معلوم ھو اور اُستاد
ظالم اور بے رحم نظر آئے تو اس کی وھی حالت ھوگی
جو چیخوف (Tchehov) کی کہانی میں بلی کے بچے
کي ھوئی تھی [۱] - ھر صحت مند بچے کو از خود سیکھنے
کی خواھش ھوتی ھے جس کو وہ مثلاً چلنے اور بولنے
کي کوشش میں ظاھر کرتا ھے - اسی خواھش کو تعلیم

---

[۱]—چیخوف نے ایک کہانی میں ایک پروفیسر کا ذکر کیا ھے جو اپنی بلی کے بچے
کو مار مار کر چوھوں کا شکار کرنا سکھایا کرتا تھا - نتیجہ یہ ھوا کہ بے چارہ بلی کا بچہ
اس فطری فعل سے اتنا ڈرنے لگا کہ جب وہ کسی چوھے کو دیکھتا تو مارے ڈر کے پسینے
پسینے ھوجاتا تھا - فاضل پروفیسر نے اس ''مشاھدے'' سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بچہ بالکل غبی
اور احمق ھے - (اس قصہ سے پروفیسر موصوف کی حماقت صاف ظاھر ھوجاتی ھے - لیکن
دنیا میں انسانوں کے لا تعداد بچوں سے ان کے معلموں نے بالکل یہی سلوک کیا ھے اور
صدیوں کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی!) -

میں قوت محرکہ بنانا چاہئے - (بچوں کی) تعلیم
میں اُستاد کی قمچی کے بجائے اس خواہش سے کام
لینا ہمارے زمانے کی نہایت اہم تعلیمی اصلاح ہے - [۱]"

پس معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا صحیح نظریہ قائم کرنے کے لئے ہمیں ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا چاہئے جن کے تعامل سے انسانی سیرت اپنا مخصوص رنگ اختیار کرتی ہے - معلم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ بچوں کی ابتدائی جبلتوں میں بہت بڑی قوت ہوتی ہے جس کو نظر انداز کرنا سخت غلطی ہے - اگر ان جبلتوں کو تربیت دے کر اس طرح منظم نہ کیا جائے گا کہ وہ علمی اور اخلاقی مقاصد میں معین ہوں تو وہ ہر ہر قدم پر اس کی کوششوں میں مزاحم ہوں گی اور اخلاقی تعلیم محض الفاظ تک محدود رہے گی عمل کی شکل میں ظاہر نہ ہوگی - کیونکہ عمل کی محرک ہمیشہ کوئی ایک جبلت یا کئی جبلتیں ہوتی ہیں - لیکن جبلتوں کی تنظیم بغیر کسی خارجی ماحول کے نہیں ہوسکتی - اس کے لئے ان میں اور ماحول کے اثرات میں باہمی رد عمل کی ضرورت ہے - ہر جبلت بالعموم یہ ظاہر کرتی ہے کہ خاص حالات میں بچے کی طبیعت اور عمل کا میلان ایک خاص "سمت" میں ہوگا لیکن یہ بات ماحول کے اثر پر منحصر ہے کہ وہ میلان کس موقع پر کس "شکل" میں ظاہر ہوگا - مثلاً اظہار خودی کی جبلت کا تقاضا یہ ہے کہ بچہ اپنی قوتوں سے کام لے کر کسی طرح اپنی شخصیت کا سکہ اپنے ساتھیوں اور ماحول پر بٹھائے - یہ جبلت ہر بچے میں ہوتی ہے ' بعض میں بہت قوی بعض میں کمزور - اس کے اظہار کی بے شمار صورتیں ہیں - اگر ماحول کا اثر اور ہم صحبت لوگوں کی مثال خراب

[۱]—On Education صفحہ ۲۹ -

ہے تو ممکن ہے بچہ اپنے سے کمزور بچوں کو مارے پیٹے اور اس طرح رعب جمانا چاہے - یا ضد کرکے اپنے سے بڑوں کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کرے یا اور قابل اعتراض حرکات کرے جن سے دوسروں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہو - یہ سب اظہار خودی کی ناپسندیدہ شکلیں ہیں اور ان کا تجربہ ہر معلم کو ہوتا رہتا ہے - لیکن اس جبلت کو عمدہ تربیت اور اثرات کے ذریعے بہترین عادات و صفات کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے - جہاں اظہار خودی کی ایک صورت دوسرے انسانوں پر جبر اور ظلم سے غلبہ حاصل کرنا ہے' وہاں اس کا اظہار خدمت کے ذریعے' عالم فطرت کی قوتوں کے ساتھہ جنگ کرنے اور ان کو زیر کرنے کی شکل میں' علمی تحقیقات اور ادب اور آرٹ کی تخلیق میں بھی ہوسکتا ہے - مختلف لوگوں کی طبیعت کے لئے اظہار خودی کے مختلف طریقے موزوں ہوتے ہیں اور جس طرح ایک شخص کے جذبۂ خودی کی تسکین مثلاً جنگ و جدال کے مشاغل میں ہوتی ہے' بالکل اسی طرح کوئی دوسرا شخص ایک خوبصورت تصویر بنانے میں' یا پتھر کے ایک تھرس اور بے ڈھنگم تکڑے کو ایک حسین مجسمے میں تبدیل کرنے سے' یا قومی خدمت' اور مصیبت زدوں' غریبوں مظلوموں کی دادرسی سے' اپنی جبلت کو تسکین دیتا ہے - اس اختلاف کا باعث بڑی حد تک طبیعت کا فطری رجحان ہوتا ہے اور کسی حد تک ماحول کا اثر اور تقلید - لیکن تربیت اور ماحول کی اصل اہمیت یہ ہے کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں کے جب کوئی شخص نفسی امراض میں مبتلا ہو یا توارث کے بہت قوی اثرات کی وجہ سے اس کی جبلتوں کا اظہار لازمی طور پر غلط طریقہ اختیار کرے' ہر بچے کی جبلتیں ایسے مشاغل اور شوقوں کے ساتھہ وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ وہ اُن کی اپنی ذات کے لئے اور معاشری مشاغل

کے لئے مفید ثابت ہوں - مگر معلم کو ہر صورت میں یہ یاد رکھنا چاہئے
کہ تشکیل سیرت کے ڈراما میں ہیرو کا پارٹ خود بچے کی اپنی ذات
کرتی ہے اور اس کی جبلتیں ' اس کا وہ سرمایہ جو توارث جسمانی
کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ' اور ماحول کی قوتیں اور مظاہر سب وسائل
اور ذرائع ہیں جن کو وہ استعمال کرتا ہے - وہ ان کے بغیر کچھہ نہیں
کرسکتا - اس معنی میں وہ ضرور ان کا محتاج ہے - لیکن وہ ان کے
ہاتھوں میں بے بس نہیں ہوتا کہ جس طرح کمہار گیلی مٹی کو جس
شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے اسی طرح یہ تمام قوتیں اس کو
جس سانچے میں چاہیں ڈھالیں - اس کی اخلاقی آزادی اور ذمہ‌داری
کے یہ معنی ہیں کہ ان قوانین کے اندر رہ کر جو عالم طبعی اور عالم
معاشرت میں کار فرما ہیں ' اور جن سے رہائی حاصل کرنا کسی کے
لئے بھی ممکن نہیں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل خود کرسکتا ہے -

ہم یہاں انعام و سزا کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھہ بحث نہیں
کرسکتے لیکن چونکہ مدرسوں میں اور معلموں کے تعلیمی کار و بار میں
اس کو صدیوں سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے اس لئے مختصر طور
پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان کا صحیح منشا کیا ہے اور ان کو کن
حالات میں اور کن شرائط کے ساتھہ استعمال کیا جاسکتا ہے - اس
زمانے میں جب جدید تعلیمی خیالات کا اثر آہستہ آہستہ ہمارے دور
افتادہ مدرسوں تک پہنچ رہا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب تک
سزا خصوصاً جسمانی سزا کا جو زور رہا ہے اور کہیں کہیں اب بھی ہے
وہ سراسر ناجائز اور خلاف عقل ہے - بے سمجھہ اُستادوں نے مدتوں یہ
سمجھا اور اب بھی ایسے جاہل ' عقل کے دشمن استاد موجود ہیں
جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی بات بچہ کی سمجھہ میں نہ آئے

یا وہ اسے یاد نہ کرسکے تو اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ اس کو زد و کوب کرکے اس سے دماغ اور حافظے کو تیز کیا جائے - خواہ طالب علم کی تعلیمی کمزوری کی وجہ کوئی جسمانی نقص یا صحت کی خرابی ہو یا کوئی فطری دماغی کمزوری ' یا توجہ کا انتشار ' یا گھر کے حالات کی ناسازگاری ' یا اُستاد کے طریقہ تعلیم کی خرابی ان تمام صورتوں کے لئے اس کے پاس ایک ہی مجرب نسخہ تھا ' یعنی کسی قسم کی سزا اور وہ نئی نئی سزائیں ایجاد کرنے میں اپنی تمام قوت اختراع صرف کردیتا تھا - اب بھی گو سرکاری اور انگریزی مدارس میں جسمانی سزائیں بہت کم ہوگئی ہیں لیکن مکتبوں اور پاٹھشالاؤں میں اکثر مولوی اور پنڈت اپنے شاگردوں کی دھنی اور اخلاقی تربیت کے لئے انہیں طرح طرح سے جسمانی یا روحانی ایذا پہنچاتے ہیں - سزا کا سب سے ادنی اور سب سے زیادہ قابل اعتراض مفہوم یہ ہے کہ اُستاد ' شاگردوں کی کسی غلطی یا حرکت پر غصے اور انتقام کے جذبات سے بے بس ہوکر اس کو جسمانی تکلیف پہنچاوے - بعض لوگوں نے سزا کی اس خاص صورت کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات فطرت کے موافق ہے کہ انسان فوری غصے سے مغلوب ہوکر سزا دے - اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد سزا دینا ان کے نزدیک جائز نہیں - لیکن ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرسکتے - معلم اور اس کے شاگردوں کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے جس کا قیاس معاشری زندگی کے معمولی تعلقات پر نہیں کرنا چاہئے - اس میں اتنا تحمل اور بردباری ہونی چاہئے کہ وہ اپنے غصہ کو ضبط کر سکے ' اور نفسیات اطفال سے اتنی واقفیت ہو کہ وہ ان کی غلطیوں اور قصوروں کی نفسی توجیہ کرکے یہ معلوم کرے کہ ان کے حرکات کی واقعی ذمہ‌داری کن اسباب پر عائد

ھوتي ھے - اس طرح تحلیل نفسي کرنے کا یہ نتیجہ ھوگا کہ وہ غلط طریقہ استعمال نہیں کریگا - اور بجائے جسمانی سزا پر زور دینے کے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کریگا جو طلبہ کی تعلیمی یا اخلاقی تربیت میں حارج ھیں اور جن کی وجہ سے ان سے قابل اعتراض حرکات سرزد ھوتی ھیں -

سزا کا اصلی منشہ یہ ھے کہ بچے کو کسی طرح یہ محسوس کرایا جائے کہ اس کی کسي خاص حرکت یا فعل کي وجہ سے نہ صرف دوسروں کو تکلیف پہنچی ھے ' جس کا ممکن ھے ابھی اسے پورا احساس نہ ھوسکے ' بلکہ وہ خود بھی اپنے بعض حقوق اور آسائشوں سے محروم ھوگیا ھے ' اور جب کبھی وہ ان حرکات کا اعادہ کریگا اس کا یہی نتیجہ ھوگا - یہاں قدرتي تادیب کے طریقہ سے کام لینے کي گنجایش ھے جس پر روسو اور سپنسر نے زور دیا ھے - وہ دونو اس بات کی مخالفت کرتے ھیں کہ اُستاد بچوں کو جسمانی سزا دیں لیکن قدرتی سزا کے حامي ھیں جس سے وہ تکلیف یا خمیازہ مراد ھے جو بچوں کو اپنی حرکات کي وجہ سے خود بخود ' بطور قانون قدرت کے رد عمل کے اُٹھانا پڑے - اگر بچہ آگ کو یا کسي بہت گرم چیز کو ھاتھہ لگائیے گا تو اسکا ھاتھہ جل جائے گا اور وہ آئندہ احتیاط کرے گا - اگر وہ کسی دوسرے بچے سے کھلونا چھین لیگا تو مار کھائیگا ' اگر بے احتیاطی سے کھلونا توڑ دیگا تو اسے دوسرا کھلونا نہیں دیا جائیگا - اگر وہ وقت پر ھوا خوری کے لئے تیار نہ ھوگا تو باھر جانے سے محروم رھیگا - اگر وہ شرارت سے اپنے کمرے کے شیشے توڑ ڈالے تو بقول روسو (Rousseau) کے " رات دن ٹھنڈی ھوا اس کے کمرے میں آنے دو اور اس کي کچھہ پروا نہ کرو کہ اس کو زکام ھوجائیگا کیونکہ زکام ھوجانا اس سے بہتر ھے کہ وہ بے وقوف ھی رھے - اگر وہ تمہیں تکلیف پہنچائے

تو اس کی شکایت نہ کرو بلکہ اسے خود بھی وہی تکلیف محسوس کراؤ " -
اس طریقہ میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُستاد اور والدین کے فوری غضب اور مزاجی کیفیت کو اس میں دخل نہیں ہوتا اور بچہ دو تین مرتبہ کے تجربے کے بعد ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ بعض حرکتوں کے ناگوار نتائج ناگزیر ہیں اگر وہ اُن کا مرتکب ہوگا تو اسے ضرور تکلیف اٹھانی پڑیگی اور کوئی شخص اس کو اس خمیازہ سے نہیں بچا سکے گا - لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزائیں ہر جگہ پر کام نہیں دیتیں - بچوں اور نوجوانوں کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے پیدا ہوتے ہیں جب انہیں اپنے برے یا قابل اعتراض افعال کی کوئی فوری اور قدرتی سزا نہیں ملتی - مثلاً اگر کوئی بچہ اپنے سے کمزور بچے کو بے وجہ مارے یا اس کی کوئی چیز چھین لے تو اُسے اِس زیادتی کا کوئی فوری خمیازہ نہیں اٹھانا پڑیگا جب تک کوئی دوسرا شخص اس میں دخل نہ دے اور ارادتاً اس کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے، خواہ سزا دینے والے والدین ہوں یا اُستاد یا خود طلبہ کی جماعت منتظمہ - علاوہ بریں بعض قدرتی سزائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر فوراً ظاہر نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا عمل کرتا ہے اور بچے کو اپنی حرکت کا پورا خمیازہ بہت مدت کے بعد بھگتنا پڑتا ہے جب اس کی بری عادت راسخ ہوجاتی ہے اور اصلاح کی گنجایش باقی نہیں رہتی - اس کی ایک مشہور مثال ایک قاتل کا قصہ ہے جس نے پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے یہ درخواست کی تھی کہ اسے اپنی بوڑھی ماں سے ایک بات کہنے کی اجازت دی جائے - حاکم نے رحم کھاکر اجازت دیدی - اس نے یہ کیا کہ ماں کے کان سے منہ لگایا گویا سرگوشی کرنا چاہتا ہے اور اپنے دانتوں سے اس کا کان کاٹ لیا - جب لوگوں نے اسے اس پر لعنت ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ

اگر میری ماں بچپن ہي میں تنبیہ اور سرزنش کرتی جب میں اپنے ہم جماعتوں کی پنسلیں اور کاغذ چرایا کرتا تھا تو مجھے یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی - یہی حال اور بہت سی خراب عادتوں کا ہے مثلاً شراب خوری ' بد دیانتی ' جھوٹ بولنا - ممکن ہے کبھی ان کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوجائے لیکن اکثر اوقات لوگ مدت تک یہ حرکتیں کرتے ہیں اور اس کي انتہائی سزا ان کو بہت عرصہ کے بعد ملتی ہے جب انہیں اس سے کوئي فائدہ نہیں ہوسکتا -

غرض ہم قدرتی سزاؤں سے فائدہ ضرور اُٹھا سکتے ہیں - خصوصاً بچپن کے ابتدائی چند سال میں ان کا استعمال مفید ہے - لیکن بچوں کی تادیب کو صرف انہیں پر منحصر نہیں رکھہ سکتے بلکہ اکثر اس معاملے میں انسانی مداخلت کی ضرورت ہوتي ہے - چھوٹے بچے مختلف قسم کی بندشوں ' اور بعض مستثنیٰ صورتوں میں جسمانی سزا کے ذریعے ' ایسے افعال سے روکے جاسکتے ہیں جو ان کے لئے مضر ہیں - لیکن جب ان کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے اس وقت سزا کا مسئلہ زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہوجاتا ہے - اب ان میں عزت نفس اور احساس خودی کے جذبات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے - بہت سے قاعدے اور قانون بناکر یا سزاؤں کا ایک مفصل نقشہ تجویز کرکے انہیں شرارتوں اور بري حرکتوں سے باز رکھنا ممکن نہیں - بلکہ اگر اس قسم کی سزاؤں پر زیادہ زور دیا جائے تو اندیشہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں بزرگوں اور استادوں سے بغاوت اور ناراضگي کے جذبات راسخ ہوجائیں گے - جن معلموں نے اپنے شاگردوں کی نفسي کیفیات اور اعمال کا مشاہدہ غور سے کیا ہے وہ اس صورت حال سے بخوبی واقف ہیں -

لہذا بچپن کے آخری دور میں اور بلوغ کے زمانے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ طلبہ خود اپنے اعمال اور کردار کے ذمہ دار بنائے جائیں اور ہدایت کا مرکز باہر سے اندر کی جانب منتقل ہوجائے - اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی قوت ارادی کی تربیت کرنی چاہئے - تاکہ ان میں ضبط نفس پیدا ہو اور وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے ان سے عمدہ طریقہ پر کام لیں اور اپنی زندگی کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس پر اخلاقی اصولوں اور اخلاقی معیار عمل کی حکمرانی ہو - یہاں قوت ارادی سے مراد ' جیسا ہم بتا چکے ہیں ' وہ جداگانہ قوت نہیں جو قدیم نفسی عقیدے کے بموجب انسان کی خواہشات اور فطری میلانات کی دشمن ہوتی ہے اور بطور ایک بیرونی محافظ کے روک تھام کرتی رہتی ہے - بلکہ قوت ارادی دراصل خواہشات اور فطری رجحانات کی ترتیب و تنظیم سے عبارت ہے جو ہمیں ان کی اخلاقی قدر و قیمت سے آگاہ کرتی ہے اور ان میں سے بعض کو مقدم اور بعض کو موخر قرار دیتی ہے اور جس کی وجہ سے ہم عمرانی اور اخلاقی مقاصد کو اپنی فوری اور نفسانی خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں - جب ہم میں شعوری طور پر انتخاب اور ترجیح کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے تو ہم اپنی رہنمائی کا فرض خود ادا کرسکتے ہیں - فورسٹر نے جرمن فوج کو مخاطب کرکے جو الفاظ کہے تھے وہ تعلیم کے اس مسئلہ پر بھی عائد ہوتے ہیں :—

" انسان کی قوت ارادی کی تربیت اور اس کی تہذیب و تنظیم میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب اس کا فرض ہوتا ہے کہ سستی اور بے دلی کے ساتھہ کام کرنے کی عادت چھوڑ

دے اور اپنی ذاتی اور مزاجی کیفیتوں کو کسی بڑے
اجتماعی مقصد کا تابع بنادے" [۱]

حقیقت یہ ہے کہ انسان میں قوت ارادی کی صحیح نشو و نما اور ضبط نفس کا پیدا ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اس کی زندگی کسی بڑے مقصد کے ساتھ وابستہ ہوجائے اور وہ اپنی ذات کو اس کی تحصیل و تکمیل میں محو کردے - ناکام زندگی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کا کوئی مرکز ' کوئی معین اور واضح مقصد نہیں ہوتا جس میں وہ دل و جان سے مشغول رہے ' جو اس کی قوتوں کو تضیع و انتشار سے محفوظ رکھے - ہر معمولی سی تحریص ہر مزاجی کیفیت اس کو ایک راہ سے ہٹاکر دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے - دنیا میں جو لوگ کسی شعبہ زندگی میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ان سب میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کسی ایک مقصد کے ماتحت مرتب اور مجتمع کرلیتے ہیں اور اس مقصد میں اس درجہ محو ہو جاتے ہیں کہ جو چیز ' جو بات ' جو کام اس راہ سے ہٹا ہوا ہو وہ اُنھیں تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے - ان کوتحریصوں سے یا غیر متعلق مشاغل سے ' بچانے کے لئے کسی سزا یا بیرونی دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ فلاں کام اس لئے برا ہے کہ ان کے مقصد اعلیٰ میں حارج ہوتا ہے - اس وقت ان میں ضبط نفس کی شان پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنی تمام حرکات ' افعال ' کردار میں وہ نظم اور ترتیب قائم کرلیتے ہیں جس کے بغیر نہ قوت عمل پیدا ہوسکتی ہے نہ کامیابی حاصل ہوسکتی

Pinkaviteh : The new education in the Soviet Republic [۱]
صفحہ ۴۵ -

ہے - شخصیت کی قدرتی نشو و نما کے دوران میں اس قسم کے کسی مقصد کا تعین تربیت انسانی کا سب سے اہم عنصر ہے اور اس میں معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ طلبا کے مقاصد کو پست سے بلند اور بلند سے بلند تر کرے اور ان کو اخلاقی اور عمرانی اقدار سے ہم آہنگ بنائے - کیونکہ محض قوت عمل ' اور ضبط نفس اور کارکردگی کی صفت تو ہر اس شخص میں پیدا ہوسکتی ہے جو کسی ایک مقصد کو اپنا مطمح نظر بناکر اس کے لئے کوشش کرے خواہ وہ مقصد اچھا ہو یا برا ' معاشری مفاد کے موافق ہو یا مخالف - چنانچہ وہ لوگ جن کو کسی خیال میں اتنا انہماک ہوجاتا ہے کہ وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے ' اس خیال کی خاطر اپنی ذاتی تکلیفوں کی پرواہ نہیں کرتے اور بعض اوقات فرہاد کی طرح وہ کام کر دکھاتے ہیں جو انسانی قوت سے بالا تر معلوم ہوتا ہے - تاریخ اور افسانے دونوں میں اس قسم کی ہزارہا مثالیں موجود ہیں - لیکن یہ لوگ نہ اپنے آپ کو کوئی مستقل فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ دوسروں کو - ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر نوجوان کے پیش نظر زندگی کا کوئی ایسا مقصد ہو جو اس کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے موزوں اور معاشری مفاد اور بہبود کے لحاظ سے قابل قدر ہو تاکہ وہ اس میں منہمک ہوکر ایک طرف تو اپنی شخصیت کی تکمیل کرسکے ' اپنے آپ کو اپنے کام میں کھوکر پاسکے کہ یہی "معرفت نفس" کا واحد ذریعہ ہے ' اور دوسری طرف وہ شخصی اغراض کے تنگ دائرے سے نکل کر اپنی ذات کو وسیع تر عمرانی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرے - جب اِنسان کی نظر میں اس قدر وسعت اور رسائی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ اپنے محدود ذاتی مقاصد کا رشتہ دائمی اور ابدی مقاصد کے ساتھ جوڑ لیتا ہے جن کی تکمیل میں کائنات کی ساری قوتیں مصروف

ہیں اور اِس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت کے سارے کارخانے میں ایک عظیم‌الشان ارتقا پذیر مقصد کی کارفرمائی ہے جس میں اسے بھی اپنی استطاعت کے مطابق شرکت کرنی چاہئیے تو ''ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا'' کی منزل آجاتی ہے جہاں مذہبیت کی سچی روح اپنا جلوہ دکھاتی ہے ' انسان اخلاق اور انسانیت کے درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے - اسے انفرادی اور معاشری اغراض و حقوق کی جنگ ' خارجی سزاؤں کا خوف اور خارجی جزاؤں کا لالچ بالکل بے معنی اور حقیر معلوم ہوتا ہے اور وہ برائیوں اور ''گناہوں'' سے اس لئے نہیں بچتا کہ وہ ''ممنوع'' ہیں یا اُن کے کرنے میں سزا کا خوف ہے ' بلکہ اس لئے کہ ان میں پڑنا اس کے نزدیک تضیع اوقات ہے ' اس کی اعلیٰ خدا داد قوتوں کی توہین ہے - وہ اپنے دل میں کہتا ہے :---

تو باز ساعد شاهی به استخوان مذگر
همائے همت خود را بلند ده پرواز

اس بحث کا نتیجہ معلم کے لئے یہ نکلتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے شاگردوں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس کرے اور ان میں ایک ایسا معیار اقدار قائم کردے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کی تدریجی تنظیم کرسکیں - ان کی طبیعت میں اعتدال اور سلامت روی کے قائم رکھنے کے لئے سزا اور انعام کی ضرورت نہ ہو - بلکہ اس کے بجائے ان کے دل میں اپنے پسندیدہ مقاصد کا اس قدر احترام پیدا ہوجائے کہ یہی مقاصد ان کے اخلاقی معلم اور نگراں بن جائیں اور ان کو غلط راستوں پر پڑنے سے روکیں - اگر کبھی مجبوراً استادوں کو یا والدین کو خود اپنے ہاتھ سے

سزا دینی بھی پڑے تو اُنہیں یہ چاہئے کہ بچے کے ذہن میں سزا اور قابل اعتراض کام کے درمیان بلا واسطہ اور فوری تعلق قائم کرلیں تاکہ جب کبھی اسے اس کام کرنے کی دوبارہ تحریص ہو تو اس کے ناگوار نتائج کا خیال دل میں فوراً تازہ ہوجائے اور وہ اس سے باز رہے - اچھے معلم کی پہچان یہ ہے کہ وہ سزا کو ذاتی ناراضگی کے اظہار کے طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کو معاشری قانون اور اجتماعی مرضی کا نتیجہ بناکر دکھاتا ہے اور اس طرح ایک، فرد کے بجائے پورا معاشرہ ضبط و تادیب کا نافذ کرنے والا بن جاتا ہے - لیکن اس کا مطمح نظر ہمیشہ یہی ہونا چاہئے کہ بچوں کے عمل کے محرک اعلیٰ ترین مقاصد ہوں اور ان کے حصول کا خیال ان کے اخلاق و کردار کی رہنمائی کرے -

جس طرح مدرسوں میں سزاؤں کا استعمال حد سے زیادہ اور غلط طریقے پر کیا جاتا ہے اور اسی طرح انعاموں کا جائز استعمال بھی اُستادوں کو معلوم نہیں - طلبہ کا جذبہ مسابقت کو اُبھارنے اور اُنھیں اپنے کام سے ایک قسم کی بالواسطہ دل چسپی دلانے کے لئے اُنھیں مختلف قسم کے انعامات ، زیادہ تر مادی انعامات ، دئے جاتے ہیں جن کو وہ بجائے خود باعث امتیاز سمجھتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس مصنوعی امتیاز کے حاصل کرنے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دیتے ہیں کسب کمال کی خواہش بنفسہ ان کے دل کو نہیں لگتی - یہ صورت حال ان کی اخلاقی تربیت پر بہت برا اثر ڈالتی ہے کیونکہ ان کی توجہ ضمنی اور غیر ضروری چیزوں میں پڑکر منتشر ہو جاتی ہے اور ان میں اور ان کے کام میں وہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے - جب مدرسے میں یہ عادت راسخ ہو جاتی ہے کہ بغیر کسی مادی لالچ کے ، کسی انعام کی توقع کے پوری محنت اور انہماک سے

کام نہ کیا جائے ' تو طالب علم عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی اسی چیز کو مد نظر رکھتا ہے اور چونکہ موجودہ تمدن میں تقریباً ہر چیز کی قدر کا اندازہ دولت یا نمود اور شہرت کے معیار پر کیا جاتا ہے ' اس لئے وہ ہر کام کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ اس میں مجھے کتنا مالی نفع ہو گا اور کس قدر شہرت حاصل ہوگی - اور اُن کاموں کو کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جن میں خاموشی ' نفس کشی اور بے غرضی کے ساتھہ خدمت کرنے کی ضرورت ہے - یہی وجہ ہے (یا کم سے کم یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے) کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو ایثار اور خاموشی کے ساتھہ قومی خدمت کریں اور ایسے لوگ بہت ہیں جو نام پیدا کرنے کیلئے شور و غل مچاکر یا کسی نمائشی تحریک میں شریک ہوکر بہت جلد " لیڈر " بن جانے کی کوشش کرتے ہیں - اس خرابی کی اصلاح کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ مدرسوں میں انعام کا استعمال اور اسکی نوعیت بدل دی جائے اور معلم بھی اس معاملے میں اپنا طرز عمل بالکل تبدیل کردیں - موجودہ حالات میں بیچارے معلم کا کام ہی یہ ہے کہ یا تو طلبہ کے قصوروں اور خطاؤں کی تلاش میں رہے اور انہیں سزا دے یا ان کی پست ہمت کو اُبھارنے اور انہیں تعلیمی مشاغل میں زبر دستی دل چسپی دلانے کے لئے انعام کا یا نمبر حاصل کرنے کا لالچ دے - جب بچے کو مدرسے میں آئے دن یہی تجربہ ہوتا ہے تو وہ بھی اپنے افعال و کردار کی قدر کا اندازہ اس معیار پر نہیں کرتا کہ وہ بذاتہ اچھے ہیں یا نہیں بلکہ سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے کام کرتا ہے اور اسے ہمیشہ دوسروں پر سبقت لیجانے کی فکر رہتی ہے - اس طرح معلم غیر محسوس طریقہ پر طلبہ کے معیار قدر کو بہت پست کر دیتا ہے - پروفیسر پنکے وچ (Pinkevitch) اپنی کتاب میں

لکھتے ھیں کہ روس میں جو تعلیم جدید انقلاب کے بعد سے رائج ھے اس میں ھر قسم کے "نشان امتیاز" کو ممنوع قرار دیا گیا ھے :—

" مختلف قسم کے نشان امتیار مثلاً گریڈ ' سرتیفیکت ' ڈگریاں وغیرہ دینے سے خراب قسم کی نمائش پسندی پیدا ھوتی ھے اور ان کی وجہ سے طلبہ محض انعام کی خاطر محنت کرتے ھیں اور انھیں اپنے کام میں قدرتی شغف اور انہماک پیدا نہیں ھوتا - اس لئے ھم نے ان سب کو بالکل موقوف کر دیا ھے - " [۱]

لیکن اس کے ساتھہ ھمیں یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ بعض انعامات ایسے بھی ھیں جو کسی طرح قابل اعتراض قرار نہیں دئے جا سکتے - اُستادوں کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار ' مہربانی کا سلوک ' ھمت افزائی جس سے طلبہ کو یہ معلوم ھو کہ وہ لوگ جن کی وہ قدر کرتے ھیں ' ان سے خوش ھیں - یہ سب چیزیں ایسی ھیں جن سے اس اطمینان و مسرت میں جو ادائے فرض سے نصیب ھوتی ھے ' اضافہ ھوجاتا ھے - لیکن بھر حال سزا کا خوف ' انعام کی تحریص ' معلم یا جماعت کی خوشنودی یہ تمام چیزیں صرف ذرائع کے طور بر استعمال کرنی چاھئیں - ان میں سے کسی کو بجائے خود مقصد بنا دینا اخلاقی نشو و نما کا خاتمہ کردینا ھے - سزا کا منشا محض اسی قدر ھے کہ وہ طالب علم کے ذھن میں برے کاموں اور اس کے برے نتائج کے درمیان ایک تلازم قائم کردے اور جب تک وہ شعوری طور پر ان سے احتراز کرنا نہ سیکھے ' ایک عارضی مانع کا کام دیتی رھے - اسی طرح انعام کا مقصد یہ ھونا چاھئے کہ طلبہ

---

[۱] The New Education in the Soviet Republic صفحہ ۳۲ -

کو محسوس ہو کہ جب وہ کوئي کام قابلیت، سے اور دل لگا کر کرتے ہیں تو سب لوگ اس کي قدر کرتے ہیں - مگر معلم کا منتہائے نظر ہمیشہ یہی ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ طالب علم تہدید و تحریص دونوں سے بالاتر اور بے نیاز ہوجائے اور اُسے اپنے کام میں اتنی دلچسپی پیدا ہو جائے کہ اس کی انجام دهي کے لئے اُسے کوئی رشوت نہ دینی پڑے - جب طالب علم بچپن کے حدود سے گزر کر بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور اس کے احساس خودي میں اُستحکام پیدا ہوتا ہے تو جسمانی سزائیں اور مادی انعامات دونوں خلاف مصلحت ہوجاتے ہیں اور ان کا استعمال نفسیات کي تعلیم کے سرا سر منافی ہے - اس وقت معلم کو طلبہ پر اپنی شخصیت کا اُثر ڈالنا چاہئے اور ان کے ساتھہ دوستي اور باہمی اعتماد کے تعلقات پیدا کر کے انہیں بہتر اور بلند تر قدروں سے روشناس کرنا چاہئے -

باب پنجم

معلم کی شخصیت

ہم نے اب تک اخلاقی تربیت کے جن ذرائع سے بحث کی ہے ان سب میں معلم کی شخصیت کی اہمیت اور اس کے اثر کا اعتراف کرنا پڑا ہے - نصاب کی ترتیب اور اس کو معاشری ضروریات کے ساتھہ ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ معلم کو فطرت اطفال اور نظام تمدن دونوں سے واقفیت ہو ' وہ ذہین ہو اور معاشری احساس رکھتا ہو - اس کے بعد نصاب کو طلبہ کے سامنے پیش کرنے کا اور اس کو ان کی زندگی کا جز و بنانے کا مسئلہ آتا ہے ' جو طریقۂ تعلیم سے متعلق ہے ' اور اس کا انحصار تمام تر معلم کی ذات پر ہے - گو موجودہ نظریہ تعلیم کے مطابق ہمارا مقصد اعلیٰ یہی ہے کہ طلبہ میں خود کام کرنے اور اپنی مشکلات آپ حل کرنے کی قابلیت پیدا ہو ' لیکن یہ مقصد بغیر معلم کی رہنمائی اور امداد کے حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہی مدرسے کے ماحول کو اس طرح منظم کرتا ہے اور اس میں ایسے محرکات عمل فراہم کرتا ہے کہ بچوں میں اعتماد ذات ' محنت اور حوصلے کی صفات ابھر آتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں تادیب و ضبط کے نظام کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی انجام کار اس پر عائد ہوتی ہے - یہاں بھی ہمارا منتہائے نظر یہی ہے کہ ہم طلبہ میں حکومت خود اختیاری قائم کریں اور مدرسے کی معاشری زندگی اور اس کے فرائض کی تنظیم کی ذمہ داری انہیں پر ڈال دیں - لیکن یہ حالت خود بخود پیدا نہیں ہوجاتی - اس کے لئے معلم کو ابتدا میں بہت غور اور کاوش اور

تدبیر کی ضرورت ھے اور اس کے قائم ھوجانے کے بعد بھی اسے ھمیشہ بڑی احتیاط اور ھوشیاری سے کام لینا پڑتا ھے - کیونکہ نہ معلوم کس وقت اس مشین میں کوئی ایسی خرابی یا رکاوٹ پیدا ھوجائے جس کو طلبہ خود دور نہ کرسکیں اور اس کی دوستانہ امداد اور مشورے یا مداخلت کے محتاج ھوں - لہذا موجودہ تعلیمی خیالات کی رو سے معلم کو نظام تعلیم میں بہت بڑی اھمیت حاصل ھے - اگرچہ اسے پہلے کی طرح طلبہ کے بجائے خود کام کرنا نہیں پڑتا اور وہ مطالعہ اور محنت کی ذمہ داري حتی‌الامکان انہیں پر ڈالتا ھے لیکن اس کی تعلیمی ' معاشری اور اخلاقی ذمہ داریاں پہلے سے زیادہ اھم اور نازک ھوگئی ھیں اور زیادہ متنوع صفات اور صلاحیتوں کی طالب ھیں - موجودہ بحث کو مکمل کرنے کے لئے یہاں یہ بتانا ضروری ھے کہ علاوہ نصاب اور طریقہ تعلیم وغیرہ کی تنظیم کرنے کے معلم بحیثیت ایک انسان کے اپنے طلبہ کی اخلاقي تربیت میں کس طرح حصہ لے سکتا ھے -

معلم کے پیشے کی ایک خصوصیت ایسی ھے جو اسے تقریباً اور تمام پیشوں سے ممتاز کرتی ھے - اسے اپنے طلبہ کے دل و دماغ اور روح سے براہ راست سابقہ پڑتا ھے اور ان پر اس کی شخصیت ' اس کے فلسفۂ زندگی اس کے طرز عمل کا اثر بلا واسطہ ھوتا ھے - اس کا تعلق بچوں کی زندگی کے کسي خاص پہلو سے نہیں بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں سے ھے اور وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی مجموعي سیرت کو متاثر کرتا رھتا ھے - اگر کسی ڈاکٹر یا انجینیر یا معمار کو اپنے کام کے موضوع سے محبت نہ ھو اور وہ اس کی انجام دھي میں مروت اور ھمدردی کا اظہار نہ کرے تو اس نقص کی وجہ سے اس کے کام میں کچھہ ایسی خرابی واقع نہیں ھوگی - بے شک یہ

صفات بجائے خود ہر شخص کے لئے مفید ہیں خواہ اس کا کوئی پیشہ ہو اور اسے انسانی فرائض کی ادائگی میں ہمیشہ ان کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن ان کے نہ ہونے میں جو کچھ برائی ہے خود اس کی ذات کے لئے ہے اس کے کام یا فن کے لئے نہیں - بہ خلاف اس کے معلم کو ذي روح افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو اپنے ماحول کے اثرات کو ہر وقت قبول کرتے رہتے ہیں - اور اس ماحول میں معلم کی ذات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے - کیونکہ ایک تو معاشرہ خود اسے طلبہ کے مقابلے میں بر تر حیثیت دیتا ہے اور اسے ان کی نظر میں بہت عزت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے - دوسرے زیادہ قابل ' زیادہ تجربہ کار اور پختہ‌کار ہونے کی وجہ سے معلم ان پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے اور اس قوت سے کام لے سکتا ہے جو نفسیات کی اصطلاح میں " تاثیر تفوق " [۱] کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے -

ہم عہد شباب کی بعض خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے یہ بتا چکے ہیں کہ نوجوانوں کو تحکم اور دباؤ بہت ناگوار ہوتا ہے - اور اگر کوئی شخص ان سے کوئی کام کرانا چاہے تو فوراً اس کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں - لیکن اس عمر میں وہ شخصیت کے قدرتی اثر کو بہت جلد اور بڑی خوشي سے قبول کرتے ہیں - اگر انہیں اس بات کا یقین ہوجائے کہ کوئی شخص ان پر کسی لحاظ سے مثلاً قابلیت یا تہذیب یا مرتبے میں فوقیت رکھتا ہے اور اسے ان کے ساتھہ محبت اور ہمدردی بھی ہے تو وہ عقیدت اور وفاداری کے ساتھہ اس کی پیروي کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں - یہی زمانہ ہے جب وہ اپنی تاثیر تفوق سے پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اگر اس میں تسخیر اور تالیف قلوب کا

---

[1] Prestige Suggestion -

اتنا مادہ ہے کہ طلبہ اسے اپنا لیڈر مانیں اور اس کی ہمدردی اور نیک نیتی کے معترف ہوں تو مدرسے کے انتظامی معاملات اور ضبط و تادیب کے مسائل بہت کچھہ حل ہوجاتے ہیں کیونکہ جب وہ اس کو اپنی جماعت کا سر گروہ تسلیم کرلیتے ہیں تو اس کی ناراضی ان کے لئے بہت بڑی سزا اور اس کی خوشنودی بہت بڑا انعام ہوجاتی ہے - اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اُستاد کو اپنے مزاج ' طرز عمل اور عادات کے معاملے میں ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے - کیونکہ اس کی تمام حرکات و سکنات ' اس کے اصول زندگی ' اس کا اخلاق سب اس کے شاگردوں کی طبیعت پر اثر ڈالتے رہتے ہیں - جس طرح یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ وہ نفسیات اطفال اور جدید تعلیمی تحریکوں کا مطالعہ کرے اور اپنے علم اور استعداد کو بڑھاتا رہے اس طرح اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو پاکیزہ اور مہذب بنائے ' اپنی شخصیت کی تربیت کرے اور اپنی ذات کو ان تمام خوبیوں کا زندہ نمونہ بناکر دکھائے جن کی وہ تلقین کرتا ہے - اس صورت میں طلبہ پر اس کا اخلاقی اثر بہت قوی اور دیر پا ہوگا - البتہ اس میں یہ احتیاط شرط ہے کہ اس کی اپنی شخصیت طلبہ پر اس درجہ غالب نہ آجائے کہ وہ ان کے ارتقائے نفس میں حارج ہو - کیونکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اکثر والدین اور اُستاد جن کی طبیعت میں ' تحکم اور تسلط کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے بچوں کو زبردستی اپنے عقائد اور خیالات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور انہیں آزادانہ نشو و نما کا موقع نہیں دیتے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے اکثر طبیعت اور ارادے کے کمزور ' اور ہمت اور حوصلے سے عاری ہوتے ہیں وہ ہر بات میں اپنے بزرگوں کے محتاج رہتے ہیں اور اپنی قوتوں سے کام لینا نہیں سیکھتے

ان کی مثال، اُن چھوٹے چھوٹے کمزور پودوں کی سی ہے جو کسی بڑے درخت کے نیچے اُگتے ہیں اور بڑھنے نہیں پاتے - اس شرط کے ساتھ ہم معلم کے ذاتی اثر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کرینگے کہ یہ کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے -

معلم کئی طرح سے طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالتا ہے - ان میں بچپن کے زمانے میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے دوستوں ' بزرگوں ' ہم جماعتوں غرض ان سب لوگوں کی جن سے ان کو سابقہ پڑتا ہے نقل اتارتے ہیں خصوصاً اپنے اُستادوں کی ہربات میں تقلید کرتے ہیں - ان کی بات چیت کا طریقہ ' ان کا لباس ' ان کی عادتیں غرض کوئی چیز اس تقلید کے اثر سے خالی نہیں رہتی - اُستادوں کو چاہئے کہ فطرت اطفال کی اس خصوصیت سے فائدہ اُٹھائیں اور اپنے ذاتی نمونے اور مثال کے ذریعے انہیں آداب مجلس ' تہذیب و شائستگی اور عمدہ معاشری عادات کی تعلیم دیں - کیونکہ سیر بھر عمل من بھر زبانی تعلیم کے برا بر ہے - خصوصاً ابتدائی چند سال میں زبانی تعلیم کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے - اس وقت عملی مثال ہی کار گر ہوسکتی ہے کیونکہ اکثر بچے بہت سی باتیں بغیر پوری طرح سمجھے ہوئے محض عضلات کی تقلیدی حرکت کے ذریعے سیکھ لیتے ہیں بچوں کی تربیت کی پہلی منزل یہی بلا واسطہ تقلید کی منزل ہے - اگر معلم کا اور گھر کے لوگوں کا ذاتی نمونہ اچھا ہے تو اس کے اثر سے بچوں میں بہت سی ایسی عادتیں پیدا ہوسکتی ہیں جو اگر اخلاق کا جز و نہیں تو اخلاقی سیرت کی تعمیر میں بنیاد کا کام ضرور دیتی ہیں - لوگوں کے ساتھ خلق و مدارات سے پیش آنا ' لڑائی جھگڑے سے دور رہنا ' ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کرنا ' اپنا کام محنت اور استقلال کے

ساتھہ انجام دینا ' وقت کي پابندي ' صفائی کا اهتمام یہ تمام صفات ایسي هیں جو تقلید اور مشق سے عادتوں میں تبدیل هوجاتي هیں - اگر مدرسے میں طلبہ اپنے اُستادوں اور ساتھیوں میں یہ عادتیں پائینگے تو وہ ان کی دیکھا دیکھی خود بھی ایساهی کرنے لگینگے - بیشک جب طالب علم سن شعور کو پہنچتا ھے تو اسے بہت سی عادات اور رسوم و روایات اور اصولوں کے عقلي وجوہ بتانے کی ضرورت هوتی ھے لیکن اوائل عمر میں تربیت کا ایک معقول حصہ تقلید کے ذریعے انجام پاسکتا ھے -

نفسیات کی اصطلاح میں تقلید سے مراد مشابہت پیدا کرنے کا وہ عمل ھے جس کا تعلق زیادہ تر جسمانی حرکات اور عادات سے هوتا ھے اور اس کے ذریعے بچہ بہت سے کام سیکھہ لیتا ھے جن کا اثر بالواسطہ اس کي طبیعت اور مزاج پر پڑتا ھے لیکن اس کے علاوہ دو نفسی کیفیتیں ایسی هیں جن کے ذریعے انسان براہ راست دوسروں کے خیالات اور جذبات سے متاثر هوتا ھے - یہ نفسیات کی اصلاح میں همدردي اور تاثیر خیال کہلاتی هیں - کسی شخص سے همدردي کا احساس همارے دل میں وهی جزبات پیدا کر دیتا ھے جو اس کے دل میں هوں - اس کی مثالیں هر وقت همارے مشاهدے میں آتي رهتی هیں کسی عزیز دوست کو ملول دیکھہ کر هم پر خود بھی رنج کی کیفیت طاري هوجاتی ھے " افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را " بشرطیکہ اهل انجمن کو افسردہ دل سے کچھہ همدردي بھی هو - اگر هم کسی خوش مزاج دوست کے پاس یا ایسے دوستوں کے حلقے میں چلے جائیں تو همارا غم غلط هو جاتا ھے اور طبیعت هلکی هوجاتی ھے - اسی لئے کہا گیا ھے کہ جذبات متعدي هوتے هیں اور گویا اُڑ کر ایک دوسرے کو لگ جاتے هیں -

اس سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے جذبات کا اثر خود بخود ہماری طبیعت پر ہوتا ہے اس کی ضرورت نہیں کہ ہم کوشش کر کے یا عقلی دلائل کے ذریعے اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کریں - معلم مدرسے میں اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر اور طلبہ کے ساتھہ محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کر کے ان کے جذبات کو متاثر کر سکتا ہے - اگر اس کے جذبات موقع کے مناسب ہونگے ' اگر وہ رنج و غم ' رضامندی اور ناراضی ' غصے اور رحم کا اظہار موزوں طریقے پر کریگا تو اس کے شاگرد اس سے ضرور متاثر ہونگے - لیکن شرط یہ ہے کہ جذبہ سچا اور خالص ہو ' تصنع اور مبالغے سے پاک ہو کیونکہ بچے بناوٹ اور ظاہر داری کو بہت جلد پہچان لیتے ہیں اور اس شخص کی طرف سے بدظن ہوجاتے ہیں جس کے جذبات میں خلوص اور قول اور فعل میں مناسبت نہ ہو - جذبات کی تربیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اچھے لوگوں سے عقیدت اور احترام پیدا کیا جائے - عمدہ چیزوں کی طرف رغبت اور خراب چیزوں سے نفرت دلائی جائے - بچوں میں یہ ذوق پیدا کر دیا جائے کہ خوبصورت اشیا اور مناظر ان کے دل کو لبھائیں اور بد صورت چیزیں بری معلوم ہوں - جذبۂ عقیدت اور حسن ذوق بچوں کے دل میں آسانی کے ساتھہ نشو و نما پاسکتا ہے اگر معلم کے اپنے جذبات سچے اور شائستہ ہوں اور اس کا مذاق پاکیزہ ہو ' کیونکہ بچے ان جذبات کو اکثر غیر شعوری طور پر قبول کرلیتے ہیں اور انسانوں کی جانب ان کا فطری رد عمل بھی وہی ہو جاتا ہے جو اُستاد کا ہے - معلم کا فرض یہ ہے کہ ان کا ہمدردی کا جذبہ اس قدر وسیع کر دے کہ وہ ان کے تمام ماحول پر محیط ہوجائے کیونکہ ہم حقیقی معنی میں کسی چیز یا شخص کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھہ

سکتے جب تک اس کے ساتھہ ہمیں اس درجہ ہمدردی نہ ہو کہ ہم گویا اس کے دل میں اُتر جائیں اور اس کے جذبات کو اپنا بنالیں ہم کسی خوبصورت نظم یا تصویر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اندر وہی کیفیت جو شاعر یا مصور کے دل میں تھی پیدا نہ کر لیں - کسی کے دکھہ درد کو پوری طرح محسوس نہیں کرسکتے جب تک ہمدردی کے وسیلے سے گویا وہی مصیبت خود ہم پر نہ گزر جائے -

چھوٹے بچوں کے مدرسے میں معلم کو اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ان کی محبت اور ہمدردی انسانوں تک محدود نہ رہے بلکہ انہیں بے زبان جانوروں اور پودوں سے بھی لگاؤ پیدا ہوجائے - مدارس جدید میں مختلف پالتو جانوروں کے پالنے کی تاکید کی جاتی ہے اور ان کی نگہداشت کی ذمہ داری بچوں پر ہوتی ہے - اسی طرح وہ باغ بانی کرتے ہیں ' اپنی اپنی کیاریوں میں پھولوں کے درخت اور ترکاریاں وغیرہ بوتے ہیں اور ان کی نشو و نما کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے سلسلے میں جن جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی پانی دینا ' کھاد ڈالنا ' کھدائی کرنا وہ خود ہی انجام دیتے ہیں اس کا مقصد محض یہی نہیں ہوتا کہ بچے پودوں اور جانوروں کی عادتوں کا مطالعہ کریں اور اس طرح مفید معلومات حاصل کریں بلکہ اس ذریعے سے وہ عالم نباتات اور عالم حیوانات سے مانوس ہوجاتے ہیں - بعض لوگ جن میں احساس جمال زیادہ لطیف اور نازک ہوتا ہے اور جن کو زندگی کی لہر نہ صرف حیوانات میں بلکہ تمام عالم فطرت میں نظر آتی ہے پھولوں اور پودوں اور قدرتی مناظر کو بھی اپنے آغوش محبت میں لے لیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ مثلاً بہت سے فطرت پرست شاعروں کو خوبصورت مناظر کے نظارے سے

دلی اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے اور اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں
ورڈزورتھ (Wordsworth) نے کہا ہے کہ :—

" ہرے بھرے جنگل کا ایک ذرا سا اثر ہمیں انسان اور
نیکی بدی کے متعلق ایسے حقائق سکھا سکتا ہے جو
دنیا کے تمام دانش مندوں سے ممکن نہیں " -

اسی طرح سعدی نے اہل نظر کو آگاہ کیا ہے کہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کرد گار

لیکن فطرت کی یہ سبق آموزی ہر شخص کے لئے عام نہیں - وہ انہیں کے لئے مخصوص ہے جن کے دلمیں ہمدردی کا اتھاہ سمندر موج زن ہے - ہر معلم کو بچوں میں یہی ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے - اس کے ساتھہ ساتھہ معلم کو اپنی ذاتی مثال اور مدرسے کی تعلیمی اور معاشری مشاغل کی تنظیم کے ذریعے طلبہ میں باہمی ہمدردی پیدا کرنی چاہئے جو اشتراک عمل اور امداد باہمی کی بنیاد ہے - اگر اس کے ساتھہ مدرسے اور بیرونی دنیا میں ربط اور تعلقات بھی قائم ہوں تو یہی ہمدردی وسیع تر انسانی ہمدردی کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ معلم خود بھی کوشش کرے کہ طلبہ کی ہمدردی میں وسعت پیدا کرے اور وہ کسی خاص جماعت یا طبقے تک محدود نہ رہے بلکہ انہیں یہ محسوس ہونے لگے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی غم زدہ انسان ہے وہ ہمارا دوست اور عزیز ہے - جہاں کہیں لوگ کسی عمدہ انسانی مقصد کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ ہمارے رفیق کار ہیں -

آج کل تمام تمدن ممالک میں تفریق و اختلاف کا بازار گرم ہے - خصوصاً مزدوروں اور سرمایا داروں میں بڑی سخت جنگ چھڑی ہوئی ہے اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی - اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہر قسم کے لوگوں کی ہمدردی کا دائرہ اس قدر محدود ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی جماعت کے اغراض و مقاصد کو سمجھہ سکتے ہیں اور ان سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن دوسری جماعتوں کے مقاصد کو نہیں سمجھہ سکتے - بعض دولت مندوں کو مزدوروں کے طبقے سے ایک قسم کی نظری ہمدردی ہے لیکن وہ بھی ان کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھتے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور اپنے انسانی حقوق کی حمائت کے لئے جنگ کر رہے ہیں - اس نفسی کیفیت اور کشمکش کا نقشہ بہت سے لوگوں نے اپنی علمی تصانیف اور افسانوں میں کھینچا ہے لیکن غالباً سب سے سچی اور جیتی جاگتی تصویر امریکہ کے مشہور افسانہ نویس اپٹن سنکلر (Upton Sinclaire) نے اپنے معرکۃالارا ناول Oil (تیل) میں دکھائی ہے - جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے اس کا کچھہ اندازہ پریم چند کے ناولوں چوگان ہستی اور گوشۂ عافیت کے مطالعے سے ہو سکتا ہے - اس صورت حال کی اصلاح اسی طرح ممکن ہے کہ مدرسوں کے تمام طلبہ میں عالم گیر اتحاد کا احساس ، مشترک انسانی اغراض کا احترام اور ہمدردی کا وسیع ترین جذبہ پیدا ہوجائے - اور جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچیں تو وہاں جرأت اور دیانت داری کے ساتھہ ان تمام نزاعی مسائل کا مطالعہ کریں جن کی وجہ سے مختلف جماعتوں میں آپس میں یہ جھگڑے پڑے ہوئے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مرکزوں میں آزادی کے ساتھہ بحث و مباحثہ کرنے کی ممانعت کرنا ، تعلیم کو فرسودہ

اور دور از کار معاملات اور مسائل تک محدود رکھنا اور تمام زندہ مسائل کي طرف سے بے اعتنائي برتنا ' یہ باتیں نہ صرف روح تعلیم کے منافي ھیں بلکہ ان کی وجہ سے ان بے انصافیوں اور زیادتیوں کے تدارک کي کوئي صورت پیدا نہیں ھوتی جو ھمارے معاشری اور سیاسی نظام میں رائج ھوگئي ھیں - بد قسمتی سے تقریباً دنیا کے تمام ملکوں میں اعلیٰ تعلیم پر یہي تنگ نظری اور قدامت پسندی حاوی ھے - جاپان اور اٹلی میں حکومت نے علی الاعلان ممانعت کردی ھے کہ " خطرناک خیالات " یونیورسٹی کي چار دیواري کے اندر داخل نہ ھونے پائیں - دوسرے ملکوں میں اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ پیچیدہ اور مصلحت آمیز طریقے اختیار کئے جاتے ھیں لیکن مطلب سب کا ایک ھی ھے اور وہ یہ کہ تعلیم گاھوں کے ذریعے ایسے خیالات کی اشاعت نہ ھونے پائے جو بعض زبردست اقتصادي اور سیاسی جماعتوں کے اغراض اور مفاد کے منافی ھوں - بقول حالی :—

بات سچي کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کي
سچ میں حالی کوئی رسوائي سی رسوائی ھے

یہ بحث بظاھر معلم اور اخلاقی تربیت کے عنوان سے بے تعلق معلوم ھوتي ھے لیکن واقعہ یہ ھے کہ ھم نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم پیش کیا ھے اس کے لحاظ سے یہ بات نہایت ضروری ھے کہ طلبہ میں وسیع ترین انسانی ھمدردی پیدا کي جائے اور اس مقصد کی راہ میں جو جہالت اور تنگ نظری اور خود غرضی حائل ھے اس کو دور کرکے دیانت داری اور جرات کے ساتھہ ان انسانی اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا جائے جو

موجودہ تمدن کی بنیاد ہیں - اگر معلم خود تنگ نظر اور قدامت پسند ہوگا اور ہر اہم معاملے پر بحث کرنے میں تامل کریگا یا بیرونی اثرات اس کی آزادی میں حائل ہونگے تو تربیت کا اہم ترین مقصد فوت ہوجائے گا -

ہمدردی سے ملتی جلتی دوسری نفسی کیفیت جس کی طرف ہم نے اوپر اِشارہ کیا ہے تاثیر خیال ہے - جس کی وجہ سے ہم میں وہ خیالات اور تصورات راہ پاتے ہیں جو اثر آفریں شخص کے ذہن میں ہوتے ہیں - یہاں بھی اس کی ضرورت نہیں کہ جو شخص دوسرے کے خیالات کا اثر قبول کرے وہ عقل کی رو سے بھی ان کا قائل ہوجائے - اثر آفریں شخص کا خلوص اور اس کے عقائد کی پختگی خود بخود ہمارے اندر ان خیالات کو پیدا کردیتی ہے - اس کی مثالیں ہی ہمیں ہر وقت اپنے چاروں طرف نظر آتی ہیں - اس کی ایک انتہائی صورت مسمریزم (Mesmerism) کے عمل میں پائی جاتی ہے جب معمول عارضی طور پر اپنی قوت اِرادی کو بالکل کھو بیٹھتا ہے اور عامل کے ہر خیال کو اپنا خیال سمجھہ لیتا ہے - بے شک یہ تاثیر خیال کی انتہائی شکل ہے لیکن اس کو خرق عادت نہیں سمجھنا چاہئے - یہ ایک ایسی نفسی کیفیت کی اِنتہائی ترقی یافتہ صورت ہے جو ہم میں سے ہر ایک پر بارہا طاری ہوتی ہے - ہم بالعموم ان لوگوں کی باتوں اور خیالات کو آسانی سے مان لیتے ہیں جو علم یا دولت یا قوت یا کسی اور حیثیت سے ہم پر فوقیت رکھتے ہیں - یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر بات اور ہر خیال کو اپنے خیال پر ترجیح دیں لیکن اس خاص علم یا فن یا شعبہ زندگی میں جہاں ہم ان کی فوقیت کے قائل ہیں ہم بعض اوقات اپنے ذاتی عقیدے اور رائے کے خلاف بھی ان کی رائے

پر عمل کرتے ہیں - البتہ جس شعبے میں ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ علم یا تجربہ یا مہارت رکھتے ہیں وہاں اُن کی رائے کو نظر انداز کرکے اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں - مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا عالم لباس یا خوراک یا تھیٹر کے متعلق ایک جاہل کی رائے کو صحیح سمجھ لیتا ہے بشرطیکہ اُس کو یہ خیال ہو کہ یہ شخص اِس خاص معاملے میں زیادہ واقفیت رکھتا ہے - لیکن اگر یہی شخص اُس عالم کے سامنے کسی علمی معاملے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے جو اُس کی رائے سے مختلف ہو تو وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا بلکہ اِس کا مضحکہ اُڑائے گا - یہ نفسی کیفیت نہ صرف افراد پر طاری ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ جماعتوں اور شہروں اور ملکوں پر طاری ہوجاتی ہے - اور اِس کی وجہ سے عجیب و غریب خبریں اور افواہیں مشہور ہوجاتی ہیں جنہیں لوگ بے سوچے سمجھے مان لیتے ہیں مثلاً بعض شہروں میں کبھی کبھی تین چار سال کے بعد یہ خبر اُڑ جاتی ہے کہ شہر میں "لال خورے" آئے ہوئے ہیں اور وہ بچوں کو پکڑ لیتے ہیں اور اُن کی "مومیائی" نکال کر لے جاتے ہیں - ہم نے دیکھا ہے کہ اچھے خاصے سمجھدار اور باخبر لوگ اُس بات کو یقین کر لیتے ہیں اور پریشان ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ پولیس جو تاثیر خیال کیا تخیل ہی سے محفوظ سمجھی جاتی ہے باقاعدہ تحقیقات شروع کر دیتی ہے - حالانکہ اُن لوگوں نے نہ کبھی "لال خوروں" کو دیکھا ہے نہ "مومیائی" کو؛ بلکہ اُن میں سے اکثر تو اِن الفاظ کے مفہوم سے بھی ناواقف ہیں - اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بالکل ناواقف اور خالی الذہن ہونے کی وجہ سے وہ اس قسم کی افواہ کو بغیر سوچے سمجھے بغیر تصدیق کئے قبول کرلیتے ہیں اور چونکہ یہ خبریں بہت جلد ایک سے دوسرے اور دوسرے

سے تیسرے شخص تک پہنچ جاتی هیں اِس لئے ان میں ذرا سی دیر میں وہ قوت اور زور پیدا هوجاتا هے جو بہت سے لوگوں کی هم خیالی کا نتیجہ هے - اِس طرح جماعت کی تاثیر خیال افراد کو متاثر کردیتی هے - اس کی ایک اور مشہور مثال وہ افواہ هے جو جنگ عظیم کے زمانے میں انگلستان کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ اسّی هزار روسی سپاهي آئے هیں تاکہ جرمنی کے خلاف انگریزوں کی مدد کریں [۱] اتنی بڑی تعداد کا دفعتاً ملک میں پہنچ جانا بالکل خلاف قیاس تھا - اس کے متعلق کوئی سرکاری اطلاع یا بیان شائع نہیں هوا تھا - لیکن ملک میں خوف اور پریشانی کا دور دورہ تھا - لوگ کسی ''غیبی امداد'' کے خواهاں تھے اور خواهش سے خیال کو قوت پہنچتی هے - یہ خبر خدا جانے کہاں سے اُٹھی اور آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی لوگوں کو اس کا اس درجہ یقین هوگیا کہ بہت سے معتبر اور ثقہ لوگوں نے یہ بیان دیا کہ هم نے اپني آنکھہ سے روسي فوج کے دستوں کو گذرتے هوئے دیکھا هے - اس مثال سے معلوم هوتا هے کہ بعض خاص حالتوں میں تاثیر خیال کا امکان بہت زیادہ هوجاتا هے اور اس کي قوت بڑہ جاتي هے - ماهرین نفسیات نے اِن حالات کا تجزیہ کیا هے جو تاثیر خیال کے لئے سازگار هوتے هیں - [۲] ان کی

---

[۱] اس واقعہ کا ذکر علاوہ اور لوگوں کے لنڈن یونیورسٹی کے پروفیسر تعلیمات ڈاکٹر نن (Nunn) نے اپنی کتاب Education—its Data and First Principles. میں کیا هے -

[۲] ''تاثیر خیال'' (Suggestion) کي نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ گذشتہ چند سال هی میں کیا گیا هے - خالص علمي اور اصطلاحی تصانیف سے قطع نظر کرکے اس کے نفسي پہلو کو فرانسیسی عالم لے بون (Le Bon) نے اپنی تصنیف "Psychology of the Crowd" میں اور تعلیمی پہلو کو پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے Suggestion in Education میں بہت اچھی طرح پیش کیا هے -

تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاثر خیال کا اظہار اس وقت بہت زیادہ ہوتا ہے جب ہم عامل یا اثر آفریں شخص کی علمیت یا قوت یا وجاہت کے قائل ہوں - اور کسی خاص معاملے میں ہماری یعنی معمول کی واقفیت اور علم یا تو بہت ناقص ہو یا اچھی طرح مربوط اور منظم نہ ہو اور ہم اس کو کسی نئے خیال کی تنقید کے لئے استعمال نہ کر سکیں - دوسرے یہ کہ اگر عامل اپنے عقیدے اور خیال میں پختگی کا اظہار کرے اور اس خاص معاملے میں اپنی رائے کو بہت وثوق کے ساتھہ ظاہر کرے تو ہم اسے بغیر عقلی تنقید اور غور و فکر کے تسلیم کرلینگے - اس اظہار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے خیال کو الفاظ میں بیان کرے - وہ اپنے عام انداز اور افعال سے بھی ایک خیال کو ظاہر کرسکتا ہے اور معمول پر اثر ڈال سکتا ہے - لیکن جن معاملات کے متعلق ہمارا اپنا علم یقینی اور باقاعدہ طور پر مرتب ہوتا ہے ان کے بارے میں ہم دوسروں کی تاثیر خیال سے متاثر نہیں ہوتے -

تاثیر خیال کے لئے ہم نے جن صورتوں کو ساز گار قرار دیا ہے وہ سب معلم اور شاگرد کے رشتے میں موجود ہیں - معلم عام طور پر جسمانی اور دماغی اعتبار سے اپنے شاگردوں پر فوقیت رکھتا ہے اور ان سے زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اس کی منصبی حیثیت کی وجہ سے انکے دل میں اس کی وقعت ہوتی ہے - برخلاف اسکے اکثر معاملات میں بچوں کی اپنی معلومات محدود ہوتی ہے اور اس طرح مربوط اور منظم نہیں ہوتی کہ ایک مدلل عقیدہ کی شکل اختیار کرلے اور وہ اس کی مدد سے ہر نئے خیال اور نئے عقیدے کی تنقید کرسکیں - اس حالت میں استاد اپنی تاثیر خیال کی صلاحیت کو بہت کامیابی کے ساتھہ استعمال کرسکتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اُستاد ایسا کریں گے تو طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ مختلف مسائل کے متعلق اپنی ذاتی رائے قائم نہیں کریں گے بلکہ محض انفعال طریقے پر اس کے خیالات کو قبول کرلیں گے - اس لئے ان لوگوں کے خیال میں استاد کو تاثیر خیال سے کام نہ لینا چاہئے - بیشک اگر کوئی معلم اس قوت کا ' یا اپنی کسی قوت کا بھی ' بےجا استعمال کرے اور اس سے طلبہ کی ذہنی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہو تو اس کا نتیجہ خراب ہوگا - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر معلم چاہے بھی تو اس تاثیر کو پوری طرح نہیں روک سکتا - جہاں کہیں لوگ مل جل کر رہتے ہیں ان کے خیالات اور عقائد ' ان کی رائے ' ان کے فلسفۂ زندگی کا اثر غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے پر پڑتا ہے خصوصاً جب اس جماعت میں مختلف عمر اور قابلیت اور تجربے کے لوگ ہوں - اس لئے سوال محض یہ رہ جاتا ہے کہ معلم اس اثر کو بغیر احتیاط اور انتظام کے طلبہ پر پڑنے دے یا اس بات کو محسوس کرکے کہ اس کی شخصیت تاثیر خیال کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کو متاثر کر رہی ہے - وہ اس سے فائدہ اُٹھائے اور اس اثر کو ان کی تربیت کا ایک مفید عنصر بنائے - پہلی صورت میں اُستاد کا اثر ممکن ہے اچھا پڑے ممکن ہے برا - اسے اس عمل پر قابو کیا اس کی طرف توجہ تک نہیں ہوگی - لیکن دوسری صورت میں اسے ہمیشہ یہ احساس رہے گا کہ اس کے خیالات و جذبات اسی کی ذات تک محدود نہیں بلکہ ان کا عکس طلبہ کی طبیعت میں جھلکتا ہے - جب وہ کسی بات کے متعلق خلوص کے ساتھ پسندیدگی یا نفرت یا جوش یا بددلی کا اظہار کرتا ہے تو یہ سب غیر محسوس طریقے پر اس سے متاثر ہوتے ہیں ' اس لئے اس کا فرض ہے

کہ ہر وقت اپنے خیالات ' اپنی رائے ' اپنے احساسات کا محاسبہ کرتا رہے تاکہ ان پر بالقصد اچھا اثر ڈالے - لہذا استاد کو یہ حق دینا چاہئے کہ وہ احتیاط کے ساتھہ اس قوت کا استعمال کرے اور اپنے بہتر علم ' وسیع اور پختہ تر خیالات کو طلبہ کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ ان سے شعوری استفادہ بھی حاصل کریں اور غیر شعوری طور پر بھی متاثر ہوں -

اسی صورت میں آزادی خیال میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہوگا بلکہ جس طرح ہر انسان اپنے ماحول کے مختلف اثرات سے مستفید ہوتا ہے اسی طرح طالب علم اپنے استاد کا اثر قبول کریگا - لیکن شرط یہ ہے کہ استاد ان خیالات کو جبر اور تحکم کے ساتھہ ان پر عائد نہ کرے کیونکہ اس کا اثر اکثر اوقات الٹا ہوتا ہے - طلبہ میں استاد کی مخالفت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ اس کی ہر تجویز ' ہر مشورے کے برعکس عمل کرتے ہیں - کیونکہ تاثیر خیال کے عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی خیال جبراً عائد نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ معمول کی طبیعت میں بہت آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر اثر کرتا ہے - اکثر استاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو ادعائی انداز سے اپنے شاگردوں کے سامنے نمونہ بناکر پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی تقلید کریں گے حالانکہ ان کے ادعا اور تحکم کی وجہ سے تاثیر خیال کی ساحرانہ کیفیت بالکل جاتی رہتی ہے -

ادب' تاریخ اور فنون لطیفہ کی تعلیم اور فلسفہ زندگی کی ترتیب میں استاد اس قابلیت سے بہت کام لے سکتا ہے کیونکہ ان چیزوں میں عقلی دلائل کی گنجائش کم اور ذاتی اثر ڈالنے کا موقع زیادہ ہوتا ہے - جب ادب کا معلم کسی عمدہ نظم کو پڑھہ کر جھومنے لگتا ہے یا

جوش و خروش کے ساتھہ کسی مستند ادیب کی تعریف کرتا ھے تو اس کے شاگردوں کے ادبی ذوق پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ھے - اسی طرح جب کوئی طالب علم یہ محسوس کرتا ھے کہ معلم کسی خاص تاریخی شخصیت کا بہت احترام کرتا ھے اور اس کا ذکر کرتے وقت اس کے انداز بیان ' اس کے چہرے بشرے ' غرض اس کی ھر ادا سے خلوص اور عقیدت کا اظہار ھوتا ھے تو وہ بھی خود بخود اس کا احترام کرنے لگتا ھے علاوہ اس درسی تعلیم کے معلم کا سب سے اھم اور مشکل فرض یہ ھے کہ اپنے شاگردوں کو زندگی کے صحیح اصولوں اور قدروں سے روشناس کرے - اس مقصد کے حصول میں زبانی تعلیم و تلقین کو بہت کم دخل ھے نفسی زندگی کی تشکیل اور فلسفہ حیات کی ترتیب میں سب سے زیادہ اثر عملی مثالوں کا ھوتا ھے خواہ وہ گذشتہ زمانوں کے مشاهیر کی ھوں جن سے طالب علم ادب اور تاریخ کے ذریعے روشناس ھوتا ھے یا اس کے اپنے بزرگوں اور استادوں اور دور حاضرہ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندہ مثالیں ھوں جن سے اس کو بالواسطہ یا بلا واسطہ سابقہ پڑتا ھے - وہ معلم جس کو اخلاقی اصولوں اور قدروں پر پختہ ایمان ھے ' جو اس ایمان کا محض زبانی اقرار نہیں کرتا بلکہ اپنے ھر چھوٹے سے چھوٹے کام میں ' ھر بات اور ھر خیال میں اس کا عملی اظہار کرتا ھے جس کی عادتیں ریاکاری اور تصنع سے پاک ھیں ' جو ھر کام کو محنت اور دیانت داری سے کرتا ھے ' جو ھر وقت دوسروں کے ساتھہ همدردی اور ان کی امداد کرنے کو تیار ھے ' ایسا معلم غیر محسوس طریقے پر اپنی زندہ مثال کے ذریعے طلبہ کو ایک بہتر اور بلند تر معیار زندگی سے آشنا کرتا ھے اور ان کی خراب عادتوں اور ادنی میلانات کو دور کر کے ایک اعلی اخلاقی سیرت کا مالک بنادیتا ھے -

اب ھم اس تمام تفصیل بحث کے نتائج پر مجموعی حیثیت سے نظر

ڈال کر یہ دیکھہ سکتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کے لئے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سب کو استعمال کرکے ہم کن مقاصد کو حاصل کرسکتے ہیں - ہم چاہتے ہیں کہ مدرسے کو اخلاقی تربیت کا گہوارہ بنائیں - اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے تمام عناصر کی نئے سرے سے تنظیم کریں - یہ عناصر کیا کیا ہیں ؟ اول مدرسے کی روز مرہ کی زندگی بحیثیت ایک معاشری ادارے کے - دوم ' طلبہ کے کام کرنے اور مطالعہ کرنے اور استادوں کے تعلیم دینے کے طریقے - سوم نصاب تعلیم - چہارم ' مدرسے کا نظام ضبط و تادیب اور اس کی عام فضا - پنجم ' معلموں کی جماعت - ہم ان سب سے اس طرح کام لینا چاہتے ہیں کہ طلبہ میں عمرانی معاملات کی سمجھہ ان کو انجام دینے کی قابلیت اور عمرانی اور اخلاقی مقاصد سے دلی لگاؤ پیدا ہو - ہم نے جو نقطۂ نظر مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کی رو سے مدرسے کو ایک حقیقی اخلاقی ماحول بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ایک معاشری جماعت میں تبدیل کردیا جائے جس میں انہیں اصولوں کی کارفرمائی ہو اور وہی طریقہ ہائے عمل مروج ہوں جو بہترین انسانی معاشروں میں پائے جاتے ہیں - اس قسم کے محرکات عمل مہیا کیے جائیں جو بہترین انسانی کاموں کا باعث ہوئے ہیں یعنی تجسس اور تعمیر کا شوق ' خدمت کا ولولہ ' تکمیل شخصیت اور اظہار خودی کی خواہش وغیرہ اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ نصاب کے مضامین کی ترتیب اور ان کا انتخاب اس لحاظ سے کیا جائے کہ طلبہ کو اس ماحول سے پوری طرح واقفیت پیدا ہو جس میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا ہے اور اپنے فرائض ادا کرنے ہیں - اس نصاب کی تعلیم میں یعنی اس تمام علمی مواد کو کتابوں اور استادوں کے دماغ سے منتقل کرکے طلبہ کے ذاتی تجربے اور علم کا حقیقی جزو

بنانے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ طلبہ کو عمل اور فعالیت کا موقع ملے ' ان کے تعمیر و تخلیق اور خدمت اور اظہار خودی کے رجحانات کی تسکین ہو ' انہیں مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑے اور وہ اعتماد ذات احساس اور ذمہ داری کے ساتھہ علم حاصل اور اس سے کام لینا سیکھیں - ان صفات اور عادات کو آئندہ معاشری زندگی میں کارآمد بنانے کے لئے مدرسے کی حکومت اور نظام ضبط و تادیب میں بھی اس کی اجتماعی روح کا اظہار ہونا چاهئے یعنی طلبہ کو موقع دینا چاهئے کہ وہ خود اپنے مشاغل کی تنظیم کریں ' اپنے معاشری معاملات کا فیصلہ کریں اور ان کو خوش اسلوبی کے ساتھہ چلانے کے لئے خود قوانین بنائیں اور جماعتی تاثیر اور تادیب کے ذریعے ان کی پابندی کرائیں - مطلب یہ ہے کہ مدرسے کے درسی اور معاشری مشاغل کی بنیاد یکساں اصولوں پر رکھی جائے تاکہ ایک طرف طلبہ میں تحصیل علم کے شغل میں ذمہ داری ' اجتہاد اور اعتماد نفس کی صفات پیدا ہوں اور دوسری طرف غیر درسی مشاغل کی ترتیب اور معاشری معاملات کی تنظیم میں بھی اُن صفات سے کام لے سکیں جو حرکت ' انقلاب اور جمہوریت کے اس دور میں انفرادی اور اجتماعی کامیابی کے لئے ضروری ہیں - تعلیم میں اس انقلاب عظیم کو پیدا کرنا معلموں کی جماعت کا کام ہے جو ایک طرف ان تمام وسائل کو استعمال کرکے طلبہ کے لئے ایک اخلاقی ماحول اور اخلاقی محرکات عمل مہیا کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے اثر سے ان میں براہ راست اخلاقی عادتیں اور اخلاقی اصولوں اور قوانین کا احترام پیدا کرتے ہیں - نو عمر بچے اور نوجوان ان کی مثال کی تقلید کرتے ہیں اور ہمدردی اور تاثیر خیال کی نفسی کیفیات کے ذریعے ان کی حرکات و سکنات اور ان کے جذبات اور خیالات کو اپنا لیتے ہیں اور اس

طرح آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں اُس فلسفہ زندگی اور معیار عمل کی روشنی سرایت کر جاتی ہے جو معلموں کی شخصیت میں کار فرما ہے بشرطیکہ معلم نے اس پیشے کو مجبور ہو کر اور بد دلی سے محض روزی کمانے کے خیال سے اختیار نہ کیا ہو بلکہ وہ خود کو معاشرے کا اخلاقی نمائندہ اور بہترین عمرانی اقدار کا حامل سمجھے اور انھیں اپنے شاگردوں تک منتقل کرنے کو اپنا فرض منصبی خیال کرے -

باب ششم

اِخلاقی سیرت کی تعمیر

ہم نے گذشتہ ابواب میں اخلاقی اور اخلاق تربیت کے مفہوم سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مدرسے میں کون کون سے وسائل ایسے ہیں جو اخلاقی تربیت کے لئے اِستعمال ہوسکتے ہیں - اس باب میں ہم اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ہم اپنی تربیت کے ذریعے افراد میں کیا صفات اور خصوصیات پیدا کرنا چاہتے ہیں - ضمناً ان صفات کا ذکر گذشتہ بحثوں میں آچکا ہے اور ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں یہ بتایا ہے کہ جمہوری معاشرے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کس قسم کی سیرت کی ضرورت ہے - یہاں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھہ ان اہم ترین انسانی خصائص سے بحث کرنا چاہتے ہیں - جس کا کسی نہ کسی حد تک اخلاقی سیرت میں شامل ہونا ضروری ہے - ان کی تشریح میں ہمیں اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا یعنی ارتقائے نفس کے اعتبار سے کن صفات کی نشو و نما ضروری ہے اور معاشری اور تمدنی حالات ' بالخصوص اپنے ملک کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان صفات کی تربیت کس تناسب سے کرنی چاہئے اور ان کی اضافی قدر و قیمت کیا ہونی چاہئے - ہمیں اپنے ذہن میں دوبارہ اس نفسی حقیقت کو تازہ کرلینا چاہئے کہ انسان کی سیرت ' اس کے اعمال و کردار سب ان جبلی رجحانوں پر منحصر ہیں جو اس کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں - انسان کا نفسی ارتقاء ایک مسلسل عمل

ھے جو ابتدائی ، غیر مربوط حرکات اور فطری جبلتوں کے سادہ اظہار سے شروع ھوکر رفتہ رفتہ ماحول کے مختلف اثرات کے ماتحت عادتوں اور طبیعت کی خصوصیتوں کی شکل اختیار کرلیتا ھے - ھمارے تمام اخلاقی اصول ، ھماری عقل اور ھمارا علم اسی بنیاد پر قائم ھے - اسی لئے معلم کے واسطے جو ذھن اور سیرت کی تربیت کرنا چاھتا ھے یہ نہایت ضروری ھے کہ وہ ان نفسی رجحانات کا بغور مطالعہ کرے جو عمر کی مختلف منزلوں میں ظاھر ھوتے ھیں اور بچوں اور نوجوانوں کے مشاغل اور اعمال کے محرک ھوتے ھیں - اگر وہ ان کے تمام درسی اور غیر درسی مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرے گا کہ ان میں ان نفسی رجحانات کو اظہار کا موقع ملے اور ان میں ربط و ترتیب قائم ھو تو طلبہ جو کچھہ حاصل کریں گے ، خواہ اس کا تعلق علمی قابلیت سے ھو یا اخلاقی صفات اور عادات سے ، وہ ان کی شخصیت کا جز و ھوجائے گا کیونکہ ان کے مشاغل کی محرک خود ان کی ذات ھوگی - برخلاف اس کے اگر ھم مدرسے میں طلبہ کے فطری شوقوں اور رجحانوں کی طرف توجہ نہ کریں گے اور ان کو نظر انداز کرکے خارجی محرکات مثلاً استاد کا خوف یا انعام کے لالچ یا باھمی رشک و مسابقت کے جذبے سے کام لیں گے تو ان کی تعلیم محض سطحی ھوگی اور ان کے اعمال اور سیرت پر کوئی دیرپا اثر نہ ڈالیں گی - اس لئے علم النفس کا یہ تقاضہ ھے کہ معلم بہت غور سے بچوں کے آزادانہ افعال و مشاغل کا مطالعہ کرے کیونکہ ان کے جبلی رجحانات کا اظہار سب سے زیادہ خوبی اور وضاحت کے ساتھہ ان کے کھیل کود اور ان کے کاموں میں ھوتا ھے جنھیں وہ اپنی پسند سے کرتے ھیں - یہ مشاغل نفسیات کے نقطۂ نظر سے بجائے خود اتنی اھمیت نہیں رکھتے جتنی انہیں

" علامات " کے طور پر حاصل ہے اس لئے کہ ان کے معنی اور منشا پر غور کرنے سے طلبہ کی نفسی زندگی کے متعلق بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہے - معلم کو چاہئے کہ اس معلومات کی روشنی میں بچوں کے تعلیمی ماحول کو اس طرح منظم کرے کہ ان کے جبلی رجحانات پسندیدہ عادتوں میں تبدیل ہوجائیں اور عمدہ سیرت کی بنیاد بن جائیں - اسی جملے کے ان ابتدائی الفاظ کو ' بچوں کے ماحول کو اس طرح منظم کرے " ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے - کیونکہ موجودہ نظریہ تعلیم کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم براہ راست اپنے عقائد اور جذبات اور معلومات بچوں میں منتقل نہیں کرسکتے اور نہ ان میں بلا واسطہ وہ عادات اور صفات پیدا کرسکتے ہیں جو معاشری زندگی کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہیں - ان عادات و صفات کی تعلیم میں ماحول کی وساطت لازم ہے یعنی تعلیم پانے والوں کے لئے ایسے حالات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جن کی مدد سے وہ عملی طور پر ان معلومات اور صفات کو حاصل کرسکیں - اسی وجہ سے ہم نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ اخلاقی تربیت میں لفظی اور زبانی تعلیم کے بجائے ایسے حالات اور مواقع پیدا کئے جائیں باالفاظ دیگر ایسا ماحول مقرر کیا جائے جس میں زندگی بسر کرنے سے اخلاقی سیرت کی تعمیر ہوسکے - اس امر پر ہم کتاب کے ابتدائی حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کرچکے ہیں - اب ہم اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر و تکمیل میں ہمیں کن صفات کو شعوری طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور اپنی بحث کی بنیاد زمانہ حال کے دو جید مفکرین پروفیسر ڈیوئی اور برٹرنڈر سل پر رکھتے ہیں -

پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی جزا قرار دئے ھیں [۱] :—

اول قوت عمل یا کار کردگی کی صلاحیت - ہم اکثر گفتگو میں کہتے ھیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ھے یا بہت پختہ ھے - اس سے ھماری یہ مراد ھوتی ھے کہ اس میں یہ قابلیت ھے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاھتا ھے تو اس کے انجام دینے میں استقلال ' محنت ' جرات اور حوصلے سے کام لیتا ھے - یہ فعالی صفات ھیں جو بحیثیت مجموعی ھماری سیرت کے اس رخ کو ظاھر کرتی ھیں جو ھمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ھے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کرکے آخرکار کامیابی کی منزل پر پہنچاتا ھے - ظاھر ھے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ھوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل میں نہیں لاسکتا ' عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ھیں یا برے - ھر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حائل ھوتی ھے جس میں انسان کو کاوش اور جد و جہد سے کام لینا پڑتا ھے ' وسائل کی تنظیم کرکے اور مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لاکر اپنے ماحول کو اپنا مدد گار بنانا پڑتا ھے - جو شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لیکر زندگی کے سفر پر روانہ ھوتا ھے اس کا خدا ھی حافظ ھے - ھم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کرسکتے ھیں لیکن ھمیں یہ توقع نہیں ھوتی کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ جائےگا - اس صورت حال کی ایک بہت عمدہ مثال تالستائے (Tolstoy) کے ایک مشہور افسانے میں ملتی ھے جس کو رسل (Russel)

---

[۱] اس کی تفصیلی بحث انہوں نے Democracy and Education میں اور مختصر بحث School and Society میں کی ھے -

نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے - وہ ایک روسی خاتون کا قصہ بیان کرتا ہے جس نے تھیٹر میں ایک نہایت اَلمناک ڈراما دیکھا تھا - دسمبر کا زمانہ تھا اور آدھی رات کا وقت - کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی - یہ خاتون اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوئی - ڈراما کو دیکھکر وہ اسقدر متاثر ہوئی تھی اور اس پر اس درجہ رقت طاری تھی کہ وہ راستے بھر قصے کے ہیرو کی خیالی مصیبتوں کو یاد کرکے روتی رہی - لیکن نہ اس میں اتنا تخیل تھا نہ قوت عمل کہ اپنے اس گاڑی بان کا خیال کرتی جو سردی میں باہر بیٹھا ہوا گاڑی چلا رہا تھا اور گھر تک پہنچنے سے پہلے ٹھٹھر کر مرگیا - اس کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک کاموں کے لئے محض نیک دلی اور رقت قلب نہیں بلکہ تخیل کی وسعت ' حالات سے واقفیت اور عمل کی صلاحیت بھی درکار ہے تا کہ جذبات کو عمل کا جامہ پہنایا جائے یہ صفات سب لوگوں میں یکساں نہیں ہوتیں - کسی میں زیادہ ہوتی ہیں کسی میں کم - لیکن ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھہ کرکے دکھائے ' کسی طرح اپنے عمل کا سکہ اپنے ماحول پر جمائے - یہ وہی خواہش ہے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر و تخریب میں ظاہر ہوتی ہے - اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو سمجھنا ' اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں ' اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچہ میں مفید عادتیں پیدا ہوں' یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے -

لیکن یہ ظاہر ہے کہ محض قوت عمل حسن سیرت کی ضامن نہیں ہوسکتی کیونکہ قوت ایک وسیلہ ہے جو اچھے برے دونوں طرح کے مقاصد کے لئے استعمال ہوسکتا ہے - ہمیں بے شمار مثالیں ایسی ملتی

هیں جن میں افراد اور جماعتوں نے اپنی قوت کو ایسے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے جو معاشری مفاد کے خلاف تھے اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں - اس لئے قوت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھہ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشری نقطہ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو - اس کے لئے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ اور ذکاوت احساس -

انسانی سیرت کا عقلی یا ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے - یہ قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے - جب ہمارا علم مربوط اور منظم ہو ' جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے ' تکمیل مقاصد میں مدد دے ' جب اس کی بدولت ہم میں معاملات کی سمجھہ ' احساس تناسب ' موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہوجائے اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک مثال سے ہوسکتی ہے - ایک طالب علم تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے ' اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے حالات پڑھتا ہے اور اس کے ذریعے بہت سی معلومات حاصل کرتا ہے - اگر اس کا نتیجہ محض یہ ہو کہ اسے بہت سے نام اور تاریخی واقعات یاد ہو جائیں جن کو وہ مثلاً امتحان کے وقت بیان کرسکے تو اس کی معلومات بے جان رہے گی اور اس سے اس کی قوت فیصلہ کی تربیت میں مدد نہ ملے گی - بر خلاف اس کے اگر تاریخ کے مطالعے سے اس میں انسانی معاشرے کی ارتقاء کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے اگر وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرے کہ موجودہ تمدن نے کس طرح رفتہ رفتہ ابتدائی مدارج سے ترقی کی ہے اور اس میں انسانوں کی

متحدہ کوششوں کو کس درجہ دخل ھے ' اگر وہ اس علم کو اپنے عہد کی زندگی کے سمجھنے اور اس کے فرائض کو ادا کرنے میں استعمال کرسکے تو ھم یہ کہیں گے کہ اس میں تاریخ کے مطالعے سے قوت فیصلہ پیدا ھوگئی ھے یعنی اب وہ تاریخی واقفیت کو مدنی مسائل اور انسانی معاملات کا فیصلہ کرنے میں استعمال کرسکتا ھے - یہی حال اور تمام علوم کا ھے - جب ان کے مطالعے سے انسان کے طرز عمل پر اثر پڑتا ھے اور اس میں معاملہ فہمی کا مادہ پیدا ھو جاتا ھے تو وہ اس کی عقل اور قوت فیصلہ کی تربیت میں معین ھوئے ھیں - لہذا اس قوت کی نشو و نما میں صرف نصاب تعلیم کی اصلاح کو دخل ھے بلکہ اس کا انحصار بڑی حد تک طریقہ تعلیم و تحصیل پر بھی ھے -

تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ھے جذبات سے تعلق رکھتی ھے - اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ھوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ھو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا - لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھہ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ھیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ھوتی ھے اس لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ھوجاتے ھیں - تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاھوں کی مثالیں ملتی ھیں اور خود ھم میں سے ھر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ھے جن کو معاشری اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں ' جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ھوتے ھیں ' جنمیں روح انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی مطلق حس نہیں - وہ گڑھیا کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باھر نہیں نکل سکتے - موجودہ صنعت و حرفت کے تمدن میں ایسی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ھیں - اس کی ایک نہایت زبردست

مثال ' سنکلئر (Sinclaire) نے اپنے ناول [۱] میں جس کا اُوپر ذکر آچکا ھے ورنن روسکو (Vernon Roscoe, کی شخصیت میں دکھائی ھے جس کا مقصد حیات یہی تھا کہ وہ زمین سے مٹی کا تیل نکال کر اپنی دولت میں اضافہ کرے اور اس راستے میں جو رکاوٹیں حائل ھوں ان کو بلا تامل ھر امکانی ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کرے - اس مقصد کے حصول کی دھن میں اس کے نزدیک انصاف ' دیانتداری ' مروت ' انسانیت یہ سب محض بے معنی الفاظ تھے ' اور ظلم ' بیدردی ' رشوت ' بددیانتی ھر چیز جائز تھی - اگر اس کا کوئی نصب‌العین تھا تو محض یہ کہ اس کا کام نہایت خوبی اور انتظام کے ساتھہ چلتا رھے اور اس میں سے ھر قسم کے اسراف کو دور کردیا جائے - ظاھر ھے کہ اگر کسی جماعت میں تمام افراد ایسے ھی ھوں گے تو اس کا سارا کام بند ھو جائیگا - " ھر شخص کا ھاتھہ دوسروں کی مخالفت میں اُٹھا رھے گا " اور کسی شخص کو سوائے اپنی ذاتی اغراض کے کسی چیز سے دل چسپی نہ ھوگی - لہذا معلم کا ' اور مدرسے کی تعلیم کا ' مقصد یہ ھونا چاھئے کہ طلبہ کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ھو ' وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ھوں - جب انہیں کسی اھم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کي طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنے شخصی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں - ھر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اس کا رد عمل دوسروں پر کیا ھوگا ' اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ھوگی ' ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگے گی - جب انسان کے نفس میں ذکاوت احساس کی بدولت ھمدردي ' اور فراخ

---

[1] Oil -

دلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب‌العین اجتماعی نصب‌العین سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے - اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہوجاتی ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بےجا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری اُن مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو - انسانی ہمدردی کی وسعت اور گہرائی کے متعلق جو کچھہ کہا جا چکا ہے وہ اس موقع پر بھی صادق آتا ہے -

اب ہم برٹرنڈ رسل کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے انسانی سیرت کے اہم ترین فضائل کیا قرار دئے ہیں - وہ کہتا ہے کہ یہ صفات ایسی نہیں ہونی چاہئیں جو بعض لوگوں کے لئے موزوں ہوں اور بعض کے لئے نہ ہوں - ہمیں اُن عام صفات کی تلاش ہے جو ہر تربیت یافتہ انسان کے لئے مفید اور ضروری ہیں - وہ اس نقطۂ نظر کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے [1] :—

" کچھہ صفات ایسی ہیں جو سب انسانوں کے لئے نہیں بعض کے لئے مفید ہیں اور کچھہ ایسی ہیں جو سب کے لئے ضروری اور مطلوب ہیں - بیشک ہمیں صناعوں کی ضرورت ہے ' سائنس دانوں کی ضرورت ہے ' بڑے بڑے مدبروں کی ضرورت ہے لیکن اسی کے ساتھہ ہل چلانے والے ' آٹا پیسنے والے اور نانبائی بھی درکار ہیں - وہ صفات جن کی بدولت انسان کسی خاص شعبۂ عمل

---

[1] On Education -

میں امتیاز حاصل کرتا ہے عموماً ایسی ہوتی ہیں
کہ ان کا سب کے لئے عام ہو جانا کچھہ اچھا نہیں -
شیلے (Shelley) ایک شاعر کے دن بھر کے کام کو اس طرح
بیان کرتا ہے :—

'وہ نور کے تڑکے سے جھٹپٹے وقت تک اس نظارے سے لطف
اتھاتا ہے ' کہ سورج کی کرنوں کے جوت سے ساری فضا جگمگا
رہی ہے ' اور اس کی تہ میں سبز کائی کے اندر شہد کی
مکھیاں کھیلتی پھرتی ہیں - اس کی بلا جانے یہ کون
ہیں کیا ہیں ' ! -

یہ عادت ایک شاعر کے لئے ضرور قابل تعریف ہے - لیکن
کسی اور شخص مثلاً چٹھی رساں کے لئے نہیں - لہذا
ہم ایسی تعلیم نہیں دے سکتے جو ہر شخص میں شاعرانہ
طبیعت کی نشو و نما کرے - مگر بعض صفات عام طور
پر مفید اور پسندیدہ ہیں اور ہم یہاں صرف انہیں سے
بحث کریں گے - ہمارے خیال میں چار صفات ایسی
ہیں جو مل کر بہترین سیرت کی بنیاد بن سکتی
ہیں :—

(۱) قوت
(۲) جرأت
(۳) ذکاوت احساس
(۴) ذہانت

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ فہرست مکمل ہے لیکن میرا یہ
خیال ہے کہ یہ چاروں چیزیں موجود ہوں تو بہت کافی
ہیں - اور مجھے یہ بھی پوری طرح یقین ہے کہ اگر
بچوں کی دماغی جسمانی اور جذباتی تربیت میں
غور اور احتیاط سے کام لیا جائے تو یہ صفات بہت عام
ہوسکتی ہیں'' -

اس کے بعد رسل (Russel) نے ان چاروں صفات سے یکے بعد دیگرے
بحث کرکے بتایا ہے کہ ان کا مفہوم اس کے ذہن میں کیا ہے اور یہ کس
طرح انسانی سیرت کی تکمیل کرتی ہیں - پہلی دو صفات یعنی قوت
اور جرأت ایک حد تک ڈیوئی کے یہاں '' قوت عمل '' میں شامل
ہیں - لیکن رسل ان دونوں میں امتیاز کرتا ہے - قوت کا تعلق ' اس
کے خیال میں زیادہ تر جسم سے ہے - اگر بچے کی جسمانی صحت اچھی
ہے اور اس کے بدن میں طاقت ہے تو اس کو تکلیفیں مقابلتاً کم محسوس
ہونگی - اور وہ زندگی سے زیادہ لطف اندوز ہوگا - وہ اپنی ذات میں
اتنا منہمک نہیں ہوگا کہ اپنے جسم کے سوا دنیا کی اور تمام چیزیں
اس کو بے معنی اور بے لطف معلوم ہوں - اسے گرد و پیش کے واقعات
اور اشخاص اور خارجی چیزوں سے دل چسپی ہوگی اور وہ محنت سے
جی نہیں چرائیگا - وہ دوسروں کی خوش حالی کو دیکھکر حسد
نہیں کریگا کیونکہ حسد کمزوری اور بیماری کی نشانی ہے - وہ عام طور
پر خوش اور بشاش رہے گا اور اپنے اوپر افسردگی اور بیدلی کو طاری نہیں
ہونے دے گا - رسل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض صورتوں میں
قوت کے نتائج برے بھی ہوتے ہیں اور بعض مستثنیٰ حالتوں میں
لوگوں نے اس کے بغیر بھی بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں - لیکن بحیثیت

مجموعی ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قوت سیرت کا ایک لازمی عنصر ہے اور جو تعلیم طلبہ میں قوت پیدا کرنے پر زور نہیں دیتی وہ اپنے مقصود میں کامیاب نہیں ہوسکتی خصوصاً موجودہ زمانے میں جب زندگی پر محنت اور جد و جہد کا قانون حاوی ہے -

دوسری صفت ہے جرأت ' یعنی خوف پر غالب آنے کی قوت - ہمیں نہ صرف اپنی ظاہری حرکات اور افعال کو خوف سے پاک رکھنا چاہئے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات میں بھی اس کو راہ نہ دینی چاہئے - بچوں کے لئے یہ تعلیم ' جس پر مثلاً انگریزوں کی تربیت مبنی ہے ' کافی نہیں کہ وہ خوف کو ظاہر نہ کریں - کیونکہ اگر خود داری یا دوسروں کی شرم اور لحاظ کی وجہ سے وہ اپنی طبیعت پر جبر کرکے ان ظاہری حرکات کو روکیں گے جن سے خوف کا اظہار ہوتا ہے اور جو عام طور پر معیوب سمجھی جاتی ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف دماغ کے غیر شعوری حصے میں پہنچ کر ان کے اطمینان اور سکون قلب کو غارت کردے گا اور زندگی بھر نئے نئے بھیس بدل کر عجیب و غریب شکلوں میں ظاہر ہوتا رہے گا - اس مسئلے پر ماہرین تحلیل نفسی (Psychoanalysts) نے اپنی تحقیقات کے ذریعے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خوف بلکہ ہر قوی جبلت کو دبا دینے سے کیا کیا خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں - علاوہ اس کے جسمانی خوف پر غالب آنے کی کوشش میں اکثر رائے عامہ کا یا دوستوں کی ناراضگی اور لعن طعن کا نیا خوف پیدا ہوجاتا ہے جو سیرت کی اعلا تربیت میں حارج ہوتا ہے کیونکہ آئندہ عمر میں انسان اپنے ہر کام میں اسی خوف ملامت کو اپنا راہبر بناتا ہے - ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اخلاقی سیرت کی تدریجی ارتقاء میں یہ محرک عمل

بھی ایک وقت میں مفید ثابت ہوتا ہے لیکن سیرت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب انسان ملامت کے خوف اور دوسروں کی رضاجوئی دونوں پر غالب آجائے - لہذا سوال یہ ہے کہ سچی جرأت طلبہ میں کس طرح پیدا کی جائے ؟

اس جرأت کو پیدا کرنے میں صحت اور قوت دونوں کو دخل ہے - وہ اس وقت مستحکم ہوتی ہے جب اِنسان کو پر خطر موقع پیش آئیں اور وہ دل کو مضبوط کرکے دانشمندی سے کام لیکر اِن موقعوں پر کامیابی حاصل کرے - اس قسم کی جرأت کی ایک نہایت عمدہ مثال ایک انگریز افسانہ نویس "سیپر" (Sapper) نے اپنے ہیرو "بل ڈاگ ڈرمنڈ" (Bull Dog Drummond) کے کردار میں دکھائی ہے - اس میں غیر معمولی جسمانی قوت ہے جو اس کے دل کو قوی رکھتی ہے ' اور جنگ عظیم کے ہولناک تجربات کی بدولت یہ قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھہ ' اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کرکے کرسکتا ہے - بلکہ خطرہ اس کے حواس اور اس کے ذہن کو اور زیادہ تیز کردیتا ہے - یہ جرأت در اصل جسمانی جرأت ہے جس میں ذہنی تربیت کے شریک ہوجانے سے کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوگیا ہے - لیکن ہمیں ایسے عام جذبہ جرأت کی نشو و نما کرنی ہے جس کی بدولت انسان زندگی کی تمام مشکلات کو مردانہ وار برداشت کرے ' خواہ وہ خارجی ہوں اور جسمانی دلیری کی طالب ہوں ' خواہ داخلی جن کے مقابلے کے لئے ضبط نفس درکار ہے - اس جذبہ کی تربیت کے لئے انسان میں دو گہری نفسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے یعنی ایک تو خود داری یا عزت نفس کا احساس اور دوسرے ذاتی اغراض سے قطع نظر کرکے زندگی سے بنفسہ دلچسپی رکھنے اور اس کا غیر شخصی نظر سے مطالعہ

کرنے کی صلاحیت - عزت نفس کا احساس اُنہیں لوگوں میں ہوسکتا ہے
جن کی زندگی کا مرکز خود ان کی ذات کے اندر ہو، اِس معنی میں نہیں
کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہوں بلکہ اس معنی میں کہ
اُن کے خیالات اور مقاصد اور رائیں ان کے اپنے تجربے اور فکر کا نتیجہ
ہوں اور وہ یہ سمجھیں کہ بحیثیت اِنسان کے اُن کو آزادیِ فکر و عمل
کا حق حاصل ہے جس سے کوئی شخص اُنہیں محروم نہیں کرسکتا -
برخلاف اس کے جن لوگوں کے خیالات اور جذبات اور افعال محض
دوسروں کی تقلید پر مبنی ہوتے ہیں، جو ہر وقت دوسروں کی تحسین
کے خواہاں رہتے ہیں ان میں حقیقی جرأت پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ
وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس
کی وجہ سے دوسرے لوگ انہیں برا کہیں یا حقیر سمجھیں - اس
کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ فیشن کے؛ یا عوام کے توہمات اور مہمل
رسم و رواج کے غلام ہوجاتے ہیں اور جوہر انسانیت کی بیحرمتی کرتے
ہیں - یا ان میں جھوٹا انکسار اور ریاکاری پیدا ہوجاتی ہے اور عزت
نفس جو تمام فعالی نیکیوں کی بنیاد ہے جاتی رہتی ہے - لہذا تعلیم
کے ذریعہ طلبہ میں عزت نفس کے احساس کو اُبھارنے اور مستحکم کرنے
کی ضرورت ہے - دوسری شرط جو اعلیٰ قسم کی جرأت پیدا ہونے کے لئے
ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اِنسان میں زندگی کو غیر شخصی نظر سے دیکھنے
کی صلاحیت ہو - جس شخص کی تمام اُمیدیں اور اندیشے اپنی ہی ذات
کے ساتھہ وابستہ ہوتے ہیں، وہ اطمینان قلب کے ساتھہ کسی خطرے کا
خصوصاً موت کا سامنا نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے نزدیک اپنی موت گویا
تمام دنیا کا خاتمہ ہے - وہ یہ نہیں سمجھہ سکتا کہ کائنات میں بہت
سی قوتیں، اور اجتماعی اور اخلاقی نظام ایسے ہیں جو فرد کی زندگی

سے اہم تر ، بلند تر اور بے نیاز ہیں اِس لئے اپنی ذات کو غیر معمولی اہمیت دینا ایک مضحکہ خیز حرکت ہے - اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ حیات انسانی کی بقا اور ترقی اسی جیسے انسانوں کے عمل پر منحصر ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی کی زندگی کا چھوٹا سا ، ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ جائے لیکن اس کا نام کسی زبردست ادبی یا اخلاقی یا معاشری کارنامے کی بدولت ہمیشہ روشن رہے اور اسے زندہ جاوید بنادے - بہر حال جب تک انسان اپنی محدود ذات کی طرف سے بے تعلقی کی یہ شان پیدا نہ کرے اس میں حقیقی اخلاقی جرأت کا پیدا ہونا ممکن نہیں - لیکن اس انداز طبیعت کو پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان نفس کشی اور ترک دنیا اختیار کرے اور بے سبب تکلیفیں اُٹھانے کو تزکیہ نفس کا ذریعہ قرار دے - دنیا کے تمام مذاہب اور ملکوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے اس رہبانی فلسفہ زندگی کو اختیار کیا ہے اور وہ نفی حیات کے ذریعہ اپنی نجات کی کوشش کرتے ہیں بجائے اسکے کہ اپنی فطری خواہشوں اور قوتوں کی توسیع و تربیت کر کے ان کو اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کریں - ہم نے ارتقائے شخصیت کا جو نقطۂ نظر اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ "نفی حیات" کے سراسر خلاف ہے اور اس کی رو سے اخلاقی تربیت کا نقطۂ آغاز یہی فطری خواہشات اور جبلتیں ہیں جن کو ہم اپنے ماحول کے اثر اور تجربے کے ذریعے زیادہ وسیع اور منظم بناتے ہیں اور بلند تر مقاصد سے وابستہ کرتے ہیں - اس لئے غیر شخصی انداز طبیعت پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم بچوں میں مختلف قسم کے قابل قدر مقاصد سے دل چسپی پیدا کریں اور ان کو ان کی ذات کے محدود دائرے سے نکال کر ان علوم و فنون اور مشاغل سے روشناس

کریں جن میں منہمک ہوکر وہ حقیقی معرفت نفس حاصل کریں
اور اُن کی خودی اس درجہ وسیع ہوجائے کہ وہ خارجی دنیا کے بہترین
عناصر کو اپنے اندر سمیٹ لے - رسل نے بتایا ہے کہ وہ بہترین اور قابل
قدر عناصر کیا ہیں جو انسان کی خودی کو وسعت بخشتے ہیں :—

" فطرت اِنسانی میں بعض چیزیں ایسی ودیعت کی
گئی ہیں جو بغیر کوشش کے ہمیں خودی کی تنگ
چار دیواری سے باہر لے جاتی ہیں - اُن میں سب سے
زیادہ عام محبت کا جذبہ ہے خصوصاً والدین کی محبت
جو بعض لوگوں میں ایسی وسیع شکل اختیار کرلیتی
ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش شفقت میں
لے لیتی ہے - اسی قسم کی دوسری چیز علم ہے - ہم یہ
نہیں کہہ سکتے کہ مشہور عالم فلکیات گلیلیو (Galileo)
کو نوع اِنسانی سے کوئی خاص محبت تھی لیکن اس
نے اپنی زندگی یقیناً ایک ایسے مقصد کی خاطر بسر
کی جس کو موت بھی تمام نہ کرسکی - اِس طرح ایک
تیسری چیز آرٹ ہے - بلکہ دراصل یہ کہنا چاہئے کہ
جس حد تک اِنسان اپنے جسم کے علاوہ خارجی چیزوں
سے دل‌چسپی رکھتا ہے اسی حد تک اس کی زندگی غیر
شخصی ہوتی جاتی ہے - گو بظاہر یہ بات عجیب
معلوم ہوتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس شخص کو
بہت سی چیزوں سے قلبی تعلق اور دل‌چسپی ہوتی
ہے اسے زندگی کو خیرباد کہتے وقت اس قدر تکلیف
نہیں ہوتی جتنی اس بچارے شکی دائم‌المرض آدمی

کو جس کی دلچسپی اور توجہ ہمیشہ اپنی ہی بیماریوں اور تکلیفوں تک محدود رہی ہو - لہذا جرأت کی تکمیل اس آدمی کی شخصیت میں ہوتی ہے جو بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی " خودی " دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ خود کو حقیر جانتا ہے بلکہ اسوجہ سے کہ وہ بہت سي ایسی چیزوں کی قدر و احترام کرتا ہے جو اِس کی ذات کے ماورا ہیں - یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اِنسان کي جبلتوں کو آزادي حاصل ہو اور اس کی ذہانت پوری طرح کام کرتی ہو - اِن دونوں کے اتحاد سے جو ہمہ گیر وسعت نظر پیدا ہوتی ہے اس سے نہ تو تارک‌الدنیا راہب آشنا ہوتا ہے نہ نفس پرست عیاش - اس طبیعت کے آدمی کے لئے اپنی موت ایک بہت معمولی سا واقعہ ہے - یہ جرأت حقیقی اور ثبوتی ہوتی ہے اور اس کی بنیاد جبلت پر قائم ہوتی ہے - یہ محض منفی جرأت نہیں جو فطری جذبات کو دبانے سے پیدا ہو - اس قسم کی ثبوتی جرأت کو میں سیرت انسانی کی تکمیل کے لئے ایک بہت اہم عنصر سمجھتا ہوں" - [۱]

سیرت اِنسانی کی تیسری صفت رسل (Russel) کے نزدیک ذکاوت احساس ہے یعنی انسان کا جذبات کے معاملے میں سریع‌الحس ہونا

---

[۱] On Education صفحہ ۵۳-۵۵ -

تاکہ ماحول کے مختلف محرکات اس میں مناسب جذبات پیدا کریں - جس شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اچھی اور بری ' خوشگوار اور ناگوار چیزوں سے مناسب طریقے سے متاثر ہوسکے وہ معاشری اور اخلاقی زندگی میں کامیابی کے ساتھ شرکت نہیں کرسکتا - کیونکہ عمل کے محرک ہمیشہ جذبات ہی ہوتے ہیں یا کم از کم عمل کو مستقل اور مسلسل بنانے کے لئے وہ قوت محرکہ درکار ہے جو جذبات میں پوشیدہ ہوتی ہے - نفسیات نے انسانی عمل کے تین عناصر بتائے ہیں یعنی ادراک (Cognition) جذبہ (Emotion) اور فعل (Conation) - ان میں سے ادراک اور فعل دونوں میں تغیر اور تبدیلی ممکن ہے لیکن انسان کے مستقل جذبات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور انہیں سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اسے باوجود مشکلات کے ثابت قدم رکھتی ہے - بہر حال جذبات اور ان کی تربیت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا - اگر کسی شخص میں معاشری حالات اور ضروریات کو دیکھ کر یا ان کا خیال کرکے مناسب جذبات کا جوش پیدا نہ ہوگا تو وہ خود کو عمرانی مقاصد کے ساتھ کیسے متحد کرسکتا ہے ؟ اس احساس کی تربیت میں کئی چیزیں شریک ہوتی ہیں - شروع میں بچے کی تحسین طلبی کی خواہش اپنا اثر کرتی ہے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اور ان کی ملامت سے بچنا چاہتا ہے - اکثر لوگوں میں یہ محرک عمل تمام عمر باقی رہتا ہے - جہاں تک اس کی بدولت لوگوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہوں اور خود غرضی کی روک تھام ہو اس کے مفید ہونے میں شبہ نہیں لیکن جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں رائے عامہ کو عمل کا معیار اعلیٰ قرار نہیں دینا چاہئے - اس صفت کا دوسرا لازمی جزو ہمدردی ہے جو اپنی ابتدائی

حالت میں محض ایک جبلت ہے جو انسانوں اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے - اس وقت اس کا تعلق دل سے زیادہ جسمانی کیفیت سے ہوتا ہے اور اس میں اور تقلید اور اثر پزیری میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے - ایک چھوٹا بچہ کسی دوسرے بچے کو روتا دیکھہ کر خود بھی رونے لگتا ہے - ذرا بڑی عمر میں شاید ہر شخص کو دیکھہ کر یہ کیفیت پیدا نہ ہو لیکن اپنے قریبی عزیزوں اور درستوں کے جذبات سے متاثر ہونا عام اور قدرتی بات ہے - اس ہمدردی کی تکمیل اور توسیع کے لئے رسل (Russel) کے خیال میں دو چیزوں کی ضرورت ہے - ایک تو یہ کہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو کہ انسان علاوہ اپنے قریبی دوستوں اور عزیزوں کے اور انسانوں کے دکھہ درد سے بھی متاثر ہو سکے - اس کی تفصیل پہلے کی جاچکی ہے - دوسرے یہ کہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت بھی بیدار ہو جب ہم کسی دکھہ یا مصیبت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں بلکہ کسی اور ذریعہ سے ہمیں اس کا علم ہو - اس وسعت اور احساس کے پیدا کرنے کے لئے تخئیل کی تربیت ہونی چاهئے تا کہ ہمیں افسانوں اور تاریخوں ' سرکاری رپوٹوں اور اعداد و شمار میں بھی وهی تصویر دکھائی دے جو واقعات کو اپنی آنکھہ سے دیکھہ کر نظر آتی ہے تا کہ ہمارا ہمدردی کا جذبہ صرف اسی وقت مشتعل نہ ہو ' جب مثلاً کسی جنگ میں خود ہمارا کوئی عزیز یا دوست زخمی ہو - بلکہ جب کبھی ہمیں معلوم ہو کہ قوموں کی ایک خون ریز جنگ میں لاکھوں آدمی مارے گئے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں تو ہمارا دل دکھے اور ہم یہ محسوس کریں کہ یہ سب لوگ کسی نہ کسی کے دوست اور عزیز ہوں گے - ہمدردی اپنی پوری وسعت اس وقت حاصل کرتی ہے جب ایک شخص کے دل میں سارے جہاں کا درد جمع ہوجائے -

رسل کے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں ہے اور وہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ :—

'' اگرچہ سائنس نے ہماری قوتوں میں اس قدر اضافہ کردیا ہے کہ ہم دور دراز کے ممالک کے لوگوں کی زندگی پر اثر ڈال سکتے ہیں - لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ہمدردی میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہوئی '' [۱]

ایک سائنس داں جو اپنے معمل یا کارخانے میں بیٹھ کر کیمیا کے تجربے کرتا ہے اور کوئی خوفناک بم کا گولہ یا زہریلی گیس ایجاد کرتا ہے تو وہ گویا تمام دنیا کے امن و امان کو متزلزل کرتا ہے - ایک بڑا تاجر جو اپنا منافع بڑھانے کے لئے اپنی منڈیوں میں غلے کی فروخت اور بر آمد کو روک دیتا ہے وہ نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کو فاقہ کشی میں مبتلا کرسکتا ہے - اس کا تدارک کرنے کے لئے تعلیم کا فرض یہ ہے کہ طلبہ میں تخیل اور ہمدردی پیدا کرے تا کہ وہ دوسروں کی حالت کو صحیح طریقہ پر محسوس کریں اور اس ظلم اور بے انصافی کا خاتمہ ہو جو زیادہ تر عدم احساس کی وجہ سے رائج ہے - یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ذکی الحس ہونے سے محض یہی فائدہ نہیں کہ انسان دوسروں کے دکھ میں شریک ہو اور عمرانی فرائض کو ادا کرے بلکہ تہذیب نفس اور ذوق جمال کی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے - خوبصورت چیزوں سے وہی لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں جن میں احساس کی نزاکت ہو ' جو لطیف نکتوں کو سمجھ سکیں ' اور رنگ و بو اور شکل کے باریک فرقوں میں امتیاز کر سکیں جن کے دل

---

[۱] On Education

میں مصور کی رنگ آمیزی ' شاعر کی جادو بیانی ' مغنی کی نغمہ طرازی مضراب بن کر ذوق حسن کے تاروں کو چھیڑ دے - یہ ذوق اس شخص میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک ایک چابک دست مصور کی تصویر' اور رنگ کے چند دھبوں میں جو کاغذ پر پڑجائیں کوئی فرق نہ ہو ' جو طبلے کی تھاپ اور ہتھوڑے کی چوٹ کو ایک ہی چیز سمجھے ؟ - بے شک اس حسن شناسی کے لئے فنی امور سے واقفیت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ احساس کی ذکاوت اور جذبات کی لطافت درکار ہے -

رسل نے ذہانت یا عقل کو انسانی سیرت کی چوتھی لازمی صفت قرار دیا ہے - عقل میں وہ دو چیزیں شامل کرتا ہے - ایک تو وہ علم جو ہم حاصل کر چکے ہیں جو گویا ہماری ملکیت بن گیا ہے - دوسرے وہ قابل قدر صلاحیت جس کے ذریعے سے ہم نیا علم حاصل کر سکتے ہیں - ان دونوں میں بہت قریبی تعلق ہے - کیونکہ جلد سیکھنے کی صلاحیت جو " ذہانت" کہلاتی ہے ایک حد تک ہمارے سابق علم پر منحصر ہے - جاہل آدمی کو کوئی نئی بات سکھانی بہت مشکل ہے - وہ آسانی سے اپنی ذہنی عادتوں اور اپنے خیالات کو تبدیل نہیں کرتا - اس میں عقیدہ تنقید اور تجسس کی جگہ لے لیتا ہے اور وہ ان نئی باتوں کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے جو سائنس کی ترقی کی بدولت عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہیں - بر خلاف اس کے جس شخص کی تعلیم صحیح اصولوں پر مبنی ہوتی ہے ' یعنی وہ جو علم حاصل کرتا ہے وہ اس کی ذہنی تربیت میں معین ہوتا ہے اور اس میں مزید علم حاصل کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے ' اس کی ذہنی نشو و نما ہمیشہ جاری رہتی ہے - مفید اور مکمل زندگی بسر کرنے کے لئے یہ قابلیت اس درجہ اہم اور لازم ہے

قرار دیا ھے - لہذا انسانی سیرت کی تشکیل میں عقل کا فرض اولین یہ ھے کہ ترقی ' نشو و نما ' اجتہاد ' نئی باتوں کو سیکھنے کی صلاحیت برقرار رکھے ' اور فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے ارتقاء پذیر ماحول میں کامیابی کے ساتھہ زندگی بسر کر سکے - برگساں (Bergson) وغیرہ نے ارتقائے تخلیقی کا جو نظریہ پیش کیا ھے اس کے لحاظ سے بھی حیات انسانی میں عقل کا مفہوم وھی ھے جس کی طرف ھم نے ابھی اشارہ کیا ھے -

عقل کی جبلی بنیاد تجسس ھے جو انسانی طبیعت کے لوازمات میں سے ھے - حیوانوں میں اور چھوتے بچوں میں اس کا اظہار بہت افراط اور شدت سے ھوتا ھے اور وہ ان کے اکثر اعمال و افعال کی محرک ھوتی ھے - لیکن بدقسمتی سے موجودہ تعلیمی اور معاشري حالات ایسے ھیں کہ جوں جوں بچہ کي عمر بڑھتی جاتی ھے عموماً اس کا شوق تجسس کم ھوتا جاتا ھے یہانتک کہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر ' جو مختلف افراد میں مختلف ھوتی ھے' اس میں یہ صلاحیت ھی نہیں رھتی کہ وہ نئی چیزوں اور نئے خیالات سے دل چسپی پیدا کر سکے - اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح سخت اور بے لوچ ھو جاتا ھے - اس میں یہ عادت جو سن کہولت کی مخصوص صفت ھے ' پیدا ھوجاتی ھے کہ وہ اپنے خیالات کی باگ " پرانے زمانے " کي طرف موڑ دیتا ھے ' اسی کي تعریف کیا کرتا ھے اور نئی تحقیقات ' نئے نظریوں بلکہ نئے لوگوں سے بھی گھبراتا ھے اور ان سے کچھہ سیکھنے کي خواھش نہیں کرتا - جب جذبۂ تجسس بالکل مردہ ھوجائے تو سمجھہ لینا چاھئے کہ ذھانت کا بحیثیت ایک قوت محرکہ کے خاتمہ ھو گیا ھے اور انسان میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رھی - لیکن اس کے ساتھہ ھی یہ یاد رکھنا چاھئے کہ جیسا

رسل نے بتایا ھے ' ممکن ھے تجسس کی شدت اور ھمہ گیری میں کمی آجائے لیکن اس کی نوعیت بہتر ھوجائے - یعنی ایک پختہ عمر کے انسان کو بچوں کی طرح جزئیات کے متعلق تجسس نہ ھو بلکہ کلیات سے دل چسپی پیدا ھو جائے اور وہ صرف ایسے امور اور مسائل کی تحقیق و تفتیش کرے جو علمی اھمیت رکھتے ھیں - تجسس کا یہ ارتقاء فطرت انسانی کے مقتضا کے عین مطابق ھے اور ھمیں اس میں مدد دینا چاھئے تا کہ تجسس کی قوت ایسے کاموں میں صرف ھو جن کی اھمیت مستقل اور دائرہ وسیع ھے - لیکن اس ارتقاء کے لئے شرط یہ ھے کہ طلبہ میں قوت مشاھدہ ' محنت اور مستقل مزاجی کی عادتیں پیدا کی جائیں اور ان کا یہ عقیدہ ھو کہ علم کی تحصیل کی کوئی حد نہیں - ورنہ ان عادتوں کے بغیر ' تجسس کا اظہار نہایت ناقص اور بے کار طریقوں پر ھو گا یعنی اِدھر اُدھر کی فضول باتیں سننے کا شوق ' دوسروں کے بھید معلوم کرنے کی خواھش' غیر متعلق چیزوں کا کھوج جن سے انھیں کوئی مستقل فائدہ نہیں ھو سکتا - عقلی تربیت کا ایک اور اھم جزو رسل کے نزدیک وسعت نظر ھے جس کی بدولت ھم نئے حقائق اور نئی تجاویز پر غور کرنے کے لئے آمادہ رھتے ھیں اور اپنے پرانے اور پسندیدہ عقائد پر محض اسی وجہ سے اصرار اور ضد نہیں کرتے کہ ھم انھیں عرصہ سے مانتے چلے آئے ھیں - اس وسعت نظر اور ذھنی دیانت کے لئے بھی جرأت اتنی ھی ضروری ھے جس قدر جسمانی بہادری کے لئے - کیونکہ اس کے بغیر ھم معاشرے کے رسم و رواج اور خیالات کی طرف سے بے پروا ھوکر اپنی ذاتی رائے اور عقیدے پر عمل نہیں کرسکتے - کمزوروں اور سہولت پسندوں کے لئے سیدھا راستہ یہی ھے کہ وہ آنکھیں بند کرکے اُنھیں خیالات اور عقائد کی پابندی کریں جو اُن کے گرد و پیش عام طور پر رائج ھیں لیکن جن

لوگوں میں اخلاقی جرأت اور عزت نفس ہوتی ہے وہ اپنی عقل کی مدد سے دنیا کے مسائل اور معاملات کے متعلق دیانت داری اور آزادی کے ساتھہ رائے قائم کرتے ہیں جو عوام کی رائے سے مختلف ہوتی ہے - ان کو ہر طرح کی مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اپنی آزادی کی خاطر ان سب کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں - بقول رسل (Russel) کے :—

"ذہنی آزادی کی زندگی اس قدر آرامدہ ' مرنجان مرنج اور پر امن نہیں ہوسکتی جتنی وہ زندگی جو مروجہ عقائد کی پابندی کے حصار میں محفوظ ہو - صرف عقیدے ہی کی پناہ میں انسان کو وہ آرام و اطمینان نصیب ہوتا ہے جو کسی شخص کو ایک روشن آتش دان کے پاس بیٹھہ کر حاصل ہوتا ہے جب کمرے کے باہر سردی کا زور ہو"

اِس بحث میں رسل (Russel) نے یہ مسئلہ بھی چھیڑا ہے کہ انفرادی زندگی کو کس حد تک اجتماعی زندگی کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہئے - ہم اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کرچکے ہیں اِس لئے یہاں اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں - رسل (Russel) نے اِس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عام طور پر ہر شخص کو دوسروں کے ساتھہ مل جل کر اور ان کی رضاجوئی کا خیال رکھہ کر کام کرنا چاہئے ورنہ لوگوں کے برتاؤ اور آداب معاشرت میں شائستگی پیدا نہ ہوگی اور جماعتوں کا قیام بہت مشکل ہوجائیگا - اِس طرح دوسروں کے جذبات سے متاثر ہونا اور اُن کو قبول کرنا مفید ہے بشرطیکہ جذبات کسی عقلمند شخص کی طرف سے کسی کم عقل شخص کی طرف منتقل

ہوں - لیکن جہاں ایک بڑا دائرہ عمل ایسا ہے جس میں اجتماعی اثرات کی حکمرانی ہے وہاں ہر شخص کے لئے ایک چھوٹا سا دائرہ ایسا بھی ہونا چاہئے جہاں اجتماعی اثرات کو بہت کم دخل ہو یا نہ ہو ' اور یہ اس کی مخصوص قابلیت کا میدان ہے - یعنی جس خاص علم یا فن یا شعبہ عمل میں کسی شخص کو خاص مہارت ہو وہاں اس کو ذاتی غور و فکر اور آزادی رائے سے کام لینا چاہئے ' اور اگر اِس دائرے کے اندر کوئی ایسا معاملہ یا مسئلہ ہو جس میں اس کی رائے ' رائے عامہ کی مخالف ہو تو اس کو جرأت کے ساتھ کھلم کھلا ظاہر کردینا چاہئے - باقی مسائل میں ' بالخصوص علمی اور فنّی مسائل میں ہمیں ماہرین خصوصی کی رہنمائی قبول کرنی چاہئے -

ان چاروں صفات کے مفہوم اور شرائط سے بحث کرنے کے بعد رسل اِس معاشرے کا ایک تخییلی نقشہ کھینچتا ہے جو اِس قسم کی تعلیم پا کر پیدا ہوگا اور جس کے افراد میں کسی نہ کسی حد تک یہ صفات پائی جائیں گی :—

" موجودہ معاشرے سے کس قدر مختلف ہوگی اِنسانوں کی وہ جماعت جس کے ہر مرد اور عورت میں قوت' جرأت ' ذکاوت احساس اور ذہانت کی صفات اس حد تک مرجود ہوں گی جس حد تک تعلیم اُن کو پیدا کرسکتی ہے ! بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو خوشی سے محروم ہوں - اِس زمانے میں رنج اور بے اطمینانی کے سب سے بڑے اسباب بیماری ' مفلسی اور صنفی زندگی کی ناقابل اطمینان حالت ہیں - یہ سب چیزیں مقابلتاً بہت کم ہوجائیں گی - صحت اور

تندرستی بہت عام ہوسکتی ہے - بڑھاپے کی آمد کو مدت تک ملتوی کیا جا سکتا ہے - صنعت و حرفت کے اِنقلابات کے بعد بھی مفلسی کا قائم رہنا محض لوگوں کی متحدہ حماقت کا ثبوت ہے - احساس کی بیداری سے لوگوں میں عام افلاس کو دور کرنے کی خواہش پیدا ہوگی ' عقل اِن کو راستہ دکھائے گی اور جرأت اُنہیں اِس راستہ پر ثابت قدم رکھے گی - کم ہمت لوگ بالعموم تکلیف برداشت کرلیتے ہیں لیکن اِس کو رفع کرنے کے لئے کوئی غیر معمولی کوشش کرنے پر آمادہ نہیں ہونے ......بے خوف عورتوں کی ایک نسل تمام دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے ، کیونکہ اُن کی اولاد بھی جری اور بے خوف ہوگی اور اُن کی فطرت مسخ نہ ہونے پائیگی یہ لوگ راست باز ' صاف گو ' فراخ دل ' محبت شعار اور آزاد ہوں گے - اُن کی جد و جہد ظلم اور مصائب کے اس بوجھہ کو اُتار کر پھینک دے گی جس کو ہم محض اپنی سستی یا کم ہمتی یا بے رحمی یا حماقت کی وجہ سے برداشت کرتے ہیں - تعلیم کی خرابی ہی نے ہم میں یہ بری عادتیں پیدا کی ہیں اور اسی کي اصلاح کرکے ہم اچھی عادتیں پیدا کر سکتے ہیں - تعلیم نئي زندگی کی کنجی ہے [۱] "

مکمل اِنسانی سیرت کے متعلق اِن دونوں فاضل مفکروں کے خیالات کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بڑی حد تک

---

[۱] On Education صفحہ ٦٥-٦٦ -

اتفاق رائے ھے اور اگرچہ دونوں کے خیالات کی فلسفیانہ بنیاد الگ الگ ھے لیکن دونوں کو اخلاقی تربیت اور سیرت کے اس مفہوم سے اختلاف ھے جو صدیوں تک نہ صرف عملاً رائج رھا ھے بلکہ علمی نظریوں پر بھی مسلط رھا ھے - دونوں عقل و علم اور اخلاق کے قریبی تعلق کو تسلیم کرتے ھیں اور اس خیال کی تردید کرتے ھیں کہ عقل کو اخلاقی سیرت سے کوئی لازمی تعلق نہیں - فلسفہ تعلیم اور تنظیم مدارس کے لئے اس جدید نقطہ نظر کی بہت بڑی اھمیت ھے - کیونکہ جیسا ھم بتا چکے ھیں ' مدرسوں میں عام طور پر علمی مشاغل اور اخلاقی تربیت میں حد فاصل قائم ھو گئی ھے - ان کی درسی زندگی اِس طرح مرتب نہیں کی گئی کہ اِس میں طلبہ کے کردار پر بالارادہ اثر ڈالا جائے اور ان کی اخلاقی سیرت مستحکم کرنے کا اھتمام ھو - یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ عملی طور پر تو معلم اپنا تمام وقت اور توجہ درسی علوم کے سکھانے میں صرف کرتے ھیں اور زبان سے ھمیشہ یہ کہتے رھتے ھیں کہ '' اخلاق '' یا '' نیکی '' کے سوا اور تمام چیزیں ھیچ ھیں - جدید نظریہ تعلیم نے عقل اور اخلاق کے درمیان ایک لازمی رشتہ قائم کر دیا ھے - عقل اور ذھانت کے متعلق اُن دونوں مفکرین کے نقطہ نظر میں جس کا ھم نے ذکر کیا ھے اِتنا فرق ضرور ھے کہ ڈیوئی (Dewey) اِس کے عملی استعمال پر زیادہ زور دیتا ھے اور اِس طرح طلبہ میں قوت فیصلہ کی تربیت کرنا چاھتا ھے جو تحصیل مقاصد میں' معاملہ فہمی میں ' مشکلات سے عہدہ بر آ ھونے میں مدد دے - رسل (Russel) کو زیادہ فکر یہ ھے کہ طلبہ کی ایسی ذھنی تربیت کی جائے جو ان میں جذبۂ تجسس کے ساتھ وسعت نظر پیدا کرے ' وہ نئے حقائق اور نئے نظریوں پر غور کرنے کے لئے تیار رھیں اور ان میں عقلی نشو و نما کی

صلاحیت باقی رہے - اس طرح دونوں کے نزدیک صلاحیت عمل سیرت
کی تکمیل کے لئے ضروری ہے - ڈیوئی اس کو قوت یا کارکردگی کے نام سے
موسوم کرتا ہے ' رسل اس کو قوت حیات کہتا ہے - ڈیوئی کے نزدیک
قوت اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اِنسان اپنے مقاصد میں کامیاب
نہیں ہوسکتا اور جب تک اس میں استقلال ' حوصلہ اور محنت کی
صفات نہ ہوں گی ' جو قوت کے مفہوم کا جزو ہیں ' وہ اپنے جذبات اور
خیالات کو عمل میں نہ لا سکے گا - رسل بھی جسمانی قوت اور
صحت کو لازم سمجھتا ہے لیکن وہ اس سے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ طلبہ
میں مسرت حیات کا احساس بیدار ہو اور وہ اپنی خودی کی قید سے
نکل کر دنیا کی دوسری چیزوں اور مظاہر میں دلچسپی لینا سیکھیں
اور ان جسمانی اور دماغی خرابیوں سے محفوظ رہیں جو کمزوری کی
وجہ سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً ضد ' بد مزاجی ' افسردگی ' بیماري
وغیرہ - رسل جرأت کو ایک مستقل اور علحدہ صفت قرار دیتا ہے کیونکہ
وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں بیشتر خرابیاں خوف کا نتیجہ ہیں
اور جب تک لوگوں کا جسمانی اور ذہنی خوف رفع نہ ہوگا نہ اُنہیں
اپنی ذاتی زندگی میں اِطمینان نصیب ہوگا ' نہ وہ اپنے معاشري فرائض
کی عمدگی کے ساتھہ ادا کرسکیں گے - ڈیوئی نے بھی جرأت کو قوت
عمل کا لازمہ قرار دیا ہے اور اپنی تصانیف میں جا بجا اس کی
اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کی تربیت پر زور دیا ہے - اس طرح
دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نوجوانوں میں جذبات کی صحیح
تربیت نہایت ضروری ہے تاکہ اِن میں ہمدردی اور دوسروں کی امداد
کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس کے بغیر اجتماعی زندگی کا قیام ناممکن
ہے - دونوں موجودہ زمانے کے حالات اور تعلقات کا خیال کرتے ہوئے یہ

ضروری سمجھتے ھیں کہ ھمدردی کے اس جذبے کو جس قدر ممکن ھو وسیع کیا جائے تاکہ اس کے دائرے میں علاوہ ان لوگوں کے جن سے ھمارا براہ راست تعلق ھے وہ لوگ بھی شامل ھوجائیں جن پر کسی نہ کسی طرح بالواسطہ ھمارے افعال و اعمال کا اثر پڑتا ھے - اور سائنس اور صنعت و حرفت کے اِس دور میں کون شخص ایسا ھے جس کی زندگی دنیا کے اور سب لوگوں کے ساتھہ بے شمار رشتوں میں مربوط نہ ھو ؟ -

اِنسانی سیرت کے اس نصب‌العین کو جس کے خد و خال ان ماھرین تعلیم نے دکھائے ھیں ' ھم اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ھوئے کہاں تک قبول کرسکتے ھیں ؟ ظاھر ھے کہ اِن صفات کا تعلق کسی خاص ملک یا قوم سے نہیں بلکہ یہ ھر اِنسان اور ھر جماعت کے لئے ضروری ھیں - اگر ھم اپنے سیاسی اور معاشری حالات کا تجزیہ کریں تو ھمیں معلوم ھوگا کہ ھماری قوم کو خاص طور پر یہ صفات درکار ھیں - اور ھماری تہذیب اور فلسفۂ زندگی میں ' جس میں مذھبی تعلیم بھی شامل ھے ' اِن کی اھمیت مسلم ھے - البتہ اِن کی ترتیب و تنظیم اور اضافی قدرو قیمت ھمارے یہاں کسی قدر مختلف ھوگی -

ھم سب سے پہلے جذبات کی تربیت کو لیتے ھیں جس سے ھمارا یہ منشا ھے کہ طالب‌علم میں ایسا اجتماعی احساس پیدا کیا جائے کہ وہ معاشرتی اور تمدنی حالات سے مناسب طریقہ پر متاثر ھو - یعنی اس میں وسیع ترین معنی میں ھمدردی کا جذبہ پیدا ھوجائے - آج کل جو سیاسی حالات ھمارے ملک میں پائے جاتے ھیں اُن کو دیکھتے ھوئے اس جذبے کی اھمیت بہت بڑھ جاتی ھے - یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ھماری

بیشتر سیاسی مشکلات اور معاشری خرابیاں اِسی اِجتماعی احساس
کی کمزوری کی وجہ سے ہیں - نہ مدرسے کی تعلیم ہمدردی
کے اِس جذبے کی تربیت کرتی ہے ' نہ خانگی اور معاشري اثرات اِس
کی نشو و نما میں مدد دیتے ہیں - اِس ہمدردی کو وسیع کرنے اور
عملی جامہ پہنانے کے لئے تخیل کی ' یعنی علم اور جذبات میں ربط
پیدا کرنے کی ' ضرورت ہے لیکن یہ تخیل بھی مفقود ہے - مدرسے کے
نصاب میں اجتماعی مسائل اور مضامین کو وہ اہمیت حاصل نہیں
ہے جو ہونا چاہئے تھی - اِس لئے طلبہ کو اپنے تہذیب و تمدن اور
معاشری ضروریات سے وہ واقفیت جو ہمدردی کی بنیاد ہے نہیں ہوتی '
یا ہوتی بھی ہے تو اِس قدر سطحی اور سرسری کہ اُن کے دل و دماغ
پر اِس کا کوئی گہرا یا دیرپا اثر نہیں پڑتا اور اُن کی قوت متخیلہ
اِس کو قوی اِحساس اور جذبات میں تبدیل نہیں کرسکتي - لہذا
جہاں تک اخلاقی تربیت کا تعلق ہے ہماري تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ
طلبہ میں اِس رشتے کا احساس پیدا کرے جو فرد اور جماعت کو ایک
دوسرے کے ساتھہ وابستہ کرتا ہے اور مختلف خیالات اور مقاصد رکھنے
والے گروہوں کو ایک متحدہ معاشرے یا قوم میں تبدیل کرتا ہے - لیکن
یہ احساس محض انفعالی نہیں ہونا چاہئے ' بلکہ جذبات کے جوش
اور حرارت کی بدولت اس میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہوجانی
چاہئے - ہماری مذہبی تعلیم اور ہمارے تہذیب و تمدن میں اس
احساس پر اِنتہائی زور دیا گیا ہے اور قدیم ہندوستانی معاشرے کی
بنیاد سراسر اسی یک جہتی اور باہمی وابستگی کے احساس پر قائم
تھی جس کا کچھہ اندازہ اَب بھی کہیں کہیں دیہاتی زندگی کی شیرازہ
بندی کو دیکھہ کر ہوسکتا ہے -

اب رہا علم ، تو اِس کو ہمارے مذاہب نے جو رتبہ دیا ہے وہ اِس بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم صدیوں تک مذہبی گروہوں کا مخصوص مشغلہ رہ چکی ہے یہانتک کہ اِس پر مذہبی رنگ غالب آگیا اور اِس کے مقاصد اس کی حدود ، اس کا نصاب یہ سب چیزیں مذہبی عقائد کی پابند ہوگئیں - موجودہ زمانے میں ہمارے ملک کی علمی اور تعلیمی ترقی کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور ہمارا علمی معیار بہت گرا ہوا ہے - اس امر کو تسلیم کرنے میں ہمیں باک نہیں ہونا چاهئے خواہ اس کے وجوہ ہم کچھہ قرار دیں - لہذا یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ علم یا ذهني تربیت جس کو رسل ذهانت کہتا ہے ہمارے لئے بیحد ضروری ہے - سائنس اور صنعت و حرفت کی بےاندازہ ترقی نے زندگي کے نظام کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس میں کامیابي کے ساتھہ حصہ لینے کے لئے ہر فرد کی ذهنی تربیت لازم ہوگئی ہے - یوں تو انسان معاشرتی ارتقاء کی ہر منزل میں ذهنی تربیت کا محتاج رہا ہے لیکن قدیم زمانے میں وہ اپنے ماحول سے براہ راست بہت کچھہ ذهنی اور عملی تربیت حاصل کر لیتا تھا اور یہ اس کو بہت سے کاموں میں مدد دیتی تھی - لیکن اب اس ضمنی تعلیم پر قناعت کرنا ممکن نہیں بلکہ تعلیمی اداروں کا ایک وسیع اور باقاعدہ نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے ہر شہری کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے عام مدنی اور شخصی فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھہ ادا کرسکے - ہمیں ہر ہر قدم پر ایسے مسائل پیش آتے ہیں جن کا کوئی مسلمہ حل موجود نہیں - ہر روز ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن میں مروجہ طریقے کام نہیں دیتے - بلکہ تربیت یافتہ عقل اور قوت فیصلہ

کی ضرورت پڑتی ہے - کچھ زمانے کے بعد یہ بات اور زیادہ عام ہو جائیگی - مثلاً ہر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنے رائے دھندگی کے حق کو کس طرح استعمال کرے ' کس شخص یا کس پارٹی کے حق میں اپنا فیصلہ دے - اس کو یہ جاننے کی ضرورت ہوگی کہ ان پارٹیوں کے کیا کیا اصول ہیں اور ان میں کس بنا پر اختلافات ہیں ' اور اگر ان میں سے کسی کی تجاویز کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ملک کی حالت پر کیا اثر پڑیگا - اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو ان باتوں کا مفصل علم ہونا چاہئے یعنی ہر شخص کے لئے سیاست داں بننا ضروری ہے - لیکن یہ امر بدیہی ہے کہ عام سیاسی مسائل سے تھوڑی بہت واقفیت ہر شخص کے لئے لازمی ہے تاکہ وہ ان کے متعلق معقول رائے دے سکے اور ایک جمہوری ریاست میں کوئی شہری اس فرض کی ادائیگی سے پہلوتہی نہیں کرسکتا - اسی طرح زندگی کے کسی شعبے میں بھی ذہنی تربیت کے بغیر کام نہیں چل سکتا - مثلاً ہر نوجوان کو پیشے کے انتخاب کے مسئلے سے سابقہ پڑتا ہے - اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقے کو جو الجھنیں اس مسئلے میں پیش آتی ہیں انہیں دور کریں تو ہمیں طلبہ کی عقلی تربیت میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ وہ ملک کے اقتصادی امکانات اور وسائل معاش سے واقف ہوں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ذاتی مفاد اور قومی فلاح کے لئے مناسب طریقے پر استعمال کرسکیں - اسی طرح ہمیں جو بےشمار اصلاحی مسائل در پیش ہیں ان سب کو خاطر خواہ حل کرنے کے لئے علوم کی اشاعت اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے - بیماری کا انسداد ' صفائی اور حفظان صحت کا انتظام ' افلاس کا رفع کرنا' جماعتی اختلافات اور فرقہ بندیوں کی اصلاح ' یہ سب کام اسی وقت انجام پاسکتے ہیں جب

شہریوں کی معقول ذهنی تربیت کے وسائل مہیا کئے جائیں - اسی کی بدولت ان میں ایسی قوت اجتہاد پیدا هوسکتی ہے کہ وہ ترقی کی راهیں نکالیں اور جس طرح دوسری قوموں نے علم کے ذریعے فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرکے بےاندازہ قوت اور عظمت حاصل کی ہے اسی طرح وہ بھی سائنس کی تحقیقات اور ایجادات کی مدد سے اور اپنے ملک کے قدرتی وسائل کو کام میں لاکر ' اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت کو بڑھائیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہہ پائیں - خواہ هم انسانی سیرت کی تربیت کے متعلق کوئی نظریہ بھی اختیار کریں همیں عقلی اور ذهنی تربیت کی اهمیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں - اب هم اپنے مدرسوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو بظاهر معلوم یہ هوتا ہے کہ همارے معلموں کو عقلی اور علمی تربیت کی اهمیت کا پورا احساس ہے اور وہ اپنی ساری کوشش اسی میں صرف کرتے هیں یہاں تک کہ وہ اور ضروری چیزوں سے غافل هوگئے هیں - لیکن جیسا هم کتاب کے دوسرے حصہ میں بتا چکے هیں انہوں نے نہ عقلی تربیت کا مفہوم صحیح سمجھا ہے نہ اس کے لئے مناسب ذرائع اختیار کئے هیں اور موجودہ صورت حال کی اصلاح ان طریقوں پر هونی ضروری ہے جن کی تفصیل هم کر چکے هیں -

تیسری صفت یعنی قوت عمل میں وہ تمام صفات شامل هیں جو سیرت میں پختگی پیدا کرتی هیں اور انسان کو اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا کرنے میں مدد دیتی هیں - مغربی قوموں کے مقابلے میں هندوستانیوں میں قوت عمل کی بہت کمی ہے ' خواہ هم قومی سیرت پر غور کریں خواہ افراد کی سیرت پر - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ همارے ملک میں جو فلسفۂ زندگی رائج رہا ہے وہ فکر اور سکون ' عزت اور گوشہ نشینی کو زندگی کی جد و جہد اور کشمکش میں شریک

ہونے پر ترجیح دیتا تھا - ہندو فلسفے میں ترک دنیا کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے - مسلمانوں میں بھی مذہباً تو نہیں لیکن ملکی حالات اور معاشرتی انحطاط کے اثر سے قناعت اور تقدیر پرستی بہت بڑھ گئی ہے - ان چیزوں کی وجہ سے ہندوستانیوں میں بعض قابل قدر صفات بھی پیدا ہوئیں اور وہ ایک حد تک اس مہلک مقابلے اور رقابت سے محفوظ رہے جو گذشتہ سو برس سے نہایت شدت کے ساتھہ مغربی تہذیب و تمدن پر مسلط ہے - لیکن ان امور میں جن میں فعالی حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے ہندوستانی عموماً ناکام رہے اور مجموعی طور پر یہ افسوس ناک نتیجہ نکلا کہ چین اور بعض اور ایشیائی ممالک کی طرح ہمارا ملک بھی ترقی کے دور میں مغربی ملکوں سے پیچھے رہ گیا - تعلیم کا فرض ہے کہ وہ قومی سیرت کی اس کمزوری کی اصلاح کرے اور ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے طلبہ میں ہمت ، استقلال ، مستعدی اور محنت کی عادتیں نشو و نما پائیں تاکہ وہ دنیا کی نظروں میں اپنی شخصی عزت اور قومی وقار دونوں کو قائم رکھہ سکیں -

جرأت کو خواہ ہم ڈیوئی کی طرح قوت عمل کا جزو قرار دیں یا رسل کی طرح ایک مستقل اخلاقی قدر مانیں بہر صورت اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے - شخصی اور قومی سیرت کی تکمیل کے لئے زندگی کے ہر پہلو میں جرات کی ضرورت ہے - یعنی جسمانی ، ذہنی اور اخلاقی جرأت کی تربیت ہماری تعلیم کا ایک لازمی جزو ہونا چاہئے - جسمانی جرأت کو بجائے خود اعلیٰ ترین جرأت نہیں لیکن اس کا ایک لازمہ ضرور ہے کیونکہ جو شخص ہر قسم کی جسمانی تکلیف سے ڈرتا ہے وہ ہرگز ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا ، جس میں دوسروں کی ناراضگی کا اندیشہ ہو ، ہرگز ایسے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا جو رائے عامہ کے

خلاف ہوں - ہندوستانی طلبہ میں مدرسے کے مشاغل ، معاشری زندگی کی تنظیم ، اور کھیلوں اور ورزشوں کے ذریعے جسمانی تکالیف برداشت کرنے کی عادت پیدا کرنی چاہئے اور انہیں ایسے کٹھن اور مشکل کاموں میں لگانا چاہئے جن سے ان کے حوصلے اور ہمت میں اضافہ ہو - قدیم سپارٹا کے مدبرین ، انگریز فلسفی جان لاک اور مشرق کے اکثر مفکرین جسم کو مضبوط کرنے اور اس کو قابو میں لانے کے لئے جو ریاضتیں تجویز کرتے ہیں وہ یقیناً ایک حد تک ضروری ہیں - لیکن اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ جسمانی آسایش اور آرام کی خواہش کو مارنا یا دبانا چاہئے - یہ خیال موجودہ نفسیات اور اخلاقیات دونوں کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے - لیکن ہم راحت جسمانی کو مقصود بالذات نہیں بنانا چاہتے کہ انسان بالکل نفس پرست اور آرام طلب ہوجائے ، سوائے اپنے عیش کے دنیا کی کسی چیز سے دل چسپی نہ رکھے یا ان تمام باتوں سے احتراز کرے جن میں کسی قسم کی جسمانی تکلیف کا اندیشہ ہو - ہم جسم کو روح کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان مقاصد کی تحصیل میں معین ہو جنہیں ہم عقلاً اور اخلاقاً مناسب سمجھتے ہیں - اسی وجہ سے آج کل ماہرین تعلیم ایسی جسمانی تربیت پر زور دے رہے ہیں جس کی بدولت بچوں اور نوجوانوں کو اپنے قوائے جسمانی پر پورا قابو حاصل ہوجائے ، اور ان میں جھجک اور بزدلی قائم نہ رہے - ہمارے خیال میں اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ تعلیم کا مطمح نظر بالکل تبدیل کردیا جائے اور وہ بجائے ''سفید پوش شرفا'' پیدا کرنے کے ، جو کسی قسم کی محنت سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں ، ایسے مستعد مزدور یعنی آمادہ عمل افراد پیدا کرے جو کمر ہمت باندھ کر ہر قسم کے مفید اور دولت آفریں کام کرنے کے لئے تیار رہیں -

اخلاقي اور ذهني جرأت سے هماری مراد هے اپنے اصولوں اور عقیدوں پر پختگی کے ساتھہ قائم رهنا ' ان کو دوسروں کی خوشنودی کی خاطر تبدیل نہ کرنا ' جب ضرورت ہو اپنی رائے بے دھڑک ظاهر کردینا ' اور حق گوئي کی خاطر هر قسم سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار رهنا - جب تک هم اس بات کے لئے آمادہ نہ هوں گے کہ بقول شیکسپیر :

''سچی بات کو جو همارے دل کے اندر هے ڈنکے کی چوٹ کہہ دیں''

نہ معاشرے کے خیالات کی اصلاح هوگی نہ وہ قدامت پرستی کے پنجے سے چھوٹے گا - هماری قوم میں بدقسمتی سے اس ذهني جرأت کي بہت کمی هے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے هیں جنھیں زبان خلق کا خوف نہ هو اور اپنے سچے خیالات اور عقائد کو ظاهر کرنے سے نہ جھجھکیں - یہی وجہ هے کہ بہت سی معاشری اور اخلاقی خرابیاں جن کو لوگ اپنے دل میں برا سمجھتے هیں بدستور قائم هیں - حال میں زیادہ تر سیاسی اثرات کي وجہ سے لوگوں نے پہلے کی نسبت زیادہ دلیری کے ساتھہ ان خرابیوں کے خلاف جنگ شروع کی هے - لیکن محض اتني بات کافي نہیں - جب تک همارے روزمرہ کے تعلقات اور کاروبار میں اس روش کا اظہار نہ هوگا اور لوگ آزادی کے ساتھہ تنقید کرنا اور خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کرنا نہ سیکھیں گے هم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذهني یا اخلاقي جرأت هماری سیرت کا جزو هوگئی هے - هماری تہذیب کي قدامت کی بدولت همارے یہاں رسوم و روایات کا بار اس قدر زیادہ هوگیا هے کہ اکثر لوگوں کي زندگي ' قول اور فعل دونوں کے اعتبار سے ' محض رسمی اور تقلیدی هوکر رہ گئی هے اور وہ کہیں بھی اس آزادی کا اظہار نہیں کرتے جو فطرت انسانی کا سب سے قیمتی عطیہ هے - سیاست ' معاشرت ' اقتصاد ' مذهب ' غرض هر شعبہ زندگی میں ارباب غرض جن کے ساتھہ میں عوام

کی باگ ھے یہی چاھتے ھیں کہ ان میں غور و فکر کی عادت نہ پیدا ھو اور وہ آنکھیں بند کئے ھوئے مقررہ راستوں پر چلتے رھیں - تعلیم کا انقلابی فرض یہ ھے کہ وہ نوجوانوں کو ان بزرگوں کے احکام کی تنقید کرنا سکھائے اور ان میں اتنی ھمت پیدا کرے کہ وہ خلوص اور ایمانداری کے ساتھہ اپنی عقل کے فتوے پر عمل کریں -

اخلاقی جرأت کا ایک پہلو ایسا بھی ھے جس کا تعلق دوسروں سے نہیں بلکہ خود ھماری ذات سے ھے اور جس کی ضرورت غالباً اس حالت میں بھی ھوتی اگر ھم بجائے معاشری زندگی بسر کرنے کے بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرتے - اکثر لوگوں میں یہ جرأت نہیں ھوتی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرسکیں - وہ جانتے ھیں کہ ان کی فلاں بات غلط ھے یا فلاں کام خلاف عقل و انصاف ھے لیکن وہ گویا اپنے ھی نفس سے اس درجہ مرعوب اور خوف زدہ ھوتے ھیں کہ انہیں یہ ھمت نہیں پڑتی کہ اپنی غلطی کو صاف صاف تسلیم کریں - ایسے لوگ نفس کے بندے بن کر رہ جاتے ھیں - وہ اس چیز کو وضعداری سمجھتے ھیں کہ جو بات ایک دفعہ کر بیٹھیں اس پر اڑیل ٹٹو کی طرح اڑے رھیں کیونکہ ان کے خیال میں رائے یا عمل کی تبدیلی سبکی اور ذلت کا باعث ھے - اس میں شک نہیں کہ دوسروں کے سامنے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ھے کہ ھم فلاں مسئلے میں غلطی پر تھے یا ھم سے فلاں معاملے میں خطا ھوئی - لیکن ھم ھرگز ایسے شخص کی سیرت کا احترام نہیں کرسکتے جو اپنی عزت کو بلکہ عزت کے ایک غلط تصور کو صداقت پر ترجیح دے - دنیا میں کوئی شخص اتنا بلند مرتبہ نہیں کہ اس کے لئے صداقت کے سامنے سر جھکانا ذلت کا باعث ھو - دنیاوی وجاھت اور مرتبے کے لحاظ سے نہیں بلکہ سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے جو بزرگ ترین ھستیاں گزری ھیں

ان سب میں یہ صفت مشترک تھی کہ انھوں نے کبھی اپنی ذاتی عزت کو صداقت سے بڑھ کر نہیں جانا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کیا - جمہوریت اور انفرادی آزادی کے زمانے میں کسی شخص کو خاص کر ان لوگوں کو جو اپنے ہم جنسوں کی سر کردگی اور رہنمائی کرتے ہیں اس قسم کی اخلاقی جرأت کے بغیر چارہ نہیں - کسی پالیسی یا پروگرام کو وقت اور حالات کے مقتضا کے مطابق چلانے کے لئے دماغی قابلیت اور اخلاقی جرأت دونوں درکار ہیں - اگر کوئی مدبر یا سیاسی لیڈر اس قدر ذہین اور دانشمند ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات کو دیکھہ کر یہ سمجھہ سکتا ہے کہ اسے کیا طریقہ عمل اختیار کرنا چاہئے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دوسروں کی رائے یا اپنی سابقہ رائے کی مخالفت کرسکے تو ملک کو اس کی دماغی قابلیت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟ اسی طرح اخلاقی جرأت بھی بجائے خود کامیابی کی ضامن نہیں ہوسکتی جب تک انسان میں اتنی قابلیت نہ ہو کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کرکے فیصلہ کرسکے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے - لہذا تعلیم کا فرض یہ ہے کہ جہاں طلبہ میں زمانہ شناسی کا ملکہ پیدا کرے اور انہیں آزادی کے ساتھہ اپنے عقائد کا اظہار اور ان پر عمل کرنا سکھائے وہاں صداقت کے سامنے سر جھکانے کا سبق بھی دے تاکہ وہ بے تامل اپنی غلطیوں کو تسلیم کرلیا کریں - اس سبق کو اس خوبی اور استحکام کے ساتھہ عملی اور نظری طور پر ان کے ذہن نشین کرنا چاہئے کہ وہ ان کی زندگی اور فلسفہ زندگی کا جزو بن جائے -

اگر ہم ان صفات کے وسیع ترین معنی لیں تو ان میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جو ہم اپنے طلبہ کی سیرت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں - لیکن الفاظ کو محض ذاتی رائے کی بنا پر اس قدر وسعت دینا

مناسب نہیں کیونکہ ہر شخص کا معہود ذہنی مختلف ہوتا ہے اور اس وجہ سے ان کے مفہوم کے متعلق اتفاق رائے بہت مشکل ہوجائے گا اِس لئے اِس بحث کے خاتمے پر بہت اختصار کے ساتھہ ہم اتنا اور بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی طلبہ کی سیرت کی تربیت میں تین امور کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے - تربیت جذبات کے ضمن میں ہم نے ہمدردی کی صفت پر بہت زور دیا ہے - لیکن اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں ہمدردی کے ساتھہ ساتھہ ایک اور جذبے کی تربیت کرنی چاہئے جس کا تعلق عقل اور جذبات دونوں سے ہے یعنی رواداری ' دوسروں کی رائے اور خیالات اور جذبات کا اتنا ہی احترام کرنا جیسا ہم اپنے خیالات اور جذبات کا کرتے ہیں - رواداری کی ایک قسم تو وہ ہے جو آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو رہی ہے ' یعنی چونکہ اکثر معاملات میں وہ خود کوئی پختہ اصول و عقائد نہیں رکھتے ہیں اِس لئے اُن کے نزدیک کسی اصول یا عقیدے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ' سبھی ایک سے ہیں - یہ حقیقی رواداری نہیں - اس کو بے پروائی کہنا زیادہ مناسب ہوگا - بعض لوگوں نے اس ذہنی روش کو' جو تشکیک پر مبنی ہے بہت وقعت دی ہے اور وہ اس کو روشن خیالی اور ذہنی آزادی سمجھتے ہیں - لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی بے پروائی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے نقص پر دلالت کرتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی خاص معیار اخلاق یا نظام اقدار قائم نہیں کیا اور اس کی زندگی کسی زبردست اصول یا مقصد کے ساتھہ وابستہ نہیں ہے - ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں بلکہ اس کے ساتھہ جمع ہوسکتی ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے خیالات اور عقائد رکھتے

ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں لیکن اصولاً اور عملاً دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف خیالات اور عقائد رکھیں - ہم اپنی رائے کا اظہار جوش اور خلوص کے ساتھ کرتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنا ہم رائے بنا لیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم بردباری اور خندہ پیشانی سے اپنے مخالفوں کی رائے سننے کے لئے تیار رہیں اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں کسی قسم کی ناگواری پیدا نہیں ہوتی - مبادلۂ خیال ' بحث و مباحثہ ' اختلاف رائے ' علمی اور عقلی ترقی کی جان ہیں بشرطیکہ ہمدردی اور رواداری کی فضا موجود ہو - ہمارے ملک کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہے کہ ذرا سے اختلاف خیال کی وجہ سے آپس کے لڑائی جھگڑے کا دروازہ کھل جاتا ہے جس میں قومی عزت اور قوت کا خون ہوتا ہے - اختلاف خیال کو دور کرنا تو نہ ممکن ہے نہ قرین مصلحت ' اس لئے ہمیں رواداری کی صفت پیدا کرنی چاہئے تاکہ ذہنی اور معاشری زندگی میں امن و امان قائم رہے اور ترقی کی صورت نکلے -

جس طرح رواداری کے بغیر ذہنی آزادی اور جرأت سے ناگوار نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے ' اسی طرح لوگوں میں قوت عمل محنت' جد و جہد اور حوصلہ مندی کی نشو و نما بھی اندیشے سے خالی نہیں اگر اس کے ساتھ ہی امن پسندی ' قناعت ' اور مشاہدۂ نفس کی تربیت نہ کی جائے جو ہندوستانی تہذیب کی خصوصیات رہی ہیں - بے شک فوری ضروریات کی وجہ سے ہمیں فعالیت پر زیادہ زور دینا چاہئے - لیکن اُن کی خاطر ہم ان مستقل اور ابدی قدروں کو قربان نہیں کرسکتے جن کی آغوش میں پرورش پاکر انسانیت اوج کمال کو پہونچتی ہے - جو تعلیم اور تہذیب افراد میں رشک اور مسابقت کے جذبات کو فروغ دیتی ہے ' اور

دنیاوی جاہ و قوت کے لئے مجنونانہ جد و جہد کو ضروری سمجھتی ہے وہ
انسانیت کے مرتبے کو بہت پست کر دیتی ہے - انسانی سیرت میں توازن
اور سکون کی ضرورت ہے تاکہ انسان اپنی خودی کا اظہار محض خارجی
اشیا کی طلب اور جستجو میں نہ کرے بلکہ ان خزانوں کو بھی ٹٹولے جو
اس کی ذات میں پنہاں ہیں اور ان سے مستفید اور لطف اندوز ہو -
حکیم اسلام علی مرتضیٰ کے ایک شعر کا کسی شخص نے اردو ترجمہ کیا ہے
جس میں انسان کی نفسی گہرائیوں اور روحانی خزانوں کی طرف اشارہ
کیا گیا ہے :—

تیری دوا تجھی میں ہے تجھ کو خبر نہیں
تیرا مرض تجھی سے ہے تجھ کو نظر نہیں
جِرم صغیر سمجھے ہے تو اپنے آپ کو
پوشیدہ تجھ میں عالم اکبر مگر نہیں

اس "جِرم صغیر" یعنی انسان کی ذات میں عالم اکبر کو تلاش
کرنا اور اس کو پالینا تعلیم اور تہذیب کا منتہائے کمال ہے - لیکن جو
لوگ ہر وقت خارجی مقاصد اور مادی منافع کی طلب میں مصروف
رہتے ہیں انہیں اپنی تہذیب نفس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت
ہی نہیں ہوتی - ادب اور فنون لطیفہ سے محظوظ ہونا، فطرت کے خوبصورت
مناظر سے لطف اور سکون قلب حاصل کرنا، کبھی کبھی دنیاوی مکروہات
اور جد و جہد سے پیچھا چھڑا کر اپنے نفس کی گہرائیوں کا مشاہدہ کرنا
اور اپنی زندگی کا جائزہ لینا، یہ تمام باتیں بھی انسانی شخصیت
کی تکمیل کے لئے اسی طرح ضروری ہیں جس طرح قوت یا دولت کے لئے
جد و جہد کرنا - جہاں حیات انسانی کے ارتقاء کے لئے عقل کی ضرورت

ہے وہاں اس اعلیٰ تر قوت وجدان کی تربیت بھی لازم ہے جس پر مشرق کے ارباب فکر ہمیشہ سے اور مغرب میں برگسان اور اس کے ہم خیال آج کل زور دے رہے ہیں، جس کے واسطے سے انسان کائنات اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے - ہندوستان میں تعلیم کا جو نظریہ یا فلسفہ مرتب کیا جائے اس میں یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہی ہندوستانی تہذیب کی امتیازی خصوصیت ہے -

مذہب اور مذہبیت کو نہ ڈیوئی نے واضح طور پر سیرت کے عناصر میں شمار کیا ہے نہ رسل نے - لیکن ہم ہندوستانی اپنی سیرت کی تشکیل میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتے کیونکہ ہمارے ملک میں ہمیشہ سے تہذیب اور مذہب کا گہرا اور قریبی تعلق چلا آتا ہے - لہذا تعلیم کو، جو افراد کے لئے تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے اور انہیں اس کا حامل بناتی ہے، مذہب کی اہمیت کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے - یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری جدید تاریخ کے صفحات ان فتنوں اور خون ریزیوں کے بیان سے آلودہ ہیں جن کی ذمہ‌داری بظاہر مذہب یا اختلاف مذاہب پر عائد ہوتی ہے اور اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ جن کی نظر سطح سے گزر کر تہ تک نہیں پہونچتی ہے سرے سے مذہب ہی سے بددل ہوگئے ہیں اور انہیں اس المناک صورت حال کا علاج یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کو قطعاً ترک کردیا جائے - لیکن ان کا یہ خیال ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس میں شکست پسندی کا رنگ جھلکتا ہے - حقیقت امر یہ ہے کہ مذہب کوئی خارجی لباس نہیں کہ اسے جب چاہیں پہن لیں جب چاہیں اُتار پھینکیں - جاپان کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں سے ایک کمیشن یورپ بھیجا گیا تھا کہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرکے رپورٹ پیش کرے کہ جاپانی قوم کے لئے کون سا مذہب سب سے زیادہ موزوں

ھوگا - اگر یہ قصہ صحیح ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے
یہ عجیب و غریب حرکت کی تھی ان کو مذہب کے مفہوم اور منشا سے
مطلق واقفیت نہیں - مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام نہیں
جنہیں انسان سیکھہ لے اور ادا کر دیا کرے - وہ انسان کی روحانی فطرت
کا مظہر ہے اس کی نہایت گہری اور شدید نفسی ضروریات کو پورا کرتا
ہے' اس کی نظر کو عارضی اور وقتی چیزوں سے ہٹا کر دائمی اور ابدی
حقائق سے روشناس کرتا ہے اور اس کے اور خالق کائنات کے درمیان وہ
تعلق قائم کرتا ہے جو اس کی شخصیت کی تکمیل کے لئے لازمی ہے -
اگر مذہب ایک بے معنی لفظ ہو' اگر روح اور خدا کا تصور انسانی دماغ
کے توہمات کا نتیجہ ہو اور انسان بھی مٹی اور کیمیاوی مرکبات
کے محض کیمیاوی اور طبیعی مادوں اور قوتوں کا مجموعہ ہو تو
انسانی زندگی کی حقیقی اور ابدی اہمیت باقی نہیں رہتی - یہ ممکن
ہے کہ بعض اشخاص باوجود لامذہب ہونے کے اپنے معاشری احساس
اور عقل کی بدولت اعلیٰ تمدنی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کریں
لیکن عام لوگوں کے لئے اِس بات کا امکان بہت کم ہے - کیونکہ عقل
اور اخلاق کے اصول خشک اور مجرد ہوتے ہیں ان میں وہ کشش اور
تاثیر نہیں جو مذہبی عقائد میں ہوتی ہے - علاوہ بریں مذہب کا دائرہ
اخلاق کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں ایسے تجربات اور مسائل
بھی آجاتے ہیں جن کا موضوع افراد کے باہمی تعلقات نہیں ہیں بلکہ ہر
فرد کی اپنی روحانی زندگی ہے - جو شخص مذہب کے اثر سے بالکل
محروم رہا ہے اس کے شخصی ارتقاء کا یہ پہلو بالکل معطل رہے گا -

ظاہر ہے کہ مذہب ان چیزوں میں سے ہے جو سکھائی نہیں
جاسکتیں - جہاں تک سرکاری مدرسوں کا تعلق ہے ان کے لئے یہ بات نہ

تو ممکن ہے نہ مناسب ہے ' کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے ہر مذہب کے عقائد و عبادات کی تعلیم کا اِنتظام کریں - یہ فرض طلبا کے والدین اور مذہبی جماعتوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مخصوص عقائد کي تعلیم دیں - لیکن اُس کا یہ مطلب نہیں کہ مدرسہ مذہبي تربیت کے فرض سے بالکل سبکدوش سمجھا جائے - مذہبیت کا جذبہ ایک عام احساس ہے جو مختلف مذاہب میں مشترک ہے - اس میں بہت سي چیزیں شامل ہوں - مثلاً ایک سچے مذہبی آدمی کو روحانی قدروں کا احساس ہوتا ہے اور یہ یقین کہ انسان کی شخصیت ' دنیاوي زندگی کا چراغ گل ہوجانے ' سے فنا نہیں ہوتی بلکہ روحانی اِرتقاء کی منزلیں طے کرتي رهتي ہے - اس کے دل میں زندگي کا گہرا احترام ہوتا ہے خواہ اس کا جلوہ انسانوں میں نظر آئے یا حیوانوں میں یا مناظر فطرت میں ' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زندگی وہ عطیہ اِلہی ہے جس کا بدل دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوسکتی - اسی وجہ سے اس کے دل میں رواداری اور همدردی کا وہ حقیقی جذبہ ہوتا ہے جو اتحاد اغراض مقاصد پر نہیں بلکہ احساس نوعی پر مبنی ہے - مگر جہاں وہ اِنسانی شخصیت کی عزت کرتا ہے وهاں یہ بھی جانتا ہے کائنات کے مقابلے میں انسان کی هستی بہت چھوتي ہے اور اُس کی علمی ترقی اور تسخیر فطرت کے زبردست کارناموں کے باوجود اس کا علم اور قوت بہت محدود ہے - یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جس کی شناخت یہ ہے کہ وہ اس کے قوائے عمل کو معطل نہیں کر دیتا بلکہ اس کو جد و جہد کي دعوت دیتا ہے - نیوتن (Newton) جیسے زبردست سائنس داں کا یہ قول کہ اس کے علم کي مثال سائنس کے بحر ذخار کے سامنے ایسي ہے جیسے کوئي بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے

کھیل رہا ہو حقیقی مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے - لہذا جب
ہم کہتے ہیں کہ تعلیم کو مذہب کی طرف سے غافل نہیں ہونا
چاہئے اور مذہبی جذبے کی تربیت میں حصہ لینا چاہئے تو ہمارا
مقصد یہ ہوتا ہے کہ معلم کو طلبہ میں قدروں کا احساس ' احترام
حیات ' رواداری و ہمدردی ' عزت نفس ' اور حقیقی انکسار کے جذبات
پیدا کرنے چاہئیں - یہاں مذہبی تربیت کے انتظام اور طریقوں سے
بحث کرنے کا موقع نہیں اور نہ اس کی گنجائش ہے - لیکن ہم اب تک
جن تعلیمی اصولوں سے بحث کرچکے ہیں ان پر غور کرنے سے اس کے
متعلق بھی بعض اہم نتائج نکل سکتے ہیں مثلاً یہ کہ مذہبی تربیت
کے لئے سب سے زیادہ اہم اور اثر آفریں عنصر معلم کی شخصیت ہے جو
براہ راست طلبہ کی شخصیت اور نظام اقدار کی تشکیل کرتی ہے -
اور اس کے بعد مدرسوں میں معاشری اور اخلاقی زندگی کی تنظیم '
مختلف مذاہب کے خیالات کا بے تعصبانہ مطالعہ ' طلبہ کے دل میں
عالم فطرت کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا کرنا ' فنون لطیفہ کے
ذریعے ان کے وجدان کو نشو و نما دینا ' ان کے لئے اپنے بنی نوع کی
خدمت کے مواقع فراہم کرنا ' یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو
مناسب طریقے پر استعمال کیا جائے تو وہ مذہبی تربیت میں معین
ہو سکتی ہیں -

موجودہ ہندوستانی تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ مذہب سے
بالکل بے تعلق ہوگئی ہے اور طلبہ میں مذہبی روح کو بیدار نہیں کرتی -
اسی وجہ سے عوام کو کبھی اِس سے سچی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی - خواہ
وہ بظاہر مذہب کی طرف سے بے پرواہ ہوں اور اِس کے اِحکام پر عمل
نہ کریں لیکن اُن کے قلب کی گہرائیوں میں مذہب کا احترام موجود ہے

اور وہ کسی ایسے نظام تعلیم کی دل سے قدر نہیں کرسکتے جو اُن کو محض حصول معاش میں مدد دے اور اس سے زیادہ اِس کا کوئی مصرف نہ ہو - ممکن ہے بادیِ النظر میں یہ رائے صحیح نہ معلوم ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل والدین باوجود ہر قسم کی مالی دقتوں کے اپنی اولاد کو یہی مغربی تعلیم دلا رہے ہیں اور اِس کے لئے اپنی ذات پر ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں - لیکن اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ اِس تعلیم سے مطمئن ہیں - وہ اِس کو واسطہ یا ذریعہ سمجھتے ہیں کوئی قدر مستقل نہیں مانتے - اِس کے مقابلے میں اِن کے دل میں اِس پرانے نظام تعلیم کی زیادہ قدر ہے جو بہت تنگ اور محدود تھا لیکن کم سے کم اِس میں مذہبی تربیت پر زور دیا جاتا تھا - چنانچہ ابتدا میں تنگ خیال مذہبی پیشواؤں نے مغربی تعلیم کو بالکل ہی ناجائز قرار دیدیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ضروریات زمانہ سے مجبور ہوکر لوگوں نے اِس کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ اب وہ اُس کے حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہیں - لیکن جب تک اِس تعلیم کا رشتہ مذہب کے ساتھہ نہ جوڑا جائے گا اِس کا اثر سطحی اور محدود ہوگا یعنی زیادہ سے زیادہ اِس سے علم اور واقفیت میں اضافہ ہوگا ' تمدنی زندگی کے ظاہری پہلو کی تھوڑی بہت اصلاح ہوگی لیکن ہمارے جذبات عقائد کی دنیا اور ہماری شخصی اور قومی تہذیب کے ساتھہ اِس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا اور زندگی کے اہم اور اصلی مقاصد کے حصول میں یہ ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتی - لہذا ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ وہ اِس پورے مسئلے پر احتیاط کے ساتھہ غور کریں اور ایسے ذرائع اختیار کریں کہ مغربی تعلیم کے قابل قدر عناصر ' یعنی سائنس اور صنعت و حرفت اور معاشری علوم کی تحصیل کے ساتھہ

ساتھ طلبہ میں ان مذہبی قدروں کا احترام بھی پیدا ہو جو مذہبی تہذیب کی روح رواں سمجھی جاتی ہیں - ہندوستانیوں کے فرقہ وارانہ اختلافات نے نہ صرف ان کی قومی عزت اور سیاسی وقار کو خاک میں ملا دیا ہے بلکہ خود مذہب کے رخ روشن کو گرد آلود کردیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بہت سے سمجھدار اور تعلیم یافتہ لوگوں کا دل اس کی طرف سے پھیر دیا ہے - لیکن ہمارا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ ان اختلافات کی اصلی وجہ مذہب نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی اغراض ہیں جن کو بعض بے حمیت اور خود پرست لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مذہبی رنگ دیدیا ہے اور وہ عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے اپنا کام نکالتے ہیں - یہ بیچارے اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے اور آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں - وہ اپنے نزدیک مذہب کی حمایت میں جانی اور مالی نقصان اُٹھاتے ہیں جس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کو مذہب سے قلبی محبت ہے خواہ وہ اس کا اظہار اپنی عاقبت ناشناسی کی وجہ سے غلط طریقہ پر کریں - اس صورت حال کی اصلاح کی ذمہ داری صرف معلموں ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ملک کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کرے - یہ کام آسان نہیں ہے کیونکہ اس میں انہیں ہر قسم کے ارباب غرض کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی ، عوام کے توہمات اور تعصبات کو رفع کرنا ہوگا اور مخالفتوں کے اصلی اسباب کو دور کرنے کے طریقے سوچنے پڑیں گے - ان سیاسی اور اقتصادی اختلافات کی اہمیت کو گھٹا کر دکھانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا - ہمیں صاف صاف اس بات کا اعتراف کرنا چاہئیے کہ مختلف فرقوں کے مطالبات کو ہم آہنگ کرنا ایک بہت کٹھن کام ہے جس کے لئے نہ صرف قانونی فیصلے اور آئینی تصفیئے کی ضرورت

ہے بلکہ لوگوں کی ذہنیت کو بدلنا ہے اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات تھوڑے اور عارضی ہیں اور اُن عظیم‌الشان مقاصد کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے جو سب فرقوں میں مشترک ہیں - اور ان عارضی اختلافات کی خاطر مستقل مفاد اور مقاصد کو قربان کردینا دانشمندی کے خلاف ہے - اگر مدرسے کی تعلیم نوجوان طلبہ میں ہمدردی ' رواداری اور احترام حیات کے جذبات پیدا کرے ' جو مذہبی سیرت کے اہم اجزا ہیں ' تو وہ اِن اختلافی مسائل کے حل کرنے میں بھی معقولیت ' شائستگی ' اور حسن مراعات کو ہاتھ سے نہ دیں گے ' بحث و مباحثہ میں وہ تلخی اور ناگواری پیدا نہیں ہوگی جو ہماری موجودہ سیاسی زندگی کا جزو لازم ہوگئی ہے - اس طریقے پر مذہبی تعلیم دینے سے نہ صرف مذہب کے دامن سے یہ شرم ناک دھبہ دھل جائیگا ' بلکہ یہ تعلیم ہمارے ملکی اور سیاسی معاملات کے سلجھانے میں بھی بہت مدد دے گی اور لوگوں میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل کا جانفزا پیغام سنائے گی -

---

اصول تعلیم

مفصل فہرست مطالب

(باعتبار حروف تہجی)

ب

پ

ت

ف

ق

ک

گ

ل

م

و

ھ

ی

فہرست کتب

(مصنفوں اور کتابوں کی فہرست جن کے حوالے اس کتاب میں دئے گئے ہیں - صفحوں کے نمبر مقابل میں درج ہیں)

Adamson : Individual and Environment ... ۶۸

Alexander and Parker : The New Education in the German Republic ۲۰۷

Brown : Underlying principles of modern legislation ۲۳

Baldwin : Social and Ethical Interpretations ... ۲۳

Ballard : Teaching the Mother Tongue ... ۲۵۵

Bode : Modern Educational theories ... ۳۲۲ ، ۲۸۳

Burt : The Young Delinquent ۳۲۳

Dealey and Ward : Text Book of Sociology ... ۱۳

Dewey : Reconstruction in Philosphy ۱۶

Dewey : School and Society ۳۸۳

Dewey : Democracy and Education ۵۹, ۵۶, ۵۰, ۲۳, ۲۱
۲۳۸, ۲۱۳, ۲۰۷, ۱۸۳, ۱۷۸, ۱۷۱, ۱۳۵, ۱۲۰, ۱۱۵, ۶۶,
۳۱۳, ۳۰۱, ۲۹۸, ۲۹۵

Davis : The School Idea ۱۷۹

Findlay : School and the Child ۲۳۸

Findlay : The School ۹۱

Findlay : Foundations of Education ۹۷

Ferriere : Activity School ۲۰۳

Ferriere : La Pratique de l'ecole active ... ۲۵۰

George : Junior Republic ۳۲۳

Howerth : Art of Education ۵۱

Hamaide : Decroly Class ۲۰۳

Hower Lane : Little Common wealth ۳۲۳

James : Talks to Teachers ۳۸۵

Kerschensteiner : Schools and the Nation ۳۲۹, ۱۳۷

Kerschensteiner : Education as Citizenship ... ۲۰۳

Keatinge : Teaching of History ۲۵۱

Keatinge : Suggestion in Education ۳۷۲

Kipling : Stalky and Co. ۳۹۳

Le Bon : Psychology of the Crowd ۳۸۲

Mackenzie : Fundamental Problems of life ... ۹۷

Mackenzie : Problems of National Education ... ۳۲۹

Nunn : Education—its Data and First Principles ... ۳۷۲

Pinketvitch : New Education in Soviet Republic ۱۳۷
۳۵۷, ۳۵۱, ۱۳۸

Russel : On Education ۳۹۹, ۳۸۹, ۳۳۲, ۳۲۸, ۱۹۸, ۱۷
۵۰۵, ۵۰۳, ۵۰۰

Rousseau : Emile ۳۳

Smith : Educational Sociology ۹۷

Smith : Nation's Schools ۱۳۳

فہرست مصطلحات

ذیل میں اُن اصطلاحوں کی فہرست دی جاتی ہے جو کتاب میں استعمال کی گئی ہیں - چونکہ بہت سی اصطلاحوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہے اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آسان اور قابل فہم الفاظ منتخب کئے جائیں :—

Suggestion تاثیر خیال

Psychoanalysis تحلیل نفسی

Scepticism تشکیک

Socialization of Education تعلیم کی معاشری تنظیم

Continuation Education تعلیم مزید

Creative تخلیقی

Catharsis تنقیہ

Instinct جبلت

Correlation of Studies ربط مضامین نصاب

Impulse رجحان

Formal صوری

Heuristic Method طریقہ دریافت

Concentration of Studies اجتماع مطالعہ

Social Efficiency اجتماعی افادہ

Impressions ارتسامات

Tests آزمائشیں

Communist اشتمالی

Utilitarian افادی ' افادیت پسند

Values اقدار

Passive انفعالی

Individuality انفرادیت

Transfer of Training انتقال قوت اکتسابی

Informal Education بے ضابطہ تعلیم

Prestige Suggestion تاثیر تفوق

English	Urdu
Motives	محرکات
Occupations	مشاغل
Pragmatism	مصرف پسندی
Project Method	منصوبی طریقہ
Faculty Psychology	نفسیات انشعابی
Structural Psychology	نفسیات ترکیبی
Federal Government	وفاقی حکومت
Amateur	عطائی
Will-to-power	عزم للقوۃ
Scientific Method	علمی طریقہ
Social	عمرانی ، معاشری
Idealism	عین پسندی
Active, Activity	فعالی ، فعالیت
Efficiency	کار کردگی
Dynamic	متحرک ، حرکی
Environment	ماحول
Civics	مدنیات

صحت نامہ

افسوس ہے کہ باوجود احتیاط اور کوشش کے کتاب میں مندرجہ ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی تصحیح مقابل میں کی گئی ہے -

غلط (مع صفحہ)	صحیح
سپنڈر (۱)	سپنسر
نعل (۳)	فصل
ہم گیری (۳)	ہمہ گیری
وقت نظر (۷)	دقت نظری
موکز (۱۳)	مرکز
صفحہ ۱۰۵ (۱۸)	صفحہ ۱۰۵
دماغی کا عطیہ (۲۴)	ماضی کا عطیہ
مرد (۲۸)	فرد
مقرون (۳۶)	مقررون
معرکتب الارا (۳۹)	معرکۃ الارا
واحجانات (۴۳)	رجحانات
ماخز (۵۴)	ماخذ
و مسائل (۵۵)	وسائل
تربیب (۶۲)	تربیت
برہ راست رنہیں (۶۶)	براہ راست انہیں
اس باب (۶۸)	آئندہ باب
کلے توڑ کر (۷۴)	کلئے توڑ کر
چھوڑ دیئے (۷۶)	چھوڑ دیتے ہیں
نقتہ نظر (۸۳)	نقطہ نظر
جماعتوں کی مختلف (۸۵)	جماعتوں کی مختلف خصوصیات
دیہاتی مدارس (۹۲)	دیہاتی مدارس میں

غلط (مع صفحہ)	صحیح
خاکردب (۱۰۳)	خاکروب
تعلیم (۱۲۳)	تعلیم
جھد (۱۳۷)	جیّد
قوقی (۱۴۲)	قومی
یقین (۱۴۲)	تعین
عظیم اشان (۱۵۵)	عظیم الشان
مناسب قدامت	نا مناسب
پرستی (۱۶۷)	قدامت پرستی
الفاظ کی تقلیم (۱۸۳)	الفاظ کی تعلیم
صطحی (۱۸۴)	سطحی
اس درجہ مادی (۱۸۹)	اس درجہ حاوی
سب ضرورت (۱۸۹)	سب کی ضرورت
ان کا علوم (۱۹۹)	ان علوم
رھنمہ (۲۰۲)	رھنما
شائع ہوتے ہیں (۲۰۴)	شائع ہوئے ہیں
نہ ھي (۲۰۸)	نہ
ان میں طریق عمل (۲۳۵)	اس طریق عمل
ہیں ظاہر ہوتی (۲۶۴)	ظاہر ہوتی ہیں
سابقت (۲۶۶)	مسابقت
استعداد (۲۶۸)	اقدار
مدرسے کے روایتی تعلیم (۲۷۱)	مدرسے کی روایتی تعلیم

غلط (مع صفحه)	صحیح
قدیم صاب (۲۷۷)	قدیم نصاب
واضع (۲۹۵)	واضح
تغریق (۳۰۱)	تفریق
سائنس کي آمد و رفت (۳۱۲)	سائنس کی آمد و رفت
درسیات تضیف (۳۱۵)	درسیات کی تصنیف
نظام‌معاشرت (۳۱۷)	نظام معاشرت کی
اغراض وہ حالات (۳۲۱)	اغرض و حالات
حسن کي بدولت (۳۲۱)	حسن کی دولت
اصلاحی معنی (۳۲۲)	اصطلاحی معنی
قدار (۳۲۳)	اقدار
سروکاو (۳۳۳)	سروکار
کیوں کے (۳۳۹)	کیونکہ
آنکہ اور ناک (۳۴۰)	آنکھ اور کان
طلبہ کو اس ذوق (۳۴۸)	طلبہ کے اس ذوق
اس سے مختلف (۳۵۹)	اس کے مختلف
اخلاقی تعلیم (۳۶۰)	اخلاقي تعلیم
وابسطہ (۳۶۲)	وابستہ
اظہا (۳۷۰)	اظہار
حفظ نفس (۳۷۱)	حظ نفس
کہ انسان (۳۷۴)	مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ انسان
ذيي حسن (۳۷۹)	ذي حس

غلط (مع صفحه)	صحیح
اہم سمجھتا ہے (۳۹۰)	اہم سمجھتي ہے
اقتدار (۳۸۲)	اقدار
حقوق الہ (۳۸۷)	حقوق اللہ
اخلاقی فعال (۳۹۸)	اخلاقی افعال
اخلاق اور ہمدردی اور (۴۰۴)	اخلاق اور ہمدردی
نصاب کی تربیت (۴۲۳)	نصاب کی ترتیب
ایسي شخصیت کے (۴۲۹)	ایسی شخصیت کا
اکثر زبانوں (۴۳۵)	اکثر زبانوں
برے کیا اچھے (۴۳۸)	اچھے کیا برے
توجید (۴۴۷)	توجیہ
منشہ (۴۴۸)	منشا
تغوق (۴۶۱)	تفوق
انفعال طریقہ (۴۷۴)	افعالي طریقہ
صفات کی تربیت (۴۸۱)	صفات کی ترتیب
اخلاقي اور اخلاق تربیت (۴۸۱)	اخلاق اور اخلاقي تربیت
اس معلومات (۴۸۳)	ان معلومات
اعلا (۴۹۲)	اعلی
کو بجائے خرد (۵۱۴)	گو بجائے خود
بلہ عزت کے (۵۱۷)	بلکہ عزت کے
جذبات عقائد (۵۲۹)	جذبات اور عقائد